ذرا اندازہ کیجیے اس کا کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کا حال جب یہ ہو، صحابی راوی ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک آپؐ نے فرمایا:

''قوموا بنا نعود جارنا الیھودی''(۳۱)

''کھڑے ہو جاؤ، ہمارے ساتھ ہم سب اپنے پڑوسی یہودی کی بیمار پرسی کو چلیں''

پیغمبر خود بھی ہیں اور اپنے ساتھ اپنے صحابیوں کو لیے ہوئے اس بیمار یہودی نوجوان کے پاس پہنچتے ہیں جو مدینہ کا باشندہ تھا، جوار اور پڑوس کے حق کو اس عملی شکل میں کر کے خود رسول اللہ ﷺ نے جب دکھایا تھا تو غیر مذہب کے ہم وطنوں اور پڑوسیوں کے ساتھ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت قدرۃً جو ہوگئی، اس کے سوا اور کیا ہوتی ؟(ط)

لوگ جبر جبر کے لفظ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف منسوب کر کر کے اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اتنے قلیل عرصہ میں مشرق و مغرب، جنوب و شمال، ایشیا و افریقہ، بلکہ یورپ کے بعض حصوں تک میں اسلام کیسے پھیل گیا؟ اسی یہودی بیمار کے قصہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مزاج پرسی کے بعد اسلام کو اس پر تین دفعہ پیش کیا، تیسری دفعہ آپ کے فرمانے اور اپنے باپ کا اشارہ پانے پر نوجوان یہودی نے اسلام قبول کر لیا۔ آنحضرت ﷺ کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہو گئے:

''الحمد للہ الذی اعتق بی نسمة من النار''(۳۲)

''اس خدا کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ ایک انسانی روح کو جہنم کے عذاب سے آزادی عطا فرمائی''

تلاش کرنے والے تو ان واقعات میں اور غیر مسلموں کے ساتھ اسلام

Marfat.com

کے سلوک خاص میں اپنے سوال کا واقعی جواب تلاش کر سکتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عیسائی غلام اسق کے حال سے لوگ واقف ہوں گے۔ سال ہا سال تک حضرت عمرؓ کی خدمت میں رہا، لیکن اس کا خود بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام کے قبول کرنے پر اس کو کبھی مجبور نہیں کیا، زیادہ سے زیادہ یہی فرماتے رہے کہ اسق تو مسلمان ہو جائے تو کتنی اچھی بات ہوگی۔ حضرت عمرؓ کی نرمی سختی سے زیادہ کارگر ہوئی، اسق آپ کی وفات کے بعد محض آپ کے حسن سلوک کی وجہ سے مسلمان ہو گیا۔ (۳۳)

اور سچ پوچھیے تو آئندہ اسلامی حکمرانوں کے متعلق اس قسم کے قصے تاریخوں میں جو پائے جاتے ہیں، مثلاً دولتِ عباسیہ کے معمار صادق ابو جعفر منصور ہی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا چہیتا نصرانی طبیب جس کا نام جورجس تھا، بیمار پڑا، حالت زیادہ خراب ہونے لگی، تو منصور پیدل اس کی مزاج پرسی کے لیے دار الخلافہ سے جورجس کے گھر پہنچا، وہ خلیفہ کی اس عنایت خاص کو دیکھ کر رونے لگا، منصور نے جورجس کو اس حال میں پا کر کہنا شروع کیا کہ:

"اتق الله واسلم و انا اضمن لک بجنة" (۳۴)

''جورجس اللہ سے ڈر، مسلمان ہو جا، تیرے لیے جنت کی میں ضمانت لیتا ہوں''

مگر عیسائی، بہر حال عیسائی تھا جواب میں اس نے خلیفہ سے کہا:

''میں تو اپنے باپ داداؤں کے دین ہی پر مرنا چاہتا ہوں، وہی جگہ مجھے پسند ہے، جہاں وہ ہوں خواہ وہ جنت ہو، یا دوزخ'' (۳۵)

مگر آپ جانتے ہیں کہ اس جواب کو سن کر منصور جیسے غضبناک بادشاہ پر کیا

اثر طاری ہوا؟ لکھا ہے کہ:

''فضحک الخلیفة من قوله''(۳۶)

''خلیفہ جور جس کے اس جواب کو سن کر ہنسنے لگا''

کیا دین پر جبر کرنے کی یہی صورت ہوتی ہے؟ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ جور جس نے منصور سے خواہش کی کہ مجھے اپنے وطن جندیسا پور پہنچا دیجیے تا کہ اپنے بزرگوں کے ہڑاوڑ میں دفن ہونے سے اگر مر گیا تو محروم نہ رہوں، منصور نے اسی وقت دس ہزار اشرفیوں کی منظوری صادر کی اور حکم دیا کہ شاہی انتظام کے ساتھ اس کو گھر پہنچا دیا جائے اور جور جس وطن پہنچ گیا اور وہیں جا کر مرا۔ (۳۶، الف)

مسلمان فرماں رواؤں کے دربار میں غیر مذہب کے ارباب کمال کی جو قدر و عزت کی گئی ہے اس کی تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسروں پر جبر اور زبردستی تو خیر بڑی بات ہے۔ عباسیوں کی حکومت کا ابتدائی عہد ہے، اسی ابو جعفر منصور کے زمانے کا قصہ ہے، اس کو سنئے اور اندازہ کیجیے کہ عام مسلمانوں کے قلوب تک میں رواداری کے جذبات ترقی کے کس نقطہ تک اسلامی حکومت کے زمانے میں پہنچے ہوئے تھے۔

خطیب نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بصرہ جو خاص مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی تھی، یہیں ایک یہودی پہنچا اور مسلمانوں کے علماء کو مناظرے کا اس نے چیلنج دیا۔ لوگ آتے تھے اور اس سے بحث کرتے تھے؛ بیان کیا جاتا ہے کہ مناظرے کے ڈھنگ میں یہودی اتنا مشاق تھا کہ جو اس سے بحث کرتا اس کو خاموش کر دیتا۔ اس زمانے میں ابو الھذیل العلاف جو بعد کو فرقہ معتزلہ کا امام ہوا، ابھی کمسن تھا، اس کا بیان ہے کہ میں نے اپنے چچا سے کہا کہ اس یہودی کی بڑی شہرت ہو رہی ہے، کیا مجھے آپ اس کے پاس لے چل سکتے ہیں، تا کہ میں

اس سے بحث کروں۔ ابو الھذیل کے چچا نے کہا بیٹا! بڑے بڑے لوگوں کو وہ خاموش کر رہا ہے، تم اس سے بھلا کیا مناظرہ کرو گے، لیکن میں نے ضد کی، آخر مجھے لے کر اس مجلس میں میرے چچا پہنچے، جہاں لوگوں کا مجمع تھا اور یہودی سے بحث ہو رہی تھی۔ اس وقت یہودی حضرت موسیٰ کی نبوت کے متعلق کہہ رہا تھا کہ ان کی نبوت تو طے شدہ مسئلہ ہے، اس لیے اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں، البتہ اپنے پیغمبر (یعنی رسول اللہ ﷺ) کی نبوت کی صحت کی دلیل تم مسلمانوں کو پیش کرنا چاہیے۔ ہمارے لیے تو صرف انکار کافی ہے، اس قسم کی باتیں وہ کر رہا تھا، اتنے میں ابو الھذیل آگے بڑھا اور یہودی کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ سے بحث کرنا چاہتا ہوں، یہودی نے ایک کمسن لڑکے کو دیکھ کر کہا کہ:

''میاں صاحبزادے اپنے بڑے بوڑھوں کے حال سے تمہیں عبرت نہیں ہو رہی تم بھلا مجھ سے کیا بحث کر سکتے ہو''۔ (۳۷)

مگر ابو الھذیل کے اصرار کو دیکھ کر بحث پر آمادہ ہو گیا، سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ اس کے بعد نقل کیا گیا ہے جس کے درج کرنیکی یہاں گنجائش نہیں ہے پیش کرنے کی چیز آخری جزء ہے، ابو الھذیل کا بیان ہے کہ میرے سوالات سے یہودی زچ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اچانک وہ میری طرف بڑھا، ایسا معلوم ہوا کہ کان میں کچھ کہنا چاہتا ہے میں نے بھی اپنا کان اس کی طرف بڑھا دیا۔

یہی قصہ سننے کا ہے، ابو الھذیل کے الفاظ میں سنیے، ایک یہودی کی جرات بصرہ جیسے مقام میں دوسری صدی ہجری کی ابتدا تک میں کہاں تک بڑھی ہوئی تھی، ابو الھذیل کے الفاظ یہ ہیں:

'' فسبنی فقال امک کذا کذا و ام من علمک لا یکنی '' (۳۸)

''اس یہودی نے کان میں مجھے گالیاں دینا شروع کیں، کہہ رہا تھا کہ تیری

Marfat.com

ماں کی ایسی تیسی اور جس نے تجھے پڑھایا ہے اس کی ماں کی ایسی تیسی ، وہ فحش گالیاں دے رہا تھا اور اشارے کنائے سے بھی کام نہیں لے رہا تھا''

یہودی کا اپنے اس طرز عمل سے جو مقصد تھا ابو الھذیل نے بھانپ لیا اور کسی قسم کی برہمی اپنے اندر اس نے پیدا ہونے نہ دی ، پھر مجمع کی طرف خطاب کر کے ابو الھذیل نے کہا کہ:

''حضرات! خدا آپ لوگوں کی عزت کو قائم رکھے ، آپ لوگوں نے دیکھ لیا کہ میرے سوالوں کے جواب سے یہ عاجز ہو چکا ہے ، اب کان میں اس نے مجھے اس قسم کی گالیاں محض اس لیے دی ہیں تا کہ مجھے غصہ آ جائے اور یوں مجلس درہم برہم ہو جائے ، یہودی کو اس کا موقع مل جائے کہ مسلمانوں نے شور شغب سے کام لیا ورنہ ان کا وکیل شکست کھا چکا تھا۔ (۳۹)

آزادی خیال ، آزادی تقریر کی آپ ہی بتایئے کہ اس سے زیادہ معیاری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ بصرہ جیسے خالص اسلامی شہر میں وہ مسلمانوں کے محبوب پیغمبر ﷺ کی نبوت پر اعلانیہ بھری مجلس میں اعتراض کراتا ہے۔ مسلمانوں کے علماء اس سے سوال و جواب کرتے ہیں ، اپنی تقریری قوت سے وہ سب کو چپ کراتا چلا جا رہا ہے ، نہ حکومت کی طرف سے اس کی دار و گیر ہوتی ہے اور نہ مسلمانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف شورش کرتے ہیں ، بلکہ توقع یہی کی جاتی ہے کہ تقریر کا جواب تقریر سے دیا جائے ، ذرا اس یہودی کی جسارت کا اندازہ کیجیے کہ مسلمانوں کی اس بھری مجلس میں بے لفظ یا بقول مولانا دریابادی صنف غیر منقوط میں وہ سب کچھ سناتا ہے جو سنانا چاہتا ہے ، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جب تک اس کو مسلمانوں کے حلم و بردباری کے متعلق اطمینان نہ تھا ، اس بزدل یہودی میں کان ہی میں سہی اس کی ہمت ہی کیسے ہو سکتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ کان میں ابو الھذیل کے جو گالیاں ان کو اور

Marfat.com

ان کے اساتذہ کو اس نے سنائی تھیں، اس کی خبر جب مجمع کے مسلمانوں کو ہوئی، تو جیسا کہ چاہیے تھا لوگوں میں برہمی پیدا ہوئی لیکن اس برہمی کے بعد بھی کیا ہوا؟ ابولھدیل ہی کا بیان ہے کہ یہودی مجمع سے نکل بھاگا حالانکہ بقول ابوالھدیل:

''شتمنی بالشتم الذی یوجب الحد''۔(۴۰)

''اس یہودی نے جو گالیاں مجھے دی تھیں، وہ اس کو قانونی سزا کی مستحق بنا چکی تھیں''

یعنی حد قذف (ی) کا یہودی قانوناً مستحق ہو چکا تھا، لیکن بایں ہمہ مسلمانوں کی حکومت نے بھی اور خود مسلمانوں نے بھی اتنا موقع اس کو پھر بھی دیا کہ:

''خرج ھاربا من البصرۃ''(۴۱)

''بصرہ سے بھاگ نکلا''

موجودہ زمانہ کی بے دین حکومتوں کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہی قرار دیا جاتا ہے کہ مذہبی معاملات میں رواداری کا جذبہ لوگوں میں اس نے پیدا کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں زیادہ دخل جہاں تک میں سمجھتا ہوں بجائے رواداری کے پژمردگی کے ان رجحانات کو ہے جو عموماً اس زمانہ میں مذہب کی جانب سے قلوب میں پھوٹ پڑے ہیں۔ یورپ اور یورپ کے مذہب کی تاریخ کے یہ نتائج ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے (ک)۔

مگر خیال کیجیے اس زمانہ کو یعنی دوسری صدی ہجری کی ابتدائی مثالوں کو جس میں تقریباً ہر مسلمان دین کے نشہ میں سرشار اور مخمور تھا۔

لیکن ان کے دین ہی نے مسلمانوں میں بھی اور ان کی حکومت کے اندر بھی رواداری کے جذبہ کی نشو ونما میں کامیابی حاصل کی تھی، میں تو نہیں سمجھتا کہ اس کی نظیر آج بھی مل سکتی ہے۔

Marfat.com

اس قسم کے خیالات کہیے یا وساوس، لوگوں میں ان واقعات کے سننے کے بعد جو پیدا ہوتے ہیں یعنی سمجھ لیا جاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی ان رواداریوں میں بھی دخل ان لاپرواہیوں کو تھا جو مذہب کی جانب سے ان میں پیدا ہو گئی تھیں، میرے نزدیک اسلامی تاریخ کی جہالت پر مبنی ہیں ورنہ جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک دفعہ نہیں مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں ایسی صورتیں پیش آئی ہیں کہ اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے متعلق وقت کے بادشاہوں اور حکمرانوں میں زیادتی کا ارادہ پیدا ہوا، لیکن مسلمانوں کا مذہب سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور زیادتی کی طرف بڑھنے والے ہاتھوں کو اسی وقت روک دیا۔

عہد صحابہ جس کا اول و آخر ظاہر و باطن جیسا کہ میں نے عرض کیا سب کچھ دین ہی دین تھا۔ دین کے عنفوان شباب کے اس عہد میں تو خیر اس قسم کے واقعات کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی؟ تاہم ارادۃً نہ سہی بلا ارادہ یا عدم واقفیت کی وجہ سے اس زمانہ میں بھی بعض ایسی صورتیں جب کبھی پیش آئی ہیں، تو خود اسلام ہی نے غیر مسلموں کو نقصان سے بچا لیا۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ کے اس واقعہ کا ذکر شاید کسی اور مناسب مقام پر آئے گا، جب ان میں اور قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت کے درمیان خاص مدت تک کے لیے صلح کا معاہدہ طے پایا تھا۔ مدت صلح کے اختتام کی تاریخ جب قریب آ لگی تو امیر معاویہؓ نے رومی سرحد کی طرف اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا، فوج کی قیادت خود ہی کر رہے تھے۔ ارادہ ان کا یہ تھا کہ مدتِ صلح ختم ہونے کے ساتھ ہی غفلت میں رومی سرحد پر دھاوا بول دیا جائے۔ مسلمانوں کی فوج رومی سرحد کے قریب پہنچ ہی چکی تھی کہ اچانک دیکھا گیا گھوڑے پر ایک سوار:

"اللہ اکبر وفاء لا غدر" (۴۲)

Marfat.com

''خدا سب سے بڑا ہے، معاہدے کی تکمیل ہونی چاہیے، غدر اور عہد شکنی سے کام نہ لینا چاہیے''

کا نعرہ لگا رہا ہے، امیر معاویہؓ نے اس کو طلب کیا، معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے صحابی عمرو بن عنبسہؓ ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ نے پوچھا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں، بولے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ معاہدے کے بعد دشمن پر حملہ اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک کہ معاہدے کی تاریخ ختم ہونے کے ساتھ فریق کو مطلع نہ کر دیا جائے۔ یہ سننے کے ساتھ ہی امیر معاویہؓ اپنی فوج کو لے کر واپس ہو گئے (ل)۔(۴۳)

اور اسلامی حکومت کے ان غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جن کی ذمہ داری حکومت قبول کر لیتی تھی، صحابہ کی ہمدردیوں یا حکام کی زیادتیوں سے بچا لینے کے لیے خود سینہ سپر ہو جانے کے واقعات کا تو ایک سلسلہ ہے جو مختلف علاقوں میں مختلف مواقع میں پیش آتے رہے، حدیث و سیر کی عام کتابوں میں اس کے نمونے آپ کو مل سکتے ہیں۔

مگر اس عہد سعادت کے گذر جانے کے بعد بھی بنی امیہ والوں کے ہاتھ میں اسلامی حکومت کی باگ جب آ گئی، اور بجائے خلفائے راشدین کے جیسا کہ معلوم ہے اپنے طریقہ حکومت میں وہ رومیوں اور ایرانیوں کے نقش قدم کو دیکھ کر چلنے کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی غیر مسلم طبقات کی حفاظت و صیانت میں آپ کو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کے دین ہی نے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی رائے عامہ پر چونکہ مذہب کا اثر تھا۔ اس لیے حکمرانوں کو ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔

البلاذری نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے مشہور عیاش و دین باختہ حکمران ولید

Marfat.com

بن یزید نے منجملہ دوسری حرکتوں کے ایک حرکت یہ بھی کی تھی کی قبرص کے غیر مسلم باشندوں کی ایک ٹولی کو اس نے قبرص کے جزیرے سے نکال کر شام میں توطن اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، چونکہ ولید کا یہ فعل شرعاً صحیح نہ تھا اس لیے مسلمانوں کی رائے عامہ نے بھی اس کی مخالفت کی اور استعظمه الفقهاء'' اسلامی فقہاء نے اسے جرم عظیم خیال کیا'' (۴۴)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولید جب مارا گیا اور یزید بن الولید بن عبدالملک اس کا جانشین ہوا تو: ''ردهم الی قبرص'' (۴۵)

''ان غیر مسلم لوگوں کو اس نے قبرص سے واپس کر دیا''

لکھا ہے کہ فقہائے امت کے اس فتوے کی جب تعمیل حکومت نے کی تو:

''فاستحسن المسلمون ذلک من فعله و رده عدلا'' (۴۶)

''عام مسلمانوں نے یزید کے اس کام کو سراہا اور اس کے اس طرز عمل کو عدالت اور انصاف کا تقاضا قرار دیا گیا''

البلاذری ہی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کوہ لبنان کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی صورت ایک دفعہ پیش آئی، یعنی بعض لوگ جنہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی، ان کے ساتھ چند ایسے آدمی جو مجرم نہ تھے ان کو بھی حکومت کی طرف سے جلاوطنی کا حکم دیا گیا۔ اس وقت امام اوزاعی موجود تھے، اُنہوں نے اس علاقہ کے صوبہ دار کے نام جس نے جلاوطنی کا حکم دیا تھا ایک طویل مراسلہ لکھا، اس مراسلہ کے بعض اجزاء البلاذری نے نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

''چند خاص لوگوں کے جرم میں تمہیں کیا حق تھا کہ جرم میں جو شریک نہ تھے ان کو بھی تم نے سزا میں شریک کر دیا، قرآن کا حکم ہے کہ ''ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا'' (م)۔ (۴۷)

Marfat.com

امام اوزاعی نے اس قرآنی حکم کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

''جس کے سامنے ٹھہر جانا چاہیے وہ قرآن ہی کا حکم ہے''۔(۴۸)

پھر آنحضرت ﷺ کے اس مشہور ارشاد کی طرف توجہ دلائی یعنی اسلامی حکومت جن لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے کچھ دیر پہلے ان کی حفاظت و صیانت کی طرف خاص توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی۔

میں نے اس حدیث کا پہلے بھی ذکر کیا ہے، الاحکام السلطانیہ میں الماوردی نے اسی حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آخری گفتگو (ن) جو فرمائی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''روی نافع عن ابن عمر قال کان آخر تکلم به النبی ﷺ ان قال احفظوا فی ذمتی ''(۴۹)

''نافع، ابن عمر کے حوالے سے یہ بیان کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے آخری گفتگو جو فرمائی وہ یہ تھی کہ میری ذمہ کی نگرانی کیجیے، (یعنی جن لوگوں کی ذمہ داری میں نے مسلمانوں کے حکمران ہونے کی حیثیت سے لی ہے ان کی ذمہ داریاں پوری کی جائیں)''

بہرحال امام اوزاعی نے اسی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے مراسلہ کے آخر میں لکھا تھا کہ:

''دنیا کی ساری وصیتوں میں سب سے زیادہ توجہ اور تعمیل کی مستحق رسول اللہ ﷺ کی وصیت ہے، آپ نے فرمایا کہ عہد جن لوگوں سے کیا جا چکا ہے، ان پر جو ظلم و زیادتی کرے گا، یا ان کی برداشت سے زیادہ بار ان پر ڈالے گا میں قیامت کے دن اس کے خلاف مدعی بن کر کھڑا ہوں گا''۔(۵۰)

رائے عامہ اور دین کے خصوصی نمائندے یعنی علماء فقہاء کی اسی دارو گیر کا نتیجہ تھا کہ اس قسم کے غیر مسلم اقوام کے متعلق جب حکومت کے سامنے کوئی مسئلہ پیش آتا تو عموماً قاعدہ تھا کہ وقت کے علمائے دین سے اس مسئلہ کے متعلق حکومت دریافت کرتی اور علماء کا جو فتوی ہوتا اسی کے مطابق عمل کرتی تھی۔

بنی امیہ کا دور ختم ہو چکا تھا اور عباسیوں کی دولت قائم ہو چکی تھی، اسی جزیرہ قبرص ہی کے متعلق عباسیوں کے عہد میں بھی پھر پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، اور یہ سوال اٹھا کہ جو طرز عمل اس جزیرے کے غیر مسلم باشندوں نے اختیار کیا ہے اس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا نہیں۔ لکھا ہے کہ وقت کے علماء کی خدمت میں حکومت کی طرف سے سوال بھیجا گیا جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر لیث بن سعد امام مصر، مالک بن انس امام دار الھجرۃ مدینہ منورہ، سفیان بن عیینہ امام حرم مکہ کے سوا، موسی بن اعین، اسماعیل بن عیاش، یحی بن حمزہ و اسحاق الفزاری اور مخلف ابن حسین بھی تھے، البلاذری نے ان میں سے ہر عالم کے جواب کا ذکر کیا ہے۔(۵۱)

الفاظ جواب کے اگر چہ مختلف تھے لیکن تقریباً اکثروں نے عموماً وہی جواب دیا تھا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دیا گیا تھا، امام مالکؒ نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

''قبرص والوں کے ساتھ امن وامان کا معاہدہ بہت پرانی بات ہے، اسلامی حکمرانوں نے ہمیشہ اس معاہدے کی پابندی کی''۔(۵۲)

اسی کے بعد آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ:

''میں نے کسی حاکم کو نہیں دیکھا جس نے صلح کے اس معاہدے کو توڑا ہو جو قبرص والوں سے کیا گیا ہے اور نہ ان کو ان کے علاقے سے نکالنے کی جرات کسی نے کی، پس چاہیے کہ ان کے متعلق جلد بازی سے فیصلہ میں کام

نہ لیا جائے ، بلکہ معاہدے کو باقی رکھا جائے ۔قرآنی حکم کا بھی یہی اقتضاء ہے، ہاں اس کے بعد بھی اگر اپنے معاہدے پر قبرص والے قائم نہ رہیں اور دشمنوں (س) کے ساتھ اندرونی میل جول کو ترک نہ کریں، ان کی عہد شکنی واضح ہو جائے تب پھر حکومت کے لیے صحیح ہوگا اور اس کے بعد جو معاملہ بھی ان کے ساتھ کیا جائے گا امید کی جاتی ہے کہ خدا کی طرف سے امداد ہوگی اور دشمنوں کو ذلت و رسوائی اٹھانی پڑے گی'' (ع)۔(۵۳)

لیث بن سعد نے بھی سال بھر انتظار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

عباسیوں ہی کے عہد حکومت کا مشہور واقعہ ہے کہ ہارون الرشید نے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ان حقوق میں دست اندازی کا ارادہ کیا جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں اس قبیلے کے عیسائیوں کو حاصل تھے (ف)۔(۵۴)

ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف کی وفات ہو چکی تھی، اس لیے امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی کو ہارون نے بلا کر مسئلہ دریافت کرتے ہوئے اپنے ارادے کا اظہار کیا اس نے امام محمد سے کہا کہ:

''بنی تغلب کے ان عیسائیوں کو میں دیکھ رہا ہوں کہ جن امور کی پابندی انہوں نے قبول کی تھی، ان کی مسلسل خلاف ورزی کر رہے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ ان خلاف ورزیوں کے بعد ان حقوق سے وہ محروم ہو گئے جو اسلامی حکومت کی طرف سے از روئے معاہدہ ان کو حاصل تھے'' (۵۵)

ہارون الرشید جیسے مطلق العنان حکمران کے اس ارادے اور اس کی اس تقریر کو سن لینے کے بعد آپ جانتے ہیں امام محمد نے کیا فرمایا، لکھا ہے کہ ہارون نے امام سے پوچھا کہ جن دفعات کی خلاف ورزی کا الزام ان عیسائیوں پر آپ لگا رہے ہیں کیا یہ کوئی نئی بات ہے، یا حضرت عمرؓ جن کی حکومت نے ان سے معاہدہ کیا تھا، ان

Marfat.com

ہی کے زمانے سے ان خلاف ورزیوں کے وہ مرتکب ہوتے چلے آ رہے ہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بھی کیا وہ یہی نہیں کرتے رہے، جو آج کر رہے ہیں اور جس کا الزام آپ ان پر لگا رہے ہیں۔

امام محمد نے کہا کہ حکومت کے ان سارے ادوار میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بنی تغلب سے باز پرس نہیں کی گئی تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ:

"فهذا صلح من الخلفاء بعدة و لا شئی یلحقک فی ذلک"(۵۶)

''حضرت عمرؓ کے بعد کے خلفاء کی طرف سے اب گویا ان کے ساتھ صلح کی یہی صورت طے ہوگئی، اور اس صلح میں دست اندازی کا کوئی حق آپ کو نہیں پہنچتا''

بعض روایتوں میں ہے کہ ہارون نے امام محمد سے پہلے کہا تھا کہ حضرت عمرؓ کو موقع نہ مل سکا، کیونکہ بنی تغلب کے ساتھ صلح کرنے کے کچھ ہی دن بعد ان کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ امام محمد نے کہا کہ مان لیا جائے کہ عمرؓ کو موقع نہ ملا، لیکن ان کے بعد بھی دو عادل ائمہ (عثمانؓ و علیؓ) کے زمانہ میں بھی یہ جانتے ہوئے کہ بنی تغلب معاہدے کی بعض دفعات کی تکمیل نہیں کر رہے ہیں، ان سے پوچھ گچھ نہ کی گئی۔ جس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ بنی تغلب کے معاہدے سے اس شرط کو عملاً حکومت نے خارج کر دیا۔ آپ کے لیے ایسی صورت میں دخل اندازی کی کوئی قانونی شکل باقی نہیں رہتی۔ لکھا ہے کہ ہارون نے امام محمد کے اس فتوے کو سن کر کہا کہ:

"نجریه علی ما اجروه انشاء اللّٰه تعالی"(۵۷)

''ہم بھی انشاء اللہ ان کے ساتھ اسی طرز عمل کو جاری رکھیں گے جسے ان خلفاء نے ان کے ساتھ جاری رکھا''

Marfat.com

کہتے ہیں کہ آخر میں ہارون نے امام محمدؒ سے یہ بھی کہا کہ:

''آپ اس شخص کے لیے دعا کرتے رہیں جس کے ہاتھ میں خدا نے لوگوں کے معاملات سپرد کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی کہیے کہ اسی کی دعا وہ بھی کرتے رہیں''۔(۵۸)

دیکھا آپ نے مسلمانوں کا حکمران اپنی حکومت کے ایک غیر مسلم طبقہ کے ساتھ زیادتی کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن اسلام نے آگے بڑھ کر اس کو روک دیا اور بنی تغلب کے عیسائیوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

لوگ علمائے اسلام پر تنگ نظری کا الزام عائد کرتے ہیں۔ اسلام اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ نرم و گرم ہر طرح کے لوگ عالم ہوتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی بعضوں کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہو، جن کی تنگ نظری کا اطلاق درست ہو، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اکثریت علماء میں بھی ان ہی لوگوں کی نظر آتی ہے جن کی ایک مثال امام محمدؒ کا مذکورہ طرزِ عمل ہے۔

اور یہ تو خیر اسلام کے اس عہد کی مثال ہے، جس کے متعلق دوست ہی نہیں دشمنوں میں بھی جن لوگوں نے اسلامی تاریخ اور اسلامی علماء کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی آزادی رائے اور وسعت نظری کے اعتراف میں مجبور ہیں۔

مگر میں تو آپ کے سامنے اس زمانہ تک کی مثالیں پیش کرتا ہوں جب یہ واقعہ ہے کہ علمائے اسلام اپنی پرانی خصوصیتوں سے محروم ہو چکے تھے، امام محمدؒ کی طرح فتوی دینے میں قانون کے ساتھ ساتھ حالات اور واقعات کو بھی سامنے رکھنے کی عادت روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ قانون کی روح سے زیادہ قانون کے الفاظ پر اصرار بیجا کا طریقہ مولویوں میں پھیل چکا تھا، تاہم زوال و انحطاط کے اس زمانے کی بھی یہ مثالیں لوگوں کی آنکھیں کھول سکتیں ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کے زمانہ کے علماء پر قانون کے الفاظ کا رعب چھایا ہوا تھا، تاہم اسی زمانہ کا قصہ ہے مشرقی یورپ کا بڑا حصہ ترکوں کے قبضہ میں آچکا تھا، نہ صرف اسی علاقہ کے عیسائیوں بلکہ ترکی علاقے کے ہر عیسائی کے متعلق لکھا ہے کہ سلطان سلیم عثمانی نے ارادہ کیا کہ:

''عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے یا ان کو یہ حکم دیا جائے کہ ہمارے علاقہ سے وہ دور نکل جائیں''۔(۵۹)

سلیم اپنے ارادہ اور عزم میں جتنا پختہ تھا، اس سے سلاطین ترکی کے حالات جاننے والے واقف ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ سلطان سلیم کا یہ ارادہ اگر نافذ ہو کر عمل کی صورت اختیار کر لیتا تو سلطنت ترکی ہی میں نہیں بلکہ بلقانی ریاستوں کے اکثر حصوں میں آج عیسائیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا، مگر اس وقت بھی مسلمانوں کے اس حکمران کو جس قوت نے اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہ دیا وہ لا مذہبیت اور بے دینی کی قوت نہ تھی بلکہ دینی طاقت کے ایک نمائندہ عالم جن کا نام مفتی جمالی تھا، وہ سلیم کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اس غضبناک خونی بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں:

"لا یحل لک ذلک"(۶۰)

''تمہارے لیے یہ اقدام مذہباً کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں ہو سکتا''

مفتی جمالی نے اس قوت کے ساتھ اسلام کے اس فتوی کو سلیم کے سامنے پیش کیا کہ اس کا آہنی ارادہ بھی موم بن کر رہ گیا۔

اسی سلطنت ترکی کے ایک دوسرے واقعہ کا تذکرہ تاریخوں میں ملتا ہے، یہ قصہ تو طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مراد رابع کا ۱۶۴۰ء میں انتقال ہو گیا اور خاندان عثمانی میں مراد کے بھائی ابراھیم کے سوا کوئی دوسرا شاہزادہ ایسا باقی نہ رہا تھا

Marfat.com

جسے بادشاہ بنایا جائے۔ ارباب حل وعقد نے ابراہیم کو بادشاہ منتخب کیا، آسٹریا اور سلطنت ترکی سے جو آویزش زمانے سے چلی آرہی تھی اس آویزش کو حالانکہ ابراہیم نے صلح کر کے ختم کر دیا تھا لیکن باایں ہمہ حسب عادت یورپ والے ترکی حکومت کو برو بحر میں زک پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ایک جہاز ترکی سے عرب روانہ ہوا، اس میں حرم شاہی کی ایک حرم بھی تھی اور حرم کے ساتھ بچہ بھی تھا، مالٹا کے بحری قزاقوں نے اس ترکی جہاز پر حملہ کیا، کش مکش کے بعد جہاز والے مغلوب ہو گئے اور حرم سرا کی لونڈی اپنے بچہ کے ساتھ مالٹا والوں کے ہاتھ آئی، حالانکہ یہ بچہ ابراہیم کا زائیدہ نہ تھا، لیکن حرم شاہی کے ساتھ اس کو پا کر یہی مشہور کر دیا گیا کہ ایک عثمانی شاہزادہ گرفتار ہوا ہے۔ اس شہرت کے ساتھ اس بچہ کو جبراً عیسائی بنا لیا گیا، اور مذہبی تعلیم دے کر مذہبی پیشوا بھی لوگوں نے اس کو بنا لیا۔ لکھا ہے کہ مالٹا کے عیسائیوں میں ''عثمانی پادری'' کے نام سے مشہور ہوا۔ سارے یورپ والے اس پادری کو ترکوں کے شاہی خاندان کا شاہزادہ سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جزیرہ کریٹ پر بھی اسی زمانے میں مالٹا والوں نے حملہ کر دیا، بہرحال اس عام رسوائی اور فضیحت کے سوا جو اس فرضی ترکی شاہزادے کے پادری بن جانے کی وجہ سے سلطنت ترکی کی ہو رہی تھی، دوسرے واقعات نے بھی انتقام کے جذبہ کو ہوا دی، ابراہیم پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی، اسی جنون میں اس نے یہ فرمان نافذ کیا کہ:

''ممالک محروسہ کے ایک ایک عیسائی کو چن چن کر قتل کر دیا جائے'' (۶۱)

مگر ان بے قصور عیسائیوں کی جان بچانے کے لیے اس وقت بھی جو آگے بڑھا وہ سلطنت ترکی کا شیخ الاسلام ہی تھا۔

امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ:

''ان شیخ الاسلام عارضه بشدة فتوقف عن انفاذ هذا الأمر'' (۶۲)

Marfat.com

''شیخ الاسلام نے پوری قوت کے ساتھ ابراہیم کے اس فرمان کا مقابلہ کیا تا آنکہ شاہی فرمان کا نفاذ نہ ہوسکا'' (ص)

دور کیوں جایئے، اسی ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آچکا ہے یعنی سکندر لودھی نے علماء کو بلاکر جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے یہ دریافت کیا کہ تھانیسر (کورک شیتر) میں ہندوؤں کا جو مہان گھاٹ ہے اور طرح طرح کے افعال کا ارتکاب وہاں کیا جاتا ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ ایک عالم نے سکندر کے رجحانات کو جاننے کے باوجود صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ:

''نہ وہاں کے بت خانے کو آپ ہاتھ لگا سکتے ہیں اور نہ اس تالاب میں دست اندازی کرسکتے ہیں جس میں ہندو غسل کرتے ہیں'' (۶۳)

کہتے ہیں کہ مولوی کے اس فتوے کو سن کر سکندر بیتاب ہوگیا:

''دست بخنجر کردہ گفت کہ حمایت کفار می کنی'' (۶۴)

''خنجر کو ہاتھ میں لے کر سکندر نے اس مولوی کو خطاب کر کے کہا کہ تم کافروں کی حمایت کرتے ہو''

بادشاہ بے دینی پر آمادہ تھا، خنجر بکف سامنے آگیا ہے لیکن اسلامی دین کا نمائندہ ہر چیز سے بے پرواہ ہوکر اس وقت بھی یہی کہہ رہا تھا:

''آنچہ در شرع آمدہ ست می گویم و راہ خلاف نمی گویم'' (۶۵)

''شریعت اسلامی کا جو حکم ہے میں اسی کو دہرا رہا ہوں اور کوئی غیر شرعی بات نہیں کہہ رہا ہوں''

سکندر اور سکندر کے عہد کے وہ مولوی صاحب دنیا میں باقی نہ رہے، لیکن کورک شیتر اپنی ساری عبادت گاہوں اور نہان گھاٹوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ یقیناً اس دن اسلام ہی تھا جس نے ہندو کے ان معابد اور غسل خانوں کو بچالیا،

ورنہ سکندر اور اس کی طاقت سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب درمیان میں آ کر اس کا ہاتھ اگر نہ روک لیتا تو آج کوئی کورک شیتر کا جاننے والا بھی دنیا میں موجود نہ رہ سکتا تھا۔

بہر حال میری غرض یہ ہے کہ سلف کے اسلامی حکمرانوں پر مسلمانوں کا ایک طبقہ جو آج جھنجھلا رہا ہے اور اپنی موجودہ پریشانیوں کا الزام ان کے سر تھوپنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے کہ واقعات سے واقف ہو جانے کے بعد مسلمان بادشاہوں پر نہیں بلکہ اس کو چاہیے کہ اسی دین پر الزام لگائے، جس دین کی حفاظت اور صیانت کی خیالی تدبیروں میں اپنی اس تدبیر کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اپنی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو ہمارے بادشاہوں نے باقی کیوں رہنے دیا۔ ورنہ جو مصیبت ان ہی کی پچھلی نسلوں نے مسلمانوں پر توڑی ہے اور توڑ رہی ہیں، اس مصیبت کا سد باب اسی زمانہ میں ہو جاتا۔

اب ان بھولے بھالے معصوموں کو میں کیا سمجھاؤں۔ یورپ میں تو اسی کا انتظام کیا گیا تھا، چن چن کر وہاں کے باشندے عیسائی بنا لیے گئے (ق) لیکن باوجودیکہ سارا یورپ ایک مذہب کا پیرو بن گیا مگر اسی ایک دین کے ماننے والے عیسائیوں کے درمیان کیا کچھ نہیں ہوا۔ اور کیا نہیں ہو رہا ہے۔

غریب یورپ نے دینی وحدت ہی نہیں بلکہ تعلیم و جمہوریت اور خدا جانے کن کن طریقوں سے ان مصائب کے انسداد کی کوشش کی۔ لیکن کوئی تدبیر اس راہ میں کارگر ثابت ہوئی ہے؟

جب ان مصائب کے اسباب ہی دوسرے ہیں تو یہ خود ساختہ اسباب کے ازالہ کی کوشش ہمیشہ ناکام رہے گی۔

بلاشبہ تبلیغ و دعوت جیسے ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے، ہمارے

سلاطین و امراء پر بھی یہ فرض عائد ہوتا تھا، لیکن ہر عامی مسلمان میں اسی فرض کا کیا بہت سے دوسرے اسلامی فرائض و واجبات کا احساس جیسے مردہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلامی حکمرانوں کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سب میں اس فرض کا احساس زندہ تھا۔ تاہم اس زمانہ کے مفروضہ اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں کہ دین کی اشاعت کا جو واقعی مقصد خود دین کے لانے والے نے بتایا ہے، اس کو سامنے رکھ کر یہ واقعہ ہے کہ ہر دور میں ہم حکمرانوں کے طبقات میں بھی اس جذبہ کو زندہ اور بیدار پاتے ہیں۔

نبوت کے منہاج اور طریقہ کی پابندی کرتے ہوئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانشینی اور خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیابی حاصل فرمائی، یعنی حضرات خلفائے راشدینؓ انہوں نے اس راہ میں جو کچھ کیا، اس سے تو خیر دنیا واقف ہے، خلافتِ راشدہ کے اس عہد میں سچی بات تو یہی ہے کہ دین اور دین کی تبلیغ و اشاعت کے سوا کوئی دوسرا کام اسلامی حکومت کے سامنے تھا ہی نہیں، اس مسئلہ میں ان حضرات کے استغراق و غلو کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ روم و ایران کے علاقے جو فتح ہوئے اور جن دفاتر سے ان علاقوں کی حکمرانی وابستہ تھی، کون نہیں جانتا کہ ان دفتروں کی زبان اور خط تک کے بدلنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی، ایرانی علاقوں میں فارسی زبان و خط اور رومی علاقوں میں رومی زبان و خط ہی کا رواج بنی امیہ کے ابتدائی عہد تک باقی رہا(ر)۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، سکہ جسے ہر زمانہ میں حکومتوں نے اپنا خصوصی شعار اور حکمرانی کی علامت قرار دیا ہے لیکن ایشیا اور افریقہ کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو جانے کے بعد بھی آنحضرت ﷺ کے ان خلفائے راشدین کی خصوصی توجہ ٹکسال بنانے کی طرف متوجہ نہ ہوئی، جس کی وجہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ان کے سامنے دین کے سوا کوئی دوسری چیز تھی ہی نہیں۔

Marfat.com

ساری نسل انسانی تک پہنچانے کے لیے خدا کی طرف سے آخری دینی پیغام ان کے سپرد ہوا تھا۔ اسی پیغام کو وطنی، نسلی، لونی، لسانی وغیرہ خود ساختہ قومی خصوصیات سے قطع نظر کر کے ہر اس شخص تک پہنچا دینے کی ایک ہی دھن تھی جس میں وہ ہمہ تن ڈوبے ہوئے تھے۔ نظر کی اسی وسعت کا اقتضاء تھا کہ ہر ملک کو وہ اپنا ملک، ہر قوم کو اپنی قوم خیال کرتے تھے۔ تحصیل و وصول کے دفاتر کی زبان کیا ہے اور لین دین کس حکومت کے سکے سے کر رہے ہیں، ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی ان بزرگوں کی نگاہ میں نہ تھی۔ اسی لیے میری گفتگو کا تعلق خلافتِ راشدہ کے حکمرانوں سے بھی نہیں۔ بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس عہد کے بعد ہزار بارہ صدیوں تک دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی جو حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خلافتِ راشدہ کی دینی خصوصیتوں سے ان پچھلے حکمرانوں کی حکومتیں آئندہ زمانوں میں بتدریج عموماً محروم ہوتی چلی گئیں۔ تاہم آپ ابھی مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے سن چکے کہ دولتِ عباسیہ کے دوسرے فرمانروا ابو جعفر منصور نے اپنے عیسائی طبیب جور جس کے سامنے اپنی جس آخری آرزو کا اظہار کیا تھا، وہ یہی تھی کہ جور جس! تم اسلام قبول کر لو، میں جنت کی ضمانت تمہارے لیے لیتا ہوں۔

اسی ابو جعفر منصور کے پوتے یعنی ہارون الرشید نے قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کے نام ایک مبسوط و مفصل تبلیغی مراسلہ جو بھیجا تھا، تاریخ میں اس کی نقل آج تک محفوظ ہے، جس سے صرف اسی کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ دوسری قوموں اور امتوں تک اسلامی دین کے پہنچانے کا شوق ہارون پر کس درجہ مسلط تھا۔ بلکہ اسلام کے اصولی مقاصد و اغراض اور بنیادی روح کی یافت اور پھر اس کی تعبیر میں اس کا مقام کتنا بلند تھا (ش)۔

عباسی خلفا کے تبلیغی جذبہ ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ مامون الرشید اپنے دربار میں

Marfat.com

دوسرے ادیان و مذاہب کے پیشواؤں کو بلا کر علمائے اسلام سے تحقیق حق کے لیے مباحثہ اور مناظرے کی مجلسیں منعقد کیا کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں فرقہ مانویہ کے پیشوا یزدان بخت کا قصہ مشہور ہے کہ آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کے بعد بخت خاموش ہوگیا، تب مامون نے کہا:

''یزدان بخت دیکھ اب اسلام قبول کرنے میں تیرے لیے کیا عذر باقی رہا''۔ (۶۶)

یزدان بخت جس کا چہرہ شکست کی ذلت کی وجہ سے زرد تھا اس نے مامون سے کہا:

''اے امیر المؤمنین! اپ کی بات میں نے سن لی۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو دین کے معاملہ میں جبر سے کام لیتے ہیں''۔ (۶۷)

بات اسی پر ختم ہوگئی، مامون نے یہ سن کر یزدان بخت کو کچھ نہیں کہا۔ بلکہ حکم دیا کہ وطن تک فوجی نگرانی میں اس کے پہنچانے کا نظم کر دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی متعصب آدمی سے بیچارے کو کوئی نقصان پہنچ جائے (ت)۔ (۶۸)

بہر حال بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اسلامی حکمرانوں نے مختلف ممالک و امصار اور مختلف زمانوں میں دوسروں تک اسلامی پیغام کے پہنچانے میں جو کوششیں کی ہیں، کوئی چاہے تو صرف ان کوششوں کی داستان پر ایک ضخیم کتاب تیار کرسکتا ہے۔ ہارون و مامون وغیرہ تو پھر بھی عہدِ قدیم کے حکمران ہیں اور خلافت راشدہ سے ان کا زمانہ زیادہ دور نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں بھی بانی سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ اول تغمدہ اللہ بغفرانہ کے متعلق، ان کے دربار میں ثقہ عالم مولانا غلام علی یہ روایت سناتے ہیں کہ جب کوئی نیا آدمی اسلام میں داخل ہوتا تو

Marfat.com

آصف جاہ کا حکم تھا کہ بیعت اسلام کے لیے خود ان کی حضوری میں پیش کیا جائے۔ حضرت آصف جاہ براہِ راست اپنے دست حق پرست پر اس کی بیعت لیتے، اور کلمہ تلقین فرماتے، پھر خود ہی اس کا نام بھی تجویز فرما دیتے۔(۶۹)

اور یہ قصہ تو پھر بھی سترہویں صدی عیسوی کا ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کی مذہبی تاریخ نے اس ملک میں حقارت و اہانت کے جس مقام تک مذہب اور اس کے ذکر کو پہنچا دیا ہے، یہ شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ کسی مہذب سوسائٹی کے غیر مہذب بلکہ کسی شائستہ انسان کے غیر شائستہ بن جانے یا بنا دیئے جانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس سوسائٹی میں مذہب یا دین کا ذکر کسی حیثیت سے آ گیا ہے مگر اسی بیسویں صدی کے اسلامی حکمران کے جذبہ تبلیغ اور دعوت دین کے ذوق کو ملاحظہ فرمایئے۔ امیر شکیب ارسلان نے معیف پاشا کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں سلطنت ترکی کے یہ ناظم معارف (یعنی ناظم تعلیمات) تھے۔ خواپنا تاثر معیف پاشا کے متعلق امیر کا یہ تھا کہ گو بہ ظاہر وہ دین سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے، مگر آدمی بڑے سچے تھے، یوں ہی بے بنیاد سنی سنائی روایتوں کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے۔ بہر حال ان کے کردار اور راست بازی کی تعریف کرنے کے بعد امیر نے لکھا ہے کہ معیف پاشا نے براہِ راست مجھ سے روایت نقل کی، کہ سلطان عبدالحمید مرحوم کے زمانہ میں جاپانی امیر کی جب ملاقات ہوئی، تو گفتگو کے سلسلہ میں سلطان نے جاپانی امیر سے دریافت کیا کہ:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل جاپان کے لوگ کسی مذہب کی جستجو میں سرگرداں ہیں''۔(۷۰)

پھر سلطان نے اس کے بعد فرمایا کہ:

''اگر یہ واقعہ ہے تو میں آپ کو دین اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دیتا

Marfat.com

ہوں''۔(۷۱)

جاپانی امیر نے اس کے جواب میں کہا کہ:

''جلالتمآب کو جو خبر پہنچائی گئی ہے، یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ ہم لوگ اپنے قدیم دین ہی پر قائم ہیں اور اسی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہتے ہیں''۔(۷۲)

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے، لوتھر اسٹوواردٹ جو The New World of Islam کے مصنف ہیں، عرب میں اسی کا ترجمہ ''حاضر العالم الاسلامی'' کے نام سے شائع ہوا ہے، اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''سلطان عبدالحمید نے ایک تبلیغی وفد کو حکومت کے جنگی جہاز پر جاپان روانہ بھی کیا تھا''۔(۷۳)

یہ خبر بھی اس کتاب میں درج ہے کہ مسلمانوں کا یہ تبلیغی وفد جب جاپان پہنچا تو حکومت جاپان کی طرف سے اس کو خوش آمدید کہا گیا اور ارکانِ وفد کی ملک کے اکثر حصوں میں بڑی آؤ بھگت ہوئی اگرچہ اسلام کے پیغام کو جاپانی حکومت نے قبول نہیں کیا۔(۷۴)

بہرحال خلفائے راشدین کے بعد بھی یہ دعویٰ کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہوسکتا کہ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اسلامی سلاطین اور فرمانرواؤں پر دین کی تبلیغ و دعوت کا جو فرض عائد ہوتا تھا، اس فرض کے احساس سے ہر زمانہ میں ہر ایک خالی تھا۔ مذکورہ بالا چند مثالیں جو اسلامی ابتدائی زمانہ سے بیسویں صدی عیسوی تک کے نمونوں پر مشتمل ہیں، غالباً اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے کافی ہوسکتی ہیں۔

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صرف چند سرسری نمونے ہیں، جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، ورنہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اگر کوئی کرنا چاہے تو بلا مبالغہ ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہی اسلامی سلاطین کی تبلیغی جدوجہد پر تیار ہوسکتی ہے (ث)۔

Marfat.com

اور سچ تو یہ ہے کہ اصطلاحاً تبلیغ و دعوت کے الفاظ سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے یعنی تقریری یا تحریری شکلوں میں غیر مسلم اقوام کے آگے دین کو پیش کرنا، یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ کلیتہً اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے مگر اسی کے ساتھ کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ قلم اور زبان کی تبلیغ سے زیادہ اور بہت زیادہ ہمیشہ ثابت ہوا ہے کہ مؤثر ترین ذریعہ دین کی دعوت کا عمل ہے۔

اسلام کے قبول کرنے میں بھی اور مسلمانوں سے نفرت و عداوت کے بڑھانے میں بھی زیادہ تر دخل مسلمانوں کے طرزِ عمل کو رہا ہے، جس زمانہ میں اور جس علاقے میں صحیح اسلامی زندگی کی پابندی مسلمانوں نے کی ہے، تو میں ان کے عملی نمونوں کو دیکھ بھال کر خود ان کی طرف مائل ہوئی ہیں اور اسلامی تعلیمات سے مسلمان جس حد تک بے تعلق ہوئے ہیں، میں پاتا ہوں کہ قوموں کے قلوب بھی ان سے ٹوٹتے چلے گئے ہیں۔ بلکہ اسی قسم کے مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی نے خود اسلام کے لوگوں کو بسا اوقات دور کر دیا ہے۔ صرف خوبصورت تعبیروں، یا تقریری خوش نوائیوں، انشائی دلآویزیوں سے عملی زندگی کے اس نظام کو بنی آدم پر مسلط کرنا آسان نہیں ہے جس کی بنیاد چند ٹھوس غیر فانی صداقتوں کے یقین پر قائم ہے۔ جن لوگوں کا عمل ان کے علمی نظریات کا مسلسل مضحکہ اڑا رہا ہو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ان ہی نظریات یا معلومات و عقائد کے یقین کو دوسروں تک منتقل کرنے میں وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ عمل کی حیثیت ظاہر ہے کہ اس باطنی اعتماد اور بھروسے کی دلیل کی ہے، جس کا دعویٰ اپنے دینی نظریات و مسلمات کے متعلق آپ کرتے ہیں، پھر اپنے دعوے کی دلیلوں کی جو وکیل خود تردید کر رہا ہو، فیصلہ کرنے والے اس وکیل کے دعووں کے متعلق جو فیصلہ کریں گے، وہ ظاہر ہے۔

اور جیسے عام مسلمانوں کے متعلق قوموں کی محبت و عداوت کا مذکورہ بالا

Marfat.com

تجربہ مسلسل ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے، بجنسہ اسی تجربہ کا مشاہدہ مسلمانوں کی حکومتوں اوران کے حکمرانوں کے متعلق بھی گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں کیا گیا ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ بیت المقدس پہنچنے کے بعد حضرت عمرؓ کے متعلق عام تاریخوں میں اس واقعہ کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ ''کنیۃ القمامہ'' میں نماز کا وقت آ گیا، بطریق سے آپ نے فرمایا کہ نماز پڑھنے کی کوئی جگہ بتاؤ، بطریق یعنی گرجا کا پادری جس کا نام صفرونیوس تھا، اس نے گرجے کے اندر کسی جگہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ آپؓ یہاں نماز پڑھ سکتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

''آج یہاں میں نے نماز اگر پڑھ لی تو کل اس کا خطرہ ہے کہ مسلمان اس کی دلیل بنا کر کہ عمر نے یہاں نماز پڑھی ہے، تمہارے گرجے پر دعویٰ نہ کر بیٹھیں'' (۷۵)

یہ فرما کر گرجے سے باہر ہو کر آپ نے نماز ادا کی۔ کیا عیسائیوں کے دل میں اسلامی عدل وانصاف کا وزن اس واقعہ سے پیدا ہو سکتا تھا، یا اس سے کہ زبردستی حضرت عمرؓ اس گرجے میں نماز پڑھنے پر اصرار فرماتے۔ اسی سفر میں کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ شام کے جابیہ نامی مقام میں فروکش تھے، اتنے میں ایک عیسائی یا یہودی دوڑتا ہوا آیا اور آ کر عرض کیا کہ دیکھیے آپ کی فوج کے سپاہی میرے نخلستان پر ٹوٹے پڑے ہیں اور توڑ توڑ کر انگور کھا رہے ہیں۔ سنتے کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ آپے سے باہر ہو گئے، خیمہ سے نکل پڑے، سامنے ایک سپاہی کو دیکھا کہ انگور کے خوشے اپنی ڈھال میں ڈالے چلا جا رہا ہے، پکار کر آپ نے روکا اور فرمایا:

''کیا تم نے بھی یہی کیا؟'' (۷۶)

سپاہی نے جواب میں کہا کہ ہم لوگوں پر بھوک کا غلبہ ہوا، کھانے کی کوئی چیز فوراً نہ ملی، سامنے انگور کا کھیت تھا، اسی سے ہم نے خوشے توڑ لیے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت ایک آدمی کو اس عیسائی کے ساتھ کر دیا اور حکم دیا کہ اس کے نقصان کا

Marfat.com

صحیح اندازہ کر کے مجھے خبر دو، تخمینہ تاوان کا آ گیا، لکھا ہے:

"و امر لصاحب الکرم بقیمة عنبه"(۷۷)

''حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ انگور کی قیمت نخلستان کے مالک کو ادا کر دی جائے''

اور یہ تو ایک شخصی نخلستان کا قصہ ہے کون واقف نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلم اقوام کی زمینوں پر جو لگان عائد کیا گیا تھا، اس میں کتنی رعایت ان کے ساتھ کی گی تھی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں یہ روایت نقل کی ہے کہ عراق کے سواد (یعنی دجلہ و فرات اور ان سے نکالی ہوئی نہروں سے جو زمین سیراب ہوتی تھی) اس زمین کی پیائش کے بعد جب حضرت عمرؓ کے نمائندوں نے اس لگان یعنی خراج کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش کی تو آپ نے فرمایا:

''کاشتکاروں پر تم لوگوں نے اتنا بوجھ تو نہیں لاد دیا ہے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں''۔(۷۸)

جن لوگوں نے سواد کے مختلف حصوں کی پیائش کر کے مختلف زرعی پیداواروں کے لحاظ سے لگان لگایا تھا۔ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے، ان میں سے ایک صاحب یعنی حضرت حذیفہؓ ابن یمان نے فرمایا:

"لقد ترکت فضلا"(۷۹)

''میں نے کاشتکاروں کے حصہ میں زیادہ چھوڑ دیا ہے''

اور دوسرے صاحب جن کا نام عثمانؓ بن حنیف تھا، قاضی ابو یوسف نے جن کے متعلق لکھا ہے کہ جیسے ریشم کا تھان ناپا جاتا ہے، زمین کی پیائش اسی احتیاط سے انہوں نے کی تھی اور اس فن کے وہ ماہر تھے، بہر حال عثمانؓ بن حنیف نے کہا:

"لقد ترکت الضعف"(خ) (۸۰)

''میں نے جتنا لگان لگایا اس کا دونا کاشتکاروں کے لیے چھوڑ دیا ہے''

مگر پھر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا اور حکم دیا کہ ہر علاقہ کے دہقان کو میرے پاس ترجمان کے ساتھ روانہ کیا جائے، یہی کیا گیا، آپ نے دونوں سے اسی لگان کے مسئلہ پر پوچھ گچھ کی، مطلب یہ تھا کہ بیچاروں پر برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔

۔ اور یہ طرز عمل تو اس طبقہ کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا جو حکومت کے وفادار اور معاہدہ کے دفعات کے پابند تھے۔ لیکن جو لوگوں نے معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کی اور خطرہ پیدا ہوا کہ دشمنوں کو ان سے مدد ملے گی۔ بلکہ مختلف نازک موقعوں پر مسلمانوں کی دشمن حکومت یعنی رومیوں کی شام کے بعض علاقوں میں ان لوگوں نے مدد بھی کی، یہ عربسوس نامی خطے کے باشندے تھے، مگر جانتے ہو غدر و بغاوت کے اس جرم کی پاداش میں ان لوگوں کو اسلامی حدود سے باہر نکل جانے کا حکم حضرت عمرؓ کی طرف سے جب دیا گیا تو اسی کے ساتھ ان سے کہا گیا تھا؟ البلاذری نے نقل کیا ہے کہ:

''ہر چیز جسے وہ چھوڑ کر جائیں گے اس کا دونا ہرجانہ ان کو دیا جائے گا، مثلاً ایک بکری کے معاوضہ میں دو بکریاں، ایک گائے کے بدلہ میں دو گائیں، الغرض ہر ایک چیز کے مقابلہ میں دو چیزیں ان کو اسلامی حکومت عطا کرے گی''۔(۸۱)

کیا یہ یا اسی قسم کے بیسیوں واقعات جن کا تماشا خلافت راشدہ کے عہد میں ہر طرف پیش ہو رہا تھا، ان کو دیکھ کر یہ سوال کوئی مشکل یا لاینحل سوال باقی رہ جاتا ہے کہ دین اللہ میں افواجاً کی شکل میں لوگ جو داخل ہوتے چلے جا رہے تھے اس کا سبب کیا تھا؟ انسانی فطرت بہر حال انسانی فطرت ہے، اس میں قدرۃً حق و باطل کے امتیاز کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ مگر حق کو واقعۃً حق کی شکل میں پیش بھی تو کیا جائے۔ تقریروں اور تحریروں میں تو صرف بڑے بڑے دعوے پیش ہوتے

ہیں مگر آدمی تو دلائل کا رسیا ہے۔ دعوے فقط خشک دعوے ان پر چڑھنے والے جس قسم کے حسین و دلکش الفاظ کے خول چڑھا رہے ہوں، سننے کی حد تک تو لوگ سن لیتے ہیں، بلکہ خول چڑھنے کی مہارت کی تعریف بھی ممکن ہے، تھوڑی دیر کے لیے کر دیں، لیکن جو کچھ کہا گیا وہ کیا بھی جاتا ہے یا نہیں، شعوری و غیر شعوری طور پر حقیقی فیصلہ صرف اسی سوال کے جواب کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ دوسرا گال بھی اس کے آگے پیش کر دو، جس نے تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارا اور جو تم سے کرتا چھینتا ہو، دھوتی بھی اس کے حوالہ کر دو۔ بے گاری میں ایک میل چلنے پر تمہیں اگر کوئی مجبور کرے، تو بجائے ایک میل کے دو میل چل کر اس کے سامان کو پہنچا دو۔

عدم تشدد یا اہنسا کے ان انجیلی اصولوں کا لوگ جب ذکر کرتے ہیں، تو کوئی شبہہ نہیں کہ دنیا کی موجودہ جہنمی زندگی اچانک نظر آتی ہے، کہ بہشتی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی، لیکن ان ہی انجیلی اصولوں کی منادی کرنے والوں کو ان اصولوں کے سننے والے جب دیکھتے ہیں کہ مارنا تو خیر دور کی بات ہے، کسی کے گال پر تھپڑ کا خیال بھی جن کے دلوں میں نہ تھا، ان کی گردنیں کندھوں سے اتار رہے ہیں۔ جنہوں نے کسی کے کپڑے کے دھاگے کو بھی بد نیتی سے نہیں دیکھا تھا بلکہ اپنے کپڑے مصیبت کے دنوں میں جن لوگوں کو اتارا تار کر پہنائے تھے، ان ہی محسنوں سے کپڑے ہی نہیں چھین رہے ہیں بلکہ بچوں کو ان کی گودیوں سے اتارا تار کر ذبح کر رہے ہیں۔

سوچا جا سکتا ہے کہ انجیلی اصولوں کے واعظوں کے عمل اور فعل کا جب یہ حال ہو تو سہانے الفاظ کے خالی ڈھول کی یہ آواز دلوں کو کب تک متاثر رکھ سکتی ہے؟

مگر اسی کے مقابلہ میں سنیے، حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا مشہور واقعہ ہے، اسلامی حکومت کی طرف سے تجارتی محصول (کردر گیری یا چنگی) کے وصول کرنے کی سرحدی علاقوں پر جب تنظیم ہوئی، فرات کی آبی راہ پر بھی چوکی قائم

Marfat.com

ہوئی، دریا پر ایک رسہ پھینک دیا جاتا تھا، تجارتی کشتیاں اسی راستہ سے آ کر اٹک جاتی تھیں اور محصول وصول کرنے والے تجارتی سامان کا تخمینہ کر کے محصول وصول کرتے تھے۔ شروع زمانہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ایک عیسائی سوداگر اسی راہ سے اپنا تجارتی مال لے کر گذر رہا تھا، زیاد بن حدیر جو اس چوکی کے امین تھے، انہوں نے محصول وصول کر لیا، کچھ دن بعد پھر عیسائی تاجر کاروبار سے فارغ ہو کر اسی راہ سے واپس ہو رہا تھا، زیاد بن حدیر امین کر در گیری نے اس کے مال کا پھر جائزہ لینا چاہا، عیسائی سوداگر نے کہا کہ ایک دفعہ میں محصول ادا کر چکا ہوں، کیا مجھ ہی سے دوبارہ تم محصول وصول کرو گے، چونکہ ابتدائی زمانہ تھا، سابقہ حکومت کے رواج کی بنیاد پر یا اپنے اجتہاد سے زیاد نے فیصلہ کیا کہ ہاں پھر تمہیں محصول ادا کرنا پڑے گا۔

عیسائی سوداگر اور زیاد میں بات بڑھی، اس نے سامان کو اپنے آدمیوں کے سپرد کر کے زیاد سے کہا میں خود امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس جاتا ہوں، اس زمانے میں حضرت عمر مکہ آئے ہوئے تھے۔ عیسائی سوداگر مکہ پہنچا، حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہتے ہوئے کہ میں ایک عیسائی سوداگر ہوں۔ اپنا قصہ اس نے سنایا، حضرت عمر نے اس کی روداد سن کر صرف ایک عربی لفظ یعنی ''کَفَیت'' فرمایا، جس کا مطلب یہی تھا کہ تیرا کام پورا کر دیا جائے گا۔ لیکن عیسائی سوداگر اس مختصر لفظ سے مطمئن نہ ہوا، خود اسی کا بیان ہے کہ میں مکہ سے مایوس واپس لوٹ رہا تھا، دل میں طے کر چکا تھا کہ زیاد کے مطالبہ کی تکمیل کر دوں گا، مگر وہی کہتا ہے کہ جب میں فرات کی اس چوکی پر پہنچا، تو اس خبر نے مجھے حیرت میں ڈال دیا:

"کتاب عمر قد سبق الیه "(۸۲)

''زیاد بن حدیر (امین چوکی) کے پاس حضرت عمرؓ کا فرمان اس کے پہنچنے سے پہلے وصول ہو چکا تھا۔''

اس فرمان میں حضرت عمرؓ نے زیاد کو حکم دیا تھا کہ جب ایک دفعہ اس کے تجارتی مال سے محصول وصول کر چکے تو دوبارہ پھر اسی مال سے وصولی کا حق تم کو نہیں ہے، عیسائی سوداگر کا بیان ہے اس خبر نے مجھے بے چین کر دیا اور اسی وقت زیاد کو خطاب کر کے اس نے اعلان کیا۔

"انی اشهد اللّٰه انی بری من النصرانية و انی علی دين الرجل الذی کتب اليک هذا الکتاب(ز)". (۸۳)

''میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ عیسائی مذہب سے میں کنارہ کش ہوتا ہوں اور اب اس شخص کے دین پر ہوں جس نے تمہارے نام یہ مراسلہ بھیجا ہے''

ایک معمولی عیسائی سوداگر کی چنگی کے محصول کے ساتھ اس عہد میں روئے زمین کی جو سب سے بڑی حکمران طاقت تھی، یعنی حضرت عمرؓ کا متوجہ ہونا ور مالی نقصان سے اس بڈھے عیسائی کو بچا لینے کیے لیے اتنی مستعدی کہ شاہی فرمان اس کے پہنچنے سے پہلے امین کر درگیری کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا، درحقیقت یہ واقعہ اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے تھا ہی اتنا دل دوز کہ جو نتیجہ اس کا ہوا اس کے سوا کسی دوسرے نتیجہ کی بھلا ایسی صورت میں توقع ہی کیا ہو سکتی ہے؟ خصوصاً اس زمانہ میں تاجروں کے ساتھ یہ معاملہ جو زیاد نے اختیار کرنا چاہا تھا، حکومتوں کا عام دستور تھا۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ بولنے کی حد تک تو حضرت عمرؓ کی زبان مبارک سے صرف ''کفیت'' کا ایک ہی لفظ نکلا، لیکن قول جس کا اتنا مختصر تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے فعل اور عمل کی وسعت دامانیوں کو کہ عرب سے عراق تک یا مکہ سے ساحلِ فرات تک زلزلہ برپا ہو گیا۔ اور یہی حکومت کا مطلب اور اس کا صحیح نصب العین ہے، کہ اکثریت ہو یا اقلیت، دین و مذہب، مسلک و مشرب کسی کا کچھ بھی ہو لیکن حکومت کے دائرہ حفاظت میں جو آ چکے ہوں ان کو مطمئن کر دیا جائے کہ

Marfat.com

ان کا ہر حق خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی، اجتماعی ہو یا انفرادی بالکلیہ محفوظ ہے۔ یہ اس دجالی عہد کا نیا نظریہ ہے کہ حکومت صرف ان لوگوں کے حقوق کی ذمہ دار ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ ملک میں ان ہی کو عددی برتری حاصل ہے۔ جس جماعت کے افراد کی تعداد پچاس ہے، ان کی قطعاً پرواہ اس جماعت کے مقابلہ میں نہیں کی جائے گی جس نے گنوانے کے وقت مردم شماری کے کارندوں سے یہ لکھوا لینے میں کامیابی حاصل کی ہو کہ بجائے پچاس کے اکیاون منڈیوں پر یہ جماعت مشتمل ہے۔ ممکن ہے کہ کہنے کی حد تک یہ نہ کہا جاتا ہو، لیکن یقیناً یہی کیا جا رہا ہے اور اسی کا قرون وسطی کی ظالمانہ حکومتوں کے مقابلہ میں جمہوری حکومت نام رکھ دیا گیا ہے۔ کانوں کو یہ سنا سنا کر بہرہ بنا دیا گیا ہے کہ انسانی حقوق کی کلی ضمانت کا جو راز حکومت کے اس جدید انوکھے طرز سے بنی آدم پر منکشف ہوا ہے، اس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، مالکم کیف تحکمون۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض کر رہا تھا کہ اسلامی حکمرانوں نے قول سے زیادہ اسلام کی اشاعت میں اپنے عمل سے کام لیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ عمل کے کمانوں سے نکل نکل کر جو تیر قلوب میں اثر کر رہے تھے، کیا ان سیدھے تیروں کے نشانوں کو کوئی خطا کر سکتا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں ذرا غور تو کیجیے، حمص میں وہ صورت جو پیش آئی، یعنی ہرقل اپنی آخری فوجی قوت کو فراہم کر کے شام کو مسلمانوں سے چھیننے کے لیے جب یلغار کرتا ہوا مسلمانوں کی فوج کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، تو مسلمانوں نے یہ محسوس کر کے کہ ہرقل کے اس فوجی حملہ کی مدافعت میں ہم لوگ جس وقت مشغول ہوں گے، حمص کے شہر اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری جیسی کہ چاہیے ہم سے ممکن نہ ہو سکے گی، مشہور واقعہ ہے کہ حمص کے غیر مسلم باشندوں نے ان کی حفاظت کے مصارف کے لیے خراج کی رقم جو وصول ہو چکی تھی، یہ کہتے

Marfat.com

ہوئے پوری رقم واپس کردی گئی کہ:

"قد شغلنا عن نصرتکم و الدفع عنکم "(۸۴)

''تم لوگوں کی امداد اور تمہاری طرف سے مدافعت کا موقع ہمارے لیے باقی نہ رہا''۔

مؤرخین نے اس واقعہ کو نقل کر کے اگر یہ لکھا ہے کہ حمص کے یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے اس عجیب وغریب طرز عمل کو دیکھ کر کہنے لگے کہ:

''آپ لوگوں کی حکومت، آپ کا عدل وانصاف ہمیں رومی حکومت کے ظلم وستم سے زیادہ محبوب ہے، آپ کے عامل (حاکم شہر حمص) کے ساتھ مل کر ہم رومیوں کا مقابلہ کریں گے''۔(۸۵)

یہ تو عیسائیوں نے کہا، حالانکہ رومی حکومت خود عیسائی حکومت تھی، اسی طرح حمص کے یہودیوں نے جمع ہو کر اعلان کیا کہ:

''قسم ہے تورات کی کہ شہر میں ہرقل کا والی اور نمائندہ اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم لڑ کر مغلوب اور درماندہ نہ ہو جائیں''(۸۶)

مسلمانوں کے ساتھ جو وعدہ عیسائیوں اور یہودیوں نے اس واقعہ کے بعد کیا تھا، وہ پورا کیا گیا، اور یرموک ندی کے ساحل پر ہرقل کی فوج کو آخری تاریخی شکست جب نصیب ہوئی، تو لکھا ہے کہ:

''شام کے شہروں اور قصبوں کے یہودی اور نصرانی ڈھول بجاتے ہوئے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کے آگے کھیلتے کودتے اپنے اپنے شہروں میں ان کو خود لے گئے''۔(۸۷)

یہی یرموک کی فوج جسے ہرقل نے عیسائیوں کے مرتد بادشاہ جبلہ بن ایہم کی سرکردگی میں اس لیے روانہ کیا تھا کہ عرب کے ان قبائل کی امداد بھی اس تدبیر

Marfat.com

سے میسر آ سکتی ہے، جو رومیوں کی اس باجگذار عربی حکومت یعنی غسانیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ جبلہ کی وجہ سے یرموک کی اس جنگ کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی، لیکن کون نہیں جانتا کہ جبلہ جیسی مادی قوت کی امداد سے حضرت عمرؓ اس لیے دست بردار ہو گئے تھے کہ اتفاقاً جبلہ کے دوشالے کے کسی گوشہ پر ایک غریب بدو کا پاؤں اس وقت پڑ گیا تھا، جب جبلہ مسلمان ہو کر کعبہ کے طواف میں مشغول تھا، بادشاہی کے جاہلی خیال نے جبلہ کو بے اختیار کر دیا اور غریب بدو کے منہ پر اس زور سے اس نے تھپڑ رسید کیا کہ اس کی ایک آنکھ بہ گئی، اس کی خبر حضرت عمرؓ کو ہوئی، جبلہ کی طلبی کے بعد آپ نے فرمایا کہ بدو کی آنکھ کے بدلہ میں تمہاری آنکھ پھوڑی جائے گی۔ سننے کے ساتھ غسانی حکومت کے فرمانروا جبلہ کے ہوش اڑ گئے، کہنے لگا: "اوعینه مثل عینی "(۸۸)

''کیا اس بدو کی آنکھ میری آنکھ کے برابر ہے''۔

اس نے جواب کے لیے مہلت طلب کی اور اسی حیلہ سے شباشب اسلامی علاقہ سے بھاگ کر رومیوں کے علاقہ میں پہنچ گیا اور اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی دین اس نے قبول کر لیا، کہتے ہیں کہ جبلہ کے ساتھ عربی قبائل کے تیس ہزار سپاہی جو اس کی فوج کے ملازم تھے، رومیوں میں جا کر مل گئے، لیکن ایک بدوی کی آنکھ کا انصافاً جو حق تھا، اس حق کی حفاظت میں سارے مادی نقصانات اسلامی حکومت نے برداشت کیے۔

اور بدو کی آنکھ تو پھر بھی آدمی کی آنکھ تھی، حضرت عمرو بن عاص صحابی جو مصر کے حاکم تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان سپاہی نے مصر کے کسی غیر مسلم باشندے کے بت کی آنکھ توڑ دی، عمرو بن العاص کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ بت کی آنکھ کے توڑنے والے سپاہی کی آنکھ تو بھی توڑ سکتا ہے۔

Marfat.com

قبطی کو عمرو بن العاصؓ کی طرف سے یہی فیصلہ سنایا گیا، وہ سناٹے میں آ گیا، مسلمان سپاہی نے اس قبطی سے کہا کہ میری آنکھ توڑ کر کیا کرے گا میں تیرے بت کی آنکھ کے معاوضہ میں جو رقم بھی منظور کرے پیش کرنے کے لیے تیار ہوں، آخر تاوان ہی پر راضی ہو گیا اور مسلمان سپاہی کی آنکھ بچ گئی۔(۸۹)

مصر جو ابتدائے اسلام میں تقریباً عیسائی ملک تھا، لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے عیسائی کیا ہوئے۔ کیونکہ بجز ایک اقلیت قلیلہ کے مصر کی ساری آبادی صدیوں سے مسلمان ہے۔

لیکن غور نہیں کرتے کہ اسی مصر میں جہاں آئے دن اسلامی حکومت کی طرف سے عدل و انصاف کی مذکورہ بالا مثالیں پیش ہو رہی تھیں، ساتویں صدی عیسوی کا عیسائی مؤرخ یحییٰ نکیو جو مصری عیسائیوں کا بطریق تھا اور مصر کی اس نے تاریخ بھی لکھی، اسی کا بیان ہے کہ:

''حضرت عمرو بن عاص نے گرجاؤں پر عیسائیوں کے قبضہ کو بحال رکھا، اور عیسائیوں کو دینی معاملات میں خود مختار بنا دیا، عمرو کی فوج نے کسی گرجے کے مال اور خزائن پر دست اندازی نہ کی اور نہ لوٹ و غارت گری سے کام لیا''۔(۹۰)

اسی کے مقابلہ میں اسی مصر کے کے ان ہی یعقوبی عیسائیوں یعنی قبطیوں پر قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ جسٹی نین نے محض اس قصور میں کہ رومی کلیسا کو مصر کے قبطی عیسائی تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ ظلم توڑا کہ آج بھی اس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دانس لی بن کی کتاب ''مصر کی موجودہ حالت'' میں یہ تاریخی شہادت درج ہے کہ:

''جسٹی نین (شاہ قسطنطنیہ) نے دو لاکھ قبطیوں کو اسکندریہ میں قتل کرایا اور اس کے جانشینوں نے اتنے مظالم ان عیسائیوں پر توڑے کہ اکثر قبطیوں نے

Marfat.com

صحرائے اعظم میں جا کر پناہ لی (ض)''۔(۹۱)

عیسائی حکومت کا خود عیسائیوں کے ساتھ تو یہ برتاؤ تھا، اسی کے مقابلہ میں مسلمان حکمرانوں کو انہوں نے جب دیکھا کہ پتھر کی مورتیوں کی آنکھوں کے بدلہ میں زندہ مسلمان کی آنکھ تک کے توڑنے پر آمادہ ہیں، تو اسلام کو ان کے قلوب میں گھسنے سے سوچنا چاہیے کہ اب کون سی طاقت روک سکتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کے اسی بطریق یحی نکیو کے حوالہ سے آرنلڈ نے نقل کیا ہے کہ:

''مسلمانوں کی فتح مصر ابھی مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی اسکندریہ ابھی مقابلہ پر تھا کہ اکثر قبطیوں نے اسلام قبول کر لیا''۔(۹۲)

عمرو بن عاص جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ سیاسی مصالح کا ان کے فیصلوں میں کافی اثر نمایاں تھا، جب ان کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ جن بزرگوں نے دینی مصالح کے مقابلہ میں سیاسی مصالح کی کبھی پروا نہ کی، ان کا برتاؤ اسلامی قلم رو کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ کیا ہو گا؟ مالگذاری وصول کرنے میں ایرانیوں اور رومیوں کے جو یہ طریقے تھے کہ لوگوں کو باندھ کر دھوپ میں لٹا دیا جاتا اور ان کے سر پر غالباً تیل بھی ڈالا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی نظر شام کے سفر میں وصول مالگذاری کے اس رومی طریقہ پر جس وقت پڑی تو اسی وقت آپ نے حکم دیا کہ:

''لوگوں کی برداشت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالا جائے اور نہ مالگذاری کے وصول کرنے میں دکھ پہنچایا جائے''۔(۹۳)

اسی طرح جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو ایک صاحب جن کو آپ نے ایرانی علاقے کے کسی مقام کی طرف جس کا نام ''بندج سابورا'' (ظ) تھا مالگذاری کی تحصیل وصول کے لیے روانہ کرنا چاہا، جب

Marfat.com

وہ چلنے لگے تو حضرت علی المرتضیٰؓ نے ان کو وصیت شروع کی:

''دیکھو ایک درم کے وصول کرنے میں بھی کسی کو تازیانے کی سزا نہ دینا اور نہ ان روزمرہ کی خوراک کے ذخیرے کو نیلام کرنا، اسی طرح گرما اور سرما کے لباس کو بھی ان کے ہاتھ نہ لگانا اور جن مویشیوں سے وہ کاشتکاری میں کام لیتے ہیں ان کو بھی فروخت نہ کرنا اور نہ تحصیل و وصول کے وقت کسی کو کھڑے رہنے پر مجبور کرنا''۔(۹۴)

حضرت علیؓ کی ان ناصحانہ وصیتوں کو سن کر تحصیل دار نے کہا کہ:

''امیر المومنین پھر تو جناب کی خدمت سے جس حال میں جا رہا ہوں اسی حال میں مجھے واپس ہونا پڑے گا''۔(۹۵)

حضرت علی نے تحصیل دار کی بات سن کر فرمایا:

''ہاں! جیسے گئے تھے، اسی حال میں واپس ہی کیوں نہ آنا پڑے''۔(۹۶)

اس کے بعد اسی کو خطاب کر آپ فرمانے لگے:

''تجھ پر افسوس ہے (دیکھ) ہمیں ان سے صرف العفو یعنی فضل (ضرورت سے جو بچ گیا ہو) اسی سے لینے کا حکم دیا گیا ہے''۔(۹۷)

اور ان بزرگوں کے متعلق تو خیر اس قسم کی باتیں چنداں تعجب انگیز نہیں ہیں، مگر ان ہی کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کے حال میں بھی ہم جب یہ پڑھتے ہیں کہ رومیوں اور حضرت معاویہؓ کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ سالانہ اتنی رقم ادا کریں گے، رومیوں نے اطمینان کے لیے اپنے یہاں کی چند ممتاز ہستیوں کو امیر معاویہؓ کے پاس بطور یرغمال کے رکھوایا دیا تھا، کہ اگر مقررہ رقم رومی حکومت نہ ادا کرے، تو آپ ان لوگوں کو قتل کر سکتے ہیں، البلاذری نے نقل کیا ہے کہ کچھ دن بعد رومیوں نے عہد شکنی کی، معاہدے کی رو سے امیر معاویہؓ کو حق تھا کہ یرغمال ہونے والے رومیوں

کو قتل کر دیں، مگر مسلمانوں سے مشورہ کرنے کے بعد امیر معاویہؓ نے یہی طے کیا کہ:

''ان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ چھوڑ دیا جائے''۔(۹۸)

یہی کیا گیا، مسلمانوں نے یہ کہتے ہوئے کہ:

"وفاء بغدر خیر من غدر بغدر" (۹۹)

''عہد شکنی کے جواب میں عہد شکنی سے یہ بہتر ہے کہ ہم عہد توڑنے والوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کریں''۔

یرغمال بنائے جانے والے ان رومیوں کو جو بطبک میں رکھے گئے تھے، رہا کر دیا۔

بہر حال مخلوقات کی پرستش اور پوجا پاٹ جن عبادتگاہوں میں ہوتی ہے، ان کو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جدّ مجدہ' ہی کی عبادت کے لیے مختص کرانے کے نصب العین میں کامیابی کی صحیح تدبیر یہ قطعاً نہیں ہے کہ جن عبادت گاہوں میں مخلوقات کی عبادت کی جاتی ہے، ان کو ڈھا دیا جائے، گرا دیا جائے (غ)، جلا دیا جائے۔ انسانی نفسیات کی خصوصیتوں سے تھوڑی بہت بھی واقفیت جو رکھتے ہیں، وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے اعمال سے انتقام اور غصہ کے جذبات میں آدمی ڈوب کر تہ و بالا ہونے لگتا ہے۔ ان ہی اشتعالی جذبات کے تلاطم اور ہنگاموں میں حقیقت نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس مصر میں آج ازہر اور مسجد ابن طولون وغیرہ کی سپر نما عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں، یہ وہی ملک ہے جس کے ان گرجوں کو مسلمانوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، جن میں (العیاذ باللہ) خدا کے بیٹے اور خدا کے بیٹے کی ماں کی پوجا ہوتی تھی۔

دمشق کی مشہور تاریخی مسجد جامع بنی امیہ جو آج بھی اپنی پوری شان و شوکت، عظمت و اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔ عام تاریخوں میں کس نے نہیں پڑھا

Marfat.com

ہے کہ مروانیوں کے مطلق العنان فرمانروا عبدالملک نے اس مسجد کے لیے عیسائیوں کے گرجا یوحنا نامی کے متعلق عیسائیوں سے خواہش ظاہر کی کہ جتنی رقم بھی طلب کرو میں ادا کردوں گا۔ مجھے اجازت دو کہ اس گرجا کی زمین کو میں مسجد میں شریک کردوں، لیکن عیسائی راضی نہ ہوئے۔ عبدالملک بھی خاموش ہوگیا۔ پھر جب ولید بن عبدالملک نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اسی خواہش کو عیسائیوں کے سامنے پیش کیا، اور بہت زیادہ غیر معمولی معاوضہ ادا کرنے پر آمادہ ہوا، مگر عیسائیوں نے حسب دستور جب انکار کیا، تو ولید کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا کہ تم لوگ گویا اس پر مجبور کر رہے ہو کہ زبردستی میں اس گرجے کو منہدم کرادوں، البلاذری نے لکھا کہ کہ ولید کی دھمکی پر عیسائیوں نے کہا کہ:

''ان من هدم كنيسة جن او اصابته عاهة''

''گرجے کو جو ڈھاتا ہے اس کو جنون ہو جاتا ہے یا کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے''۔(۱۰۰)

عیسائیوں کی اسی دھمکی نے ولید کی دھمکی کو جو صرف لفظی دھمکی تھی، خواہ مخواہ واقعہ کی شکل دے دی۔

لکھا ہے کہ خود اپنے ہاتھ میں پھاوڑا لے کر گرجا کی دیوار پر ولید چلانے لگا اور یوں یوحنا کا گرجا منہدم ہوگیا اور اس کی زمین مسجد میں شریک کردی گئی۔

اب اس کو عیسائیوں کی غلط دھمکی کا نتیجہ قرار دیجیے، یا ولید کے راج ہٹ کا نتیجہ سمجھیے۔ یہ فعل اسلامی ضوابط کے لحاظ سے قطعاً غلط تھا۔ کچھ ہی دن بعد عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ میں مروانی حکومت کی باگ جب آئی تو آپ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کی اس مسجد میں گرجے کی جو زمین شریک ہوگئی ہے وہ عیسائیوں کو واپس دے دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے لاکھوں لاکھ روپیہ کا مالی نقصان ہی نہیں ہو رہا

تھا، بلکہ دنیا کی تعمیری عجائبات میں جو عمارت اس وقت تک شمار ہوتی ہے اس کی صورت بھی بگڑ جاتی، ماسوا اس کے عام مسلمانوں کے لیے یہ خیال بھی سخت تکلیف دہ تھا کہ:

"تهدم مسجد نا اذنا فيه و صلينا و نرد بيعة "(۱۰۱)

''کیا اپنی ایک ایسی مسجد کو ہم اپنے ہاتھوں ڈھا دیں جس میں ہم اذان دیتے رہے اور نمازیں پڑھتے رہے اور اس کو گرجا بنا دیں''۔

مگر مسلمانوں کے دینی جذبات کی عمر بن عبدالعزیز کی دینی عقل نے قطعاً پرواہ نہ کی اور گرجے کی زمین کی واپسی پر ان کا اصرار بہرحال باقی رہا۔ کوئی دوسری صورت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا باقی نہ رہی کہ باوجود حاکم قوم ہونے کے اپنے محکوم عیسائیوں کی خوشامد درآمد کریں۔ یہی تدبیر آخر اختیار کی گئی، وقت کے علمائے اسلام جن کی قیادت سلیمان بن حبیب المحاربی نے کی، عیسائیوں کے پاس پہنچے اور منت وسماجت سے کسی نہ کسی طرح عیسائیوں کو راضی کر لیا گیا کہ اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں۔ عیسائیوں کا راضی نامہ جب پیش ہوا تو:

"فسر بذلک و امضاه "(۱۰۲)

''وہ اس پر خوش ہوئے اور راضی نامہ کے مطابق فرمان جاری کیا''۔

اور یہ تو خیر ایک گرجا یا ایک مکان کا قصہ ہے، ذرا خیال تو کیجیے سمرقند جیسے غدار شہر کا، مسلمانوں کا مشہور سپہ سالار قتیبہ اس کو فتح کر چکا ہے، خراسان کے اس مشہور مرکزی شہر میں مسلمان آباد ہو چکے ہیں، مسجدوں اور مدرسوں (الف، الف) سے شہر معمور ہو چکا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کا زمانہ ہے، سمرقند کے غیر مسلم طبقہ کا ایک وفد خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ معروضہ پیش کرتا ہے کہ:

''غدر اور عہد شکنی سے کام لے کر قتیبہ نے ہمارے شہر پر قبضہ کیا اور

Marfat.com

مسلمانوں کو اس شہر میں اس نے آباد کیا ہے''۔(۱۰۳)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وفد کے اس معروضہ کو حاکم سمرقند کے پاس اس فرمان کے ساتھ واپس کیا کہ:

''عدالت کے کسی قاضی کے سپرد سمرقند کا معاملہ کر دیا جائے اور حکم دیا جائے کہ واقعی ان لوگوں کے ساتھ کیا صورت پیش آئی ہے، تحقیقات سے اگر ثابت ہو جائے کہ وفد والوں کا دعویٰ صحیح ہے تو اسی وقت مسلمانوں کو سمرقند چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے''۔(۱۰۴)

اس فرمان کے ساتھ وفد حاکم سمرقند کے پاس واپس لوٹا، جمیع بن حاضر نامی قاضی کو بلا کر مقدمہ حاکم نے ان کے سپرد کر دیا۔

قاضی جمیع نے بھی ہر قسم کی جنبہ داری سے الگ ہو کر مقدمہ کی چھان بین شروع کی، شہادتوں اور دوسرے دلائل کی روشنی میں وہ اسی نتیجہ تک پہنچے کہ واقعتاً سمرقند والوں کے ساتھ غدر کیا گیا ہے، اسی بنیاد پر انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ:

''مسلمان سمرقند کو چھوڑ کر فوراً باہر نکل جائیں اور اس کے بعد سمرقند والوں کو آزادی دی جائے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو معاملہ چاہیں اختیار کریں، اسی طرح شہر سے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کو بھی اختیار ہوگا، جو طرز عمل چاہیں اختیار کریں''۔(۱۰۵)

الغرض شہر سے نکلنے کے بعد ''منابذہ علی السواء'' کے اصول پر قاضی نے فیصلہ کیا کہ عمل کیا جائے۔

سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کے سامنے یہ فیصلہ جب پیش ہوا تو انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ نکل جانے کے بعد مسلمانوں نے پھر شہر پر اگر حملہ کیا تو خواہ مخواہ جنگ کے شعلوں میں ہم گھر جائیں گے، لکھا ہے کہ مشورے کے بعد حاکم کے سامنے

Marfat.com

ان لوگوں نے حاضر ہوکر اپنا باز دعوی ان الفاظ میں پیش کیا کہ:

''ہم جنگ کرنا نہیں چاہتے اور خوشی کے ساتھ سمرقند میں مسلمانوں کے قیام پر راضی ہیں''۔(۱۰۶)

اور یوں بات ٹل گئی ورنہ دنیا دیکھتی کہ سمرقند جیسے شہر میں آباد ہو جانے اور مساجد و مصلّی، مدارس و مکاتب کے قائم کر دینے کے بعد بھی معاہدے کی تکمیل کے لیے مسلمان محض اپنے دین کی وجہ سے باہر نکل آئے اور اس قسم کے قصے کچھ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلفاء کی حد تک محدود نہیں ہیں، اسی سمرقند ہی کے متعلق تاریخوں میں واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے زمانہ میں امام اور مؤذن کو خلیفہ کے حکم سے اس لیے درے لگائے گئے کہ اسی سمرقند کے کسی آتش کدہ کو توڑ کر دونوں نے مسجد بنا دیا تھا (ب، ب)۔(۱۰۷)

ممکن ہے کہ اب سمرقند میں ایسی کوئی عبادت گاہ نہ ملے جس میں بجائے خالق کے آگ جیسی مخلوق کی عبادت آدم کی اولاد کرتی ہو، لیکن اس علاقے بلکہ سارے ایرانی علاقے کی عبادت گاہوں کے تعلقات میں یہ تبدیلی یعنی مخلوق سے ان کا رشتہ توڑ کر خالق ہی کی عبادت کے لیے اب جو وہ مختص نظر آ رہی ہیں، کیا اس انقلاب میں جبر اور زبردستی سے کام لیا گیا ہے؟۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ایرانی علاقے کی عبادت گاہوں کے اس انقلاب کو نہ جاننے والوں نے ابتدائے اسلام کے پرجوش مجاہدین کے تشدد اور زبردستی کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ سمجھا دیا گیا کہ قبضہ کرنے کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ کاروائی کی گئی، باور کرایا جاتا ہے کہ ایران اسی زمانہ میں غیر مسلموں سے خالی ہو گیا تھا۔

لیکن نہ جاننے والوں یا جان کر انجان بننے والوں کی ان باتوں کو میں کیسے مان لوں، جب مشاہدہ کرنے والوں کی کتابوں میں ان کے ان مشاہدات کو پڑھتا

Marfat.com

ہوں ۔ابن حوقل جس کے متعلق بی لی، اسٹرینج کا تخمینہ یہ ہے کہ سنہ عیسوی کے حساب سے اس نے اپنی کتاب ۹۷۸ یعنی دسوی صدی عیسوی میں لکھی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ ظہور اسلام سے چار سو سال بعد جیسا کہ اس کا خود بیان ہے، اسلامی ممالک میں گھوم گھوم کر خود اپنے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں ۔ بہر حال اسی جغرافیائی سفر نامے میں ابن حوقل ایران کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے، ترجمہ کے ساتھ میں بجنسہ اس کے عربی الفاظ کو نقل کر دیتا ہوں، جو یہ ہیں:

"و اما بیوت نیرانها فانها لا تخلوا ناحیة و لا مدینة بفارس الا القلیل من بیوت النیران و المجوس اکثر الملل بها" (۱۰۸)

"باقی ایران کے آتشکدے سو حال یہ ہے کہ بجز ایران کے چند مقامات کے کوئی علاقہ اور کوئی شہر ان آتشکدوں سے خالی نہیں ہے اور ایران میں دوسرے ادیان و مذاہب والوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعداد مجوسیوں یعنی آتش پرست پارسیوں ہی کی ہے"۔

یہ سنی سنائی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے، دوسرا سیاح مسعودی ہے۔ فتح ایران کے تین سو سال بعد اس نے ایران کی سیر کی ہے، اس کی بھی شہادت یہی ہے کہ:

"عراق، فارس، کرمان سجستان، خراسان، آذربائیجان اور آران یعنی ایران کے تمام حصوں میں آتشکدے اور دوخے بنے ہوئے اس نے پائے"۔ (۱۰۹)

آرنلڈ نے نکولائے خانکوف کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

"اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بارہ ہزار خاندان آتش پرستوں کے کرمان میں موجود تھے"۔ (۱۱۰)

جب دسویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک کی یہ گواہیاں

ہمارے پاس موجود نہیں تو بتایا جائے کہ محض دعویٰ کرنے والوں کے صرف دعویٰ کی بنیاد پر میں یہ کیسے تسلیم کروں کہ آگ جیسی مخلوق کی جگہ آج ایران کی ہر عبادت گاہ میں صرف خالق کردگار کی عبادت کا نظارہ جو دیکھا جا رہا ہے، اس انقلاب میں زور اور زبردستی سے کام لیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی تک میں ایران کی اکثریت پارسیوں ہی کی تھی۔ تو جبر ظلم و زیادتی کا یہ افسانہ افسانہ کے سوا اور بھی کچھ رہ جاتا ہے؟ بلکہ واقعہ کی صحیح تصویر وہی ہے کہ آتشکدوں کو ڈھا کر نہیں بلکہ ڈھانے والوں کو ورثے کی سزا دے دے کر ایران کی عبادت گاہوں کے تعلق کے بدلنے میں مسلمانوں نے کامیابی حاصل کی۔

اس قسم کی باتیں مثلاً یہی کہ معتصم نے آتشکدے کے ڈھانے کے جرم میں مؤذن اور امام کی کوڑے سے خبر لی۔ لوگ جب ان کو سنتے ہیں دل میں ان کے خیال گذرتا ہے کہ اسلامی حمیت و غیرت کا جوش جن اسلامی حکمرانوں میں شاید ٹھنڈا پڑ گیا تھا، یہ باتیں ان کے زمانہ کی ہیں۔ بلکہ اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم طبقات کے درخور اور بڑے بڑے منصب تک ان کی رسائی کے قصوں سے تاریخیں جو معمور ہیں تو ان سارے قصوں میں سمجھا جاتا ہے کہ دخل اسلام اور اسلام کے قوانین و تعلیمات کو نہ تھا (ج ج) بلکہ جیسے جیسے اسلامی امور سے لاپروائی حکمرانوں میں بڑھتی چلی گئی، غیر قوموں کے ساتھ رواداری میں زیادہ فراخ چشمی سے وہ کام کرنے لگے۔

اور اسی غلط مفروضے کو بنیاد بنا کر ہر اسلامی ملک کی تاریخ خصوصاً ہندوستان کی کچھ اس طریقہ سے مرتب کی گئی ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی زندگی سے جو زیادہ قریب تھے، ان بادشاہوں نے دینی تعصب کی وجہ سے غیر قوموں پر ہر قسم کے ظلم و ستم کو روا رکھا اور طرح طرح سے ان کو پریشان کیا۔ البتہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا وزن علما یا عملاً جن کے قلوب میں باقی نہ رہا تھا، یا کم ہو

Marfat.com

گیا تھا اگر غیر مسلموں کے ساتھ کچھ رواداریاں ہوتی ہیں تو ان ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔ مگر کہنے والوں کی زبانوں اور کہنے والوں کے قلم کو کون روک سکتا ہے۔

ابھی ابھی معتصم عباسی نہیں، بلکہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز خلیفہ کی حکومت کے زمانہ کے چند واقعات کا ذکر میں نے ہی آپ کے سامنے کیا ہے، آپ سن چکے کہ جس مسجد میں مسلمان اذانیں دے رہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے، اس مسجد تک کو گرجا بنانے پر عمرؒ بن عبدالعزیز کی بے دینی نہیں، بلکہ دین داری مجبور کر رہی تھی، بلکہ پورے شہر سمرقند اور اس کی مسجدوں، مدرسوں تک کے چھوڑنے کا حکم مسلمانوں کو ان ہی عمرؒ بن عبدالعزیز کی بے دینی نے نہیں بلکہ دین ہی نے دلایا تھا۔ میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلامی دین کے احترام کرنے والے سلاطین اور سختی کے ساتھ اس کے ایک ایک جزئیہ پر اصرار کرنے والے حکمرانوں میں عمرؒ بن عبدالعزیز کے سامنے بجز خلفائے راشدین کے کیا کوئی ٹھہر سکتا ہے؟ پھر غیر مسلم اقوام کے ساتھ رواداریوں کی یہ توجیہ کتنی غلط ہے کہ اسلام سے بعد اور دوری نے ان کو پیدا کیا تھا؟ میں نے پہلے یہی کہا ہے کہ تیرہ صدیوں کے اس طویل زمانے میں دنیا کے مختلف حصوں کے اندر حکومت کرنے والے مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کی تعداد ہزار ہا ہزار سے متجاوز ہے، کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہمارے سارے سلاطینِ سلف معصوم اور غلطیوں سے پاک تھے، ہمارا نہ عقیدہ ہے اور نہ یہ واقعہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ بادشاہوں کو قانون کی گرفت سے یہی وجہ تو ہے کہ اسلام نے کبھی مستثنیٰ نہیں قرار دیا۔ یقیناً اچھوں کے ساتھ ان میں بڑی تعداد ایسوں کی بھی تھی جنہوں نے غیر مسلموں ہی کو کیا، خود مسلمانوں کو اپنے حرص و ہوا کا تختہ مشق بنانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن ان کی ستم رانیاں جو مسلمانوں پر ہوئیں ان کو جیسے اس دین کی طرف منسوب کرنا غلط ہے، جس کی طرف اپنے آپ کو وہ منسوب کرتے تھے۔ اسی طرح غیر مسلموں کے

Marfat.com

ساتھ جو زیادتیاں ان کی طرف سے ہوئی ہیں، یقیناً بہت بڑا ظلم ہوگا اگر اس دین کا اثر یا نتیجہ ان کو قرار دیا جائے، جس کا پیرو اپنے آپ کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ تفصیل میں بات بہت پھیل جائے گی، لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں ہمیشہ ان اسلامی حکمرانوں سے نقصان ہی پہنچا ہے، جنہوں نے ان ذمہ داریوں کی طرف سے لاپروائی برتی، جن کا مطالبہ اسلامی حکومت سے اسلام اور پیغمبر اسلام اور ان کے سچے اور رشید جانشینوں نے بار بار کیا ہے، اور آخر وقت تک ان ذمہ داریوں کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے ہیں۔ اگر ان ذمہ داریوں کو وہ اسی طرح پوری کرتے، جیسے عمر بن عبدالعزیز اور ان جیسے دوسرے دین دار خلفاء اور سلاطین نے کی، تو اسلامی جغرافیہ کا دائرہ موجودہ دائرہ سے کہیں زیادہ وسیع ہوجاتا۔

یہی عمر بن عبدالعزیز ہیں جو مسجد کو گرجا بنانے پر ایک اسلامی شہر کو بخوشی و رضا غیر مسلموں کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ حالانکہ کل ڈھائی سال حکمرانی کا موقع ان کو ملا ہے۔ لیکن آپ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے، مشرق و مغرب میں اسلامی دین کے حلقے میں داخل ہونے والوں کی تعداد ان کے زمانہ میں جتنی زیادہ بڑھی ہے، خلفائے راشدین کے بعد میں تو نہیں جانتا کہ دین کی اشاعت عام میں یہ کامیابی کسی دوسرے مسلمان بادشاہ یا حکمران کے زمانہ میں حاصل ہوئی، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ:

"اسلم عامة البربر فی ولایته"(۱۱۱)

"ان کی حکمرانی ہی کے زمانہ میں افریقہ کے عام بربری قوموں نے اسلام قبول کیا"۔

اشارہ اسماعیل بن عبیداللہ کی حکومت کی طرف ہے جنہیں، حضرت عمر بن

Marfat.com

عبدالعزیز نے افریقہ کا حاکم و گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ اسی طرح عمر بن عبدالعزیز کے حالات میں مشرق مثلاً خراسان، ایران، سندھ وغیرہ کے متعلق اس قسم کی چیزیں تاریخ کی کتابوں میں بکثرت ملتی چلی جائیں گی۔ مثلاً عمر بن عبدالعزیز کے خراسانی گورنر جراح بن عبدالحمید کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ:

"فاسلم علی یدہ نحوار بعة الآف"(۱۱۲)

''چار ہزار آدمی نے صرف جراح کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا''۔

سوال یہی ہے کہ مغرب و مشرق کے ان دور دراز علاقوں میں اسلام کی اشاعت اس وسیع پیمانہ پر عمر بن عبدالعزیز کی ڈھائی سال کی حکومت میں جو ہوئی، تو ایک آدھ واقعہ بھی تاریخ سے نکال کر دکھایا جا سکتا ہے، جس سے معلوم ہو کہ غیر مسلموں کا بال بھی اس سلسلہ میں کہیں غلطی سے کھینچا گیا؟ اب میں کیا کہوں، عمر بن عبدالعزیز جن کے اس گشتی فرمان کی نقل کتابوں میں آج تک نقل ہوتی چلی جا رہی ہے، ترجمہ جس کا یہ ہے، فرمان حکام اور سلطنت کے ولاۃ و گورنروں کے نام تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے عمر امیر المؤمنین کی طرف سے سلام علیکم!

''اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اس کی تعریف و ثنا کے بعد میں تم کو خصوصیت کے ساتھ حکومت کے ان غیر مسلم باشندوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں جن کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری کی گئی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور یہ کہ ان لوگوں میں جو سن رسیدہ اور ضعیف ہو جائیں اور غریب ہو کر ان کے مصارف کی پابجائی حکومت کی طرف سے کی جائے اور ان کے رشتہ داروں کو بھی ان کی کفالت کی طرف توجہ دلائی جائے''۔(۱۱۳)

گویا بیمہ وغیرہ کے جھگڑوں سے مسلمانوں کو اسلامی بیت المال کے نظام

Marfat.com

نے سبک دوش کر رکھا تھا، یہی اطمینان ملک کے ہر باشندے کو دلایا گیا تھا۔

صرف غرباء اور معذوروں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی بیت المال سے جیسے وظائف وغیرہ مسلمانوں کو عطا کیے جاتے تھے، ابن سعد ہی نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں کو بھی عمر بن عبدالعزیزؒ نے شریک کر لیا تھا، اسلامی سلاطین کے حالات میں لوگ جب پڑھتے ہیں کہ انعام واکرام کے سلسلہ میں فلاں غیر مسلم کو انہوں نے اتنی بڑی رقم دے دی تو خیال کر لیا جاتا کہ ان کے دینی رجحانات کی سستی کا یہ نتیجہ تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق یہی سوچنے والے کیا سوچیں گے جب ابن سعد سناتے ہیں کہ دس بیس روپے نہیں بلکہ:

"انه اعطی بطریقا الف دینار"(۱۱۴)

''ایک عیسائی پادری کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہزار اشرفیاں دیں''۔

ہزار طلائی سکہ کی قیمت نقرئی سکے سے کیا ہوئی؟ اس کی تفصیل کے لیے سکوں کی تاریخ پڑھیے۔ یہ کوئی انفرادی معاملہ نہ تھا، عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے مدینہ منورہ کے دفتر کا جو دیوان تھا، نام ان کا عیسی بن ابی عطا ہے، ابن سعد نے ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

''بسا اوقات وہ بیت المال سے (غیر مسلم) لوگوں کی امداد کرتے تھے''۔(۱۱۵)

اور سچ تو یہی ہے کہ ان سے پہلے بنی امیہ کے حکمرانوں نے جس کسی سے خلاف قانون ایک پیسہ بھی وصول کیا تھا، باتفاق مورخین عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں حساب کر کے ہر ایک تک اس کے حق کو پہنچایا، حتی کہ:

''عراق کا خزانہ جب بازگشت کی رقوم کے بندوبست کرنے سے معذور ہو گیا، تو مرکز (شام) کے خزانہ سے مزید رقم بھجوائی گئی''(۱۱۶)

ایسی صورت میں ان کی طرف سے کسی تشدد یا سختی کا احتمال ہی کیا ہے۔

Marfat.com

مشہور ہے کہ دیر سمعان جہاں مرض الموت میں عمر بن عبدالعزیزؒ مبتلا ہوئے اور یقین ہو گیا کہ اس مرض سے جان بر نہ ہو سکیں گے، تو اسی صحرائی میدان میں قبر کے لیے چاہا کہ زمین خرید لی جائے، معلوم ہوا کہ اس نواح کی ساری آراضی غیر مسلموں کی ہے، اپ نے ان ہی میں سے ایک شخص کو طلب کر کے کہا کہ میری قبر کے لیے تھوڑی سی زمین کیا تم فروخت کر سکتے ہو؟ بے چارے نے کہا کہ:

''امیر المومنین اس سے بڑی خوش نصیبی میری کیا ہوگی کہ آپ میری زمین میں دفن ہوں، میں خوش دلی سے اس زمین کو بغیر قیمت پیش کرتا ہوں''۔(۱۱۷)

مگر عمر بن عبدالعزیزؒ مفت لینے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے بعض کہتے کہ دو اور بعضوں کا بیان ہے کہ دس اشرفیاں دے کر خلیفہ نے اپنی قبر کے لیے زمین اس غیر مسلم سے خریدی۔(۱۱۸) ان ہی کے حالات میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے علاقے سے مدن کے قریب کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے غیر اسلامی علاقے کے لوگ لے گئے اور کہلا بھیجا کہ زر فدیہ کے بغیر ان قیدیوں کو ہم رہا نہیں کر سکتے، عمر بن عبدالعزیز نے اسی وقت روپیہ روانہ کیا، چالان میں لکھا ہوا تھا کہ:

''اس رقم سے مرد و عورت، غلام اور اسلامی علاقے کے ان غیر مسلم باشندوں کا زر فدیہ ادا کیا جائے جس کی ذمہ دار ہماری حکومت ہے''۔(۱۱۹)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دشمنوں سے چھڑانے اور رہائی دلانے تک میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق جائز نہیں رکھی جاتی تھی۔

یہ اور حسن سلوک و مراعات کے دوسرے طریقے ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف سے جو اختیار کیے گئے تھے، کیا ان کی کٹر دینی زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کو اس میں دخل تھا اور جس دین کی طرف سے اور دین

Marfat.com

پر چلنے والوں کی طرف سے اس نوعیت کے تجربات انسانی فطرت کو ہوں گے کیا ان کے لازمی نتائج واثرات سے وہ بچ سکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق ابن سعد ہی نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"کتب ان تعمل الخانات بطریق خراسان"(۱۲۰)

"کہ انہوں نے یہ فرمان نافذ کیا کہ خراسان کے راستہ میں سرائیں بنوائی جائیں"۔

خود ان کے اس کام کا جو اثر خراسان کے غیر مسلم باشندوں پر مرتب ہوا تھا، اس کا اظہار ہرات کے دہقان (دیس مکھ) نے خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ کے دربار میں جن لفظوں میں کیا تھا، آج تک تاریخوں میں محفوظ ہے۔ دیس مکھ تحفے تحائف کے ساتھ گورنر کے دربار میں آیا تھا، اس کو تقریر کا موقع بھی گورنر کے دربار میں دیا گیا، اسی میں اس نے دوسرے امور کے ساتھ یہ بھی کہا تھا:

"میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کی کتخدائیت (حکمرانی) سے بہتر حکومت میں نے نہیں دیکھی، آپ نے اپنے اسٹاف اور حاشیہ اور اپنے خاندان کے لوگوں کو ایسے دباؤ میں رکھا ہے کہ کوئی بڑا کسی چھوٹے پر، یا کوئی امیر کسی غریب پر ظلم وزیادتی نہیں کرسکتا (د،د)، میں تو کتخدایت (حکمرانی) کا اسی کو کمال سمجھتا ہوں، اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بیابان اور صحرائی راستوں میں جو ایوانات (یعنی مکانات) آپ کی حکومت کی طرف سے بنوائے گئے ہیں اور مشرق سے جو لوگ مغرب جاتے ہیں، یا مغرب والے مشرق کی طرف سے جب آتے ہیں تو ان ایوانات کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ بنانے والے نے کتنے اچھے مکانات (راستہ) میں یہ بنوادیئے ہیں"۔(۱۲۱)

تاریخ کی ان شہادتوں کو پڑھنے کی بعد اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایام حکومت میں لوگ دین اللہ یعنی اسلامی دائرے میں

Marfat.com

بکثرت کیوں داخل ہوئے۔

بد اندیشیوں کی برکندہ بادآنکھیں ان اجڑے ہوئے مکانوں اور جلائی ہوئی بستیوں، ڈھائے ہوئے کل سراؤں میں اشاعت اسلام کے اسباب کو تلاش کرتی ہیں جن کا وجود ان ہی غلط سوچنے والوں کے دماغوں کے سوا نہ پہلے دیکھا گیا اور نہ بعد کو ان کا سراغ خدا کی زمین پر ملتا ہے، لیکن یہ تو غلط مفروضات سے نکالے ہوئے غلط نتائج ہیں۔

لیکن حقائق و واقعات کی ایسی گواہیاں جنہیں دوست ہی نہیں دشمن بھی جھٹلا نہیں سکتے، ان کو سن سن کر بتایئے کہ آدمی کس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، یہی اسد بن عبداللہ کی کتخدائیت کا اعتراف ہرات کے دیس مکھ (دہقان) نے مذکورہ بالا الفاظ میں کیا تھا، وہ کوئی بناوٹی اور خوشامد کی بات تھی؟ اب میں کیا عرض کروں، ہرات کے دہقان نے تو صرف مسلمانوں کی حکومت کی تعریف کی تھی لیکن کچھ زیادہ دن گذرنے نہ پائے تھے کہ اسی اسد کے دربار میں ہم خراسان کے صوبہ بلخ کے اس امیرزادے کو پاتے ہیں، جس کا نام سامان تھا، کہ کھڑا ہوا ہے اور اسد کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر رہا ہے، یہی سامان تھا جس کی طرف منسوب ہو کر غزنویوں سے پہلے سامانیوں کی اسلامی حکومت خراسان میں صدیوں بڑے جاہ جلال کے ساتھ قائم رہی، آرنلڈ نے لکھا ہے کہ:

''سامان نے مسلمان ہو کر اپنا نام اپنے معاون (یعنی اسلام لانے میں جس نے مدد کی تھی، اسی کے نام (اسد پر) اپنا نام اسد رکھا اور یہی نومسلم امیرزادہ تھا جس سے دولت سامانیہ کا نام چلا''۔ (۱۲۲)

خلاصہ یہ ہے کہ جن ممالک اور علاقوں میں صدہا سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی ان میں سو دو سو نہیں آج بھی کروڑہا کروڑ کی تعداد میں جو غیر مسلم

Marfat.com

طبقات کے افراد پائے جاتے ہیں، کیا یہ خود کھلی شہادت اس مفروضہ کی تردید کے لیے کافی نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں جبر وظلم سے کام لیا گیا اور تو اور خود ہندوستان ہی کے متعلق مسٹر آرنلڈ کا یہ سوال یقیناً قابل غور ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا انکار کون کرسکتا ہے کہ:

''دہلی اور آگرہ کے اضلاع میں جو اسلامی قوت وسطوت کے مرکز تھے، مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، دہلی کے اضلاع میں دسویں حصہ سے زیادہ اور آگرہ کے ضلع میں چوتھائی حصہ بھی کل آبادی کا مسلمان نہیں ہے''۔(۱۲۳)

بلکہ ہندوستان کے راجپوت مسلمانوں یا جاٹ مسلمانوں کے متعلق یہ مشہور کرنے کی کوشش جو کی جاتی ہے کہ فلاں بادشاہ کے عہد میں جبراً ان کے باپ دادوں کو اسلام میں داخل کیا گیا، کسی نے ان ہی راجپوت مسلمانوں کی بستیوں میں پہنچ کر دریافت کیا تھا کہ آپ کے گاؤں میں بنیوں اور شودروں وغیرہ کی جو آبادی ہے یہ بھی تو قدیم زمانہ ہی سے چلی آتی ہے، اگر جبر سے کام لیا گیا تو کیا یہ مان لینا چاہیے کہ بنیوں اور شودروں کے باپ دادا سے بھی زیادہ راجپوتوں کے بہادر اور جنگ جو آباؤ اجداد کمزور اور بیٹے تھے کہ مسلمانوں کے تشدد کے مقابلہ میں انہوں نے بجائے مقابلہ کے گھٹنے ٹیک دیئے اور بنیوں یا شودروں کے اسلاف باوجود سختیوں کے اپنے قدیم آبائی دین پر ڈٹے رہے (د،د)۔

یہی نہیں کہ ان ممالک میں غیر مسلموں کی اکثریت اب تک باقی ہے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی علاقوں سے ہر زمانہ میں بڑی تعداد ان ہی لوگوں کی جو مسلمان نہیں تھے، اسلامی حکومت کی رواداری، عدل وانصاف وغیرہ کا مشاہدہ کرکر کے اسلامی قلم رو میں مسلسل نقل ہوتی رہی ہے، آرنلڈ نے مغربی مورخین کی کتابوں

Marfat.com

سے ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں، مثلاً یہی کہ:

''پندرہویں صدی کی اخیر میں اسپین کے بے شمار یہودی (مسلمانوں کی ترکی حکومت کے علاقہ میں) پناہ کے لیے آئے'' (۱۲۴)

خود عیسائیوں نے عیسائی حکومت کے مقابلہ میں ترک مسلمانوں کی حکومت کو بسا اوقات ترجیح دی، تفصیل کے لیے دیکھیے آرنلڈ کی کتاب۔ دراصل یہی واقعات ہیں جن کو پڑھنے کے بعد یہ الٹی تقریر اشاعتِ اسلام کے اسباب کے سلسلہ میں بعض جوشیلے پادریوں کو کرنی پڑی، آرنلڈ ہی نے نقل کیا ہے ایک پادری سارے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے:

''یہ غلط قصہ ہے کہ مسلمان غیر مذہب والوں سے کہتے تھے کہ یا تو قرآن کو مانو یا تلوار اٹھاؤ۔ اگر سچ ہوتا تو بہت سے عیسائی ایسے تھے جو مسیحی دین کے لیے لڑ کر اور مر کر شہادت کا رتبہ حاصل کرتے''۔ (۱۲۵)

پھر یہی جوشیلا مشنری مبلغ عیسائیت کہتا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کی حکومت کی:

''مہربانیوں نے ان عیسائیوں کو مسلمان کر ڈالا جن پر ظلم کچھ اثر نہ کر سکتا تھا (ھ، ھ)''۔ (۱۲۶) گویا:

آدمی ظلم کا مارا تو پنپ جاتا ہے مہربانی سے مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

عیسائیت کی طرف سے بھی شکایت اسلام کی جاتی ہے لیکن ہم اس کے جواب میں اردو کے اس مشہور شعر کے سوا اور کیا پڑھیں

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو تم ہی بتلاؤ کہ آخر تمہیں چاہیں کیونکر

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلامی قلم رو میں غیر مسلم طبقات کو زیادہ تر حق وانصاف سے استفادہ کا موقع ان ہی حکمرانوں کے زمانہ میں ملا ہے جو اسلام کی روح سے قریب تھے۔ مگر اب اس کا کیا علاج ہے کہ مسلمان بادشاہوں میں جو

Marfat.com

بیچارے نسبتاً اپنے دین کے زیادہ پابند تھے، محض ان کی یہی دینی زندگی اور مذہبی پابندی بدگمانی کی وجہ بن گئی اور واقعات سے ہٹ کر یہ شروع ہی میں فرض کرلیا گیا کہ اسلامی دین کی پابندی کے ساتھ بھلا دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ انصاف وعدل یا رحم ونرمی کا برتاؤ کوئی کیسے کرسکتا ہے؟ پھر اس غلط مفروضہ پر غلطیوں کی پوری عمارت کھڑی کرنے والوں نے کھڑی کر لی، عالمگیر یا ان جیسے دین دار سلاطین کی بدنامی اسی غلط خیال اور اسی قسم کے خودتراشیدہ اوہام پر مبنی ہے، ورنہ واقعہ وہی ہے کہ دین دار بادشاہوں نے جس حد تک اسلام کے ان ضوابط کی پابندی کی کوشش کی ہے، جن کا مطالبہ اسلامی قلم رو کے باشندوں کے متعلق اسلام نے کیا ہے، قدرۃً اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اسلام کی طرف لوگوں کی رغبت بڑھ جاتی تھی۔ اسی کو دیکھ کر شور کر دیا جاتا ہے کہ دینی تعصب کے نشہ میں سرشار ہو کر بادشاہ نے جبر وظلم سے کام لیا اور یوں مجبوراً لوگ مسلمان ہو گئے۔

حالانکہ کلیۃً اگر یہ صحیح نہ ہو تو عموماً یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم باشندوں کو کبھی مسلمان بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں کچھ تکلیف اگر پہنچی بھی ہے تو زیادہ تر یہ اسی قسم کے سلاطین تھے، جن کا دین سے تعلق کمزور تھا۔ بجائے دینی ہدایات کے اپنی من مانی خواہشوں یا مصلحتوں کے ساتھ ان کی کارروائیاں وابستہ تھیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کے ست کردار، ست اعتقاد اور بد بخت بادشاہوں سے غیر مسلم رعایا ہی کو نہیں، بلکہ مسلم رعایا کو بھی کافی مصیبتیں برداشت کرنی پڑی ہیں اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں تو اس طرز کے حکمرانوں کا وجود ہمیشہ بدترین رکاوٹ ثابت ہوا ہے، الجزیرہ یعنی دجلہ وفرات کے درمیانی علاقہ کی آبادیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، نقل کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

Marfat.com

''ان ساکنی ارض الجزیرۃ تنصروا بظلم (و،و) آل حمدان'' (۱۲۷)

''جزیرہ کے باشندوں نے آل حمدان کے ظلم سے تنگ آ کر عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے''۔

اس کے بعد اس نے بیان کیا ہے کہ عیسائی ہو ہو کر جوق کے جوق مسلمانوں کی جماعتیں رومیوں کے ساتھ مل گئیں اور اب وہی رومیوں کی معیت میں مسلمانوں پر اور ان کی آبادیوں پر حملے کر رہی ہیں ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد بے چارے کے قلم سے انا للہ و انا الیہ راجعون نکل گیا۔

آرنلڈ نے بھی پادری ڈن ٹن کے حوالہ سے ترکی سلطنت کے ذکر کے سلسلہ میں یہ لکھنے کے بعد کہ:

''اٹھارہویں صدی میں جب کہ عیسائی انہی سختیوں میں مبتلا تھے کہ کبھی ایسی سختیاں کسی زمانہ میں بھی ان پر نہ بیتی تھیں''۔ (۱۲۸)

ڈن ٹن لکھتا ہے کہ اس زمانے میں:

''عیسائیوں کے مسلمان ہونے کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا، بلکہ اس زمانہ کے ترکوں کے متعلق یہی لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ترقی سے غافل اور مذہبی شکوک میں مبتلا ہو گئے ہیں'' (ز،ز)۔ (۱۲۹)

بہر حال میں کہنا چاہوں گا کہ بجائے اسلام کے اسلامی حکمرانوں پر اس کا الزام عائد کرنا کہ ان کی غفلت یا وقت ناشناسی، یا ناعاقبت اندیشی نے مسلمانوں کے مفتوحہ و مقبوضہ ممالک میں غیر مسلموں کو باقی رہ جانے کا موقع دے دیا، صحیح نہیں ہے پہلے تو الزام سے اس طرزِ عمل کی تعبیر ہی غلط ہے اور کسی کو الزام ہی اگر وہ نظر آتا ہے تو چاہیے کہ اس الزام کا نشانہ مسلمان حکمرانوں کو نہیں، بلکہ اسلام اور اسلام کے ان قوانین وضوابط کو بنائے جن کا اجمالاً ذکر آپ سن چکے۔ خود قرآن میں جن کی پابندی

Marfat.com

کا سختی کے ساتھ مطالبہ کیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ آپ کے خلفائے راشدین نے برت برت کر جسے دکھایا تھا، فتح خیبر ہی کا قصہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں چند یہودی آئے کہ فوج کے بعض لوگ ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، سننے کے ساتھ ہی عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہر سپاہی تک یہ پہنچا دو کہ:

''جنت صرف مومن (یعنی اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی باتوں کے ماننے والے) کے لیے ہے''۔(۱۳۰)

آنحضرت ﷺ نے پھر لوگوں کو جمع کیا اور آگاہ کیا کہ معاہدہ کر لینے کے بعد کسی قسم کی غیر قانونی حرکت یہودیوں کے ساتھ قطعاً حرام ہے۔

بخاری ہی میں ہے کہ اسی موقع پر اس کی منادی بھی ہر طرف کی گئی کہ:

''معاہدہ کرنے والوں کو جو قتل کرے گا جنت کی بو بھی وہ پا نہ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے سونگھی جاتی ہے''۔(۱۳۱)

اسی موقع پر مسلمانوں کو خطاب کر کے رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا:

''لوگو! تم یہودیوں کے باڑوں میں گھس پڑے، حالانکہ جن سے معاہدہ طے پا چکا ان کا مال قطعاً حرام ہے، مگر وہی جس کی قانون اجازت دے''۔(۱۳۲)

یہ اور ایسی روایتوں کا ایک ذخیرہ صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ایک مصری عیسائی قریش کی طرف سے ایلچی بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''رود آواز پیمبر نے اس کی سلیم فطرت کو فتراکِ نبوت کا نخچیر بنا دیا، آیا تھا آنحضرت ﷺ کو سمجھانے اور عرض کرنے لگا کہ آپ جس پیغام کو لائے ہیں، مجھے سمجھا دیجیے۔ اس نے ارادہ ظاہر کیا کہ مسلمان ہونے کا قطعی فیصلہ کر چکا ہوں اور اب قریش کے پاس واپس نہ جاؤں گا مگر سنتے ہی

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے اس کو کیا جواب دیا، ابوداؤد ہی کے سنن میں ہے:

''نہ میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ کسی ایلچی (سفیر) اور برد (ڈاک والے) کو روک سکتا ہوں، تم کو چاہیے کہ جن لوگوں کی طرف سے سفیر بن کر آئے ہو، ان کے پاس واپس جاؤ اس کے بعد بھی تمہارے دل میں وہی خیال اگر باقی رہے جو اس وقت پیدا ہوا ہے، تو واپس آ جانا''۔(۱۳۳)

یہ مصری عیسائی سفیر جن کا نام غالباً بعد مسلمان ہونے کے ابورافع رکھا گیا، وہی بیان کرتے تھے کہ:

''میں قریش کے پاس واپس گیا اور پھر پلٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کی دولت سے سرفراز ہوا''۔(۱۳۴)

ان ہی تعلیمات اور عملی زندہ مثالوں کا نتیجہ تھا کہ نازک سے نازک ترین مواقع پر بھی مصالح اور عقلی عواقب سے قطعاً بے پرواہ ہو کر صحابہ معاہدہ کر کے احترام پر اصرار فرماتے رہے، ابھی مجھ ہی سے امیر معاویہؓ تک کے متعلق آپ نے سنا کہ عمرو بن عنبسہ صحابیؓ سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سننے کے ساتھ ہی اپنی ساری مصلحت اندیشیوں کو بالائے طاق رکھ کر فوج سمیت رومی سرحد سے واپس لوٹ گئے، حالانکہ حریف کو زک پہنچانے کے مغتنم موقع کو کھو دینے کے سوا کافی مالی تاوان ان کو برداشت کرنا پڑا۔ شام سے رومی سرحد تک فوج کو لیجانا اور لے آنا کیا معمولی مصارف سے ممکن ہے۔ مگر کچھ بھی ہو پیغمبر نے حکم دیا مومن نے سر جھکا دیا، مشہور تابعی میمون بن مہران کے حوالہ سے سیوطی نے اپنی تفسیر در منثور میں یہ فتوی ان کا نقل کیا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ:

''تین باتوں میں مسلم اور غیر مسلم کوئی ہو، سب برابر ہیں، ایک تو معاہدے کے معاملے میں کہ اس کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے خواہ مسلمانوں سے

Marfat.com

کیا جائے یا غیر مسلموں سے، اسی طرح رشتہ داری (صلہ رحمی) کے حقوق میں مسلم اور غیر مسلم کی خصوصیت نہیں، تیسرا مسئلہ امانت کا ہے کہ مسلم کی امانت ہو یا غیر مسلم کی، خیانت حرام ہے''۔(۱۳۵)

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکمرانوں اور سلاطین کا عام حال بھی یہی ہے کہ جس حد تک اسلام اور اس دین کے اصول وضوابط سے ان کی زندگیاں قریب رہی ہیں، اسلامی قلمرو کے غیر مسلم طبقات کو بھی ان ہی کے زمانہ میں امن وامان، عاقبت وراحت کی زندگی میسر آتی رہی ہے اور ان ہی دیندار سلاطین اور ان کے دیندار حکام وولاۃ کے عہد میں اسلام کی اشاعت کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔

اور مسلمانوں کی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو کسی قسم کی تکلیف اگر اٹھانی پڑی، یا ان کے انسانی حقوق میں دست اندازی کے واقعات پیش بھی آئے ہیں تو میں بلاخوف وتردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، بے دین، اور ان ہی حکمرانوں کے زمانہ میں ہوا ہے اور ان ہی کے زمانہ میں ہو بھی سکتا تھا جن کے دلوں میں اسلامی قوانین کا وزن جیسا کہ چاہیے باقی نہ رہا تھا۔ گویا کہنا چاہیے کہ اسلام نہیں بلکہ ترکِ اسلام کے ہی لازمی نتائج تھے۔ اور سچی بات وہی ہے جس کا اعتراف بہت سے انصاف پسند مغربی سیاحوں اور مصنفین نے بھی کیا ہے کہ ان سختیوں کے قصوں میں مسلم وغیر مسلم کی خصوصیت نہ تھی۔ عام طور پر اس قسم کے بادشاہوں کے عہد میں مسلمانوں پر بھی وہی سب کچھ گذر رہا تھا جس سے ملک کے دوسرے طبقات متاثر تھے اور اسلام کی تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے کہ اسی قوم کے کوتاہ نصیب، بدبخت بادشاہوں کا زمانہ ایسا زمانہ ہمیشہ رہا ہے جس میں اسلام کی روشنی دنیا کی دوسری قوموں تک پہنچ نہ سکی۔

اور یہ کیفیت کچھ بادشاہوں اور سلاطین ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں کی حالت بھی اس مسئلہ میں یہی نظر آتی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی زندگی جس زمانہ میں جہاں کہیں دین اور مذہب سے آراستہ و پیراستہ رہی ہے تو مسلمانوں کے ساتھ ان کے پڑوس میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کو بھی ہمیشہ آرام ہی پہنچا ہے۔ سخت اور کڑی گھڑیوں میں مدد ملتی رہی ہے اور اسی کے ساتھ اسلام کو بھی موقع دوسروں کے قلوب میں اترنے کا اسی قسم کے مسلمانوں کے ذریعہ ملتا رہا ہے۔ لیکن برعکس اس کے عام مسلمانوں نے جب کبھی اور جہاں کہیں دین سے لاپروائی اختیار کی اور محض ایک خاص قسم کے نام رکھنے والی یا چند رسوم یا شعار سے تعلق رکھنے والی قوم کی حیثیت سے دوسری قوموں کے درمیان مسلمان پائے گئے ہیں تو کسی ایک جگہ یا کسی خاص زمانہ ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس قسم کے مسلمانوں سے مسلمانوں کو بھی اور مسلمانوں کے ساتھ دوسری غیر مسلم قوموں کو بھی شکایتیں پیدا ہوئی ہیں۔ باہم خود بھی دست و گریبان رہے اور دوسری قوموں کی نفرت و عداوت بھی ان سے بڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ بالآخر اسی نے جنگ و قتال کی حدود تک نفرت و عداوت کو پہنچا دیا۔ غیر قوموں کی مسلمانوں کے ساتھ اسی نفرت و عداوت کا نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ خود اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی کتاب (القرآن)، اس کی تعلیمات سے لوگ بجائے قریب ہونے کے دور، بہت دور بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات دشمن بن گئے۔ ان نام نہاد مسلمانوں کی بے دینی کی زندگی کو دیکھ کر قوموں نے یہ سمجھ لیا کہ یہی مسلمانوں کی دینی زندگی ہے۔ نہ جاننے والے ان کے پیغمبر اور ان کی آسمانی کتاب پر ان کی اس زندگی کی ذمہ داری عائد کرنے لگتے ہیں۔ مگر سچی بات یہی ہے کہ اسلام کی اشاعت و توسیع میں بے دین بادشاہوں کے طرز عمل سے بہت

زیادہ دخل ان ہی عام مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی کو ہے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ سلف کے سلاطین کی شکایت عموماً اسی قسم کے مسلمان کرتے ہیں، جن کے قلوب میں خود اسلام کا اثر جیسا کہ چاہیے باقی نہیں رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ موقع جب مل گیا تھا تو خواہ دین کا مطالبہ کچھ بھی ہوتا، ہمارے بادشاہوں کو اس سنہرے موقع سے نفع اٹھاتے ہوئے اپنی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کا صفایا کر دینا چاہیے تھا، یا ڈرا دھمکا کر مجبور کر کے چاہیے تھا کہ ان کو مسلمانوں کی جماعت میں شریک کر لیتے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام اور اسلامی قوانین وضوابط کی جن لوگوں کی نگاہوں میں کوئی قیمت ہی نہیں ہے ان کے دلوں میں اسلام کا یہ درد آخر کس بنیاد پر اٹھ اٹھ کر ان کو بے چین کیے رہتا ہے۔ جب اسلام ہی کچھ نہیں ہے تو مسلمانوں کے باقی رہنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟ اسلام تو نام ہی ایک خاص قسم کی زندگی کا ہے، جس کی بنیاد صرف چند غیر فانی صداقتوں کے یقین پر قائم ہے۔ اس یقین کی چول ہی جس کے اندر ڈھیلی ہو چکی ہے، اس کو مسلمانوں کی کیا پرواہ؟ وہ ان کے فنا و بقاء کے مسئلہ کو آخر کیوں سوچتا ہے (ح، ح)۔

ممکن ہے کہ میری یہ حق گوئی بعضوں کے لیے تلخ ثابت ہو لیکن ہر مسلمان کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے، ضمیر اس کا اگر بالکل مردہ اور بے جان ہو کر نہیں رہ گیا ہے تو یقیناً یہی تلخ فتویٰ خود اپنے قلب سے بھی وہ پائے گا:

"بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ○ ولو القی معاذیرہ" (۱۳۶)

"بلکہ آدمی اپنے جی کے حال سے خوب واقف ہے، خواہ اس پر عذر کے پردے ہی کیوں نہ ڈالتا جائے"۔

دور کیوں جائیے، یہی ترک ہیں، ان کے سلاطین کو چھوڑ دیجیے، عام ترکوں کا ایک زمانہ میں یہ حال تھا۔ پادری شیفلر جو ترکی علاقے کے عیسائیوں کے متعلق یہ

Marfat.com

خبریں سن سن کر کہ بہ تعداد کثیر وہ اسلامی دائرے میں مسلسل داخل ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ترکی علاقے میں پہنچا، گھومتے پھرتے اور عیسائیوں کے مسلمان ہونے کے اسباب کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد وہ جس نتیجہ تک پہنچا تھا، اسی کے الفاظ میں سنیئے، شیفلر نے لکھا تھا:

''جب تم ترکوں سے ان کی روزمرہ زندگی میں ملو گے، اور دیکھو گے کہ وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں، غریبوں کو خیرات دیتے ہیں، مسیح علیہ السلام کی نسبت اعلیٰ درجہ کے خیالات ان میں موجود ہیں، اور انجیل کا حد سے زیادہ ادب کرتے ہیں اور ایسی نیک باتیں ان سے معلوم ہوتی رہتی ہیں''۔(۱۳۷)

یہ لکھنے کے بعد وہی آگے رقم طراز ہے:

''تو ان باتوں کو دیکھ کر تم کو خیال پیدا ہوگا کہ ترک اچھے لوگ ہیں اور غالباً نجات کے مستحق ہیں، پھر یہ سوچو گے کہ تم بھی ترک ہو جاؤ، تو تم کو بھی نجات مل جائے گی''۔(۱۳۸)

اس نے لکھا ہے کہ یہی نازک نقطہ ہے، جہاں ہر عیسائی روح پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اور:

''مقدس ثالوث، خدا کا مصلوب فرزند اور مذہب کے اور راز جو سوائے نورانی عقلوں کے کوئی نہیں جانتا، ہمارے دل سے محو ہو جائیں گے اور مسیحی دین بغیر معلوم ہوئے ہمارے دل سے غارت ہو جائے گا اور تم سمجھو گے کہ عیسائی ہونا اور مسلمان ہونا تو ایک ہی سی بات ہے''۔(۱۳۹)

قدیم ترک مسلمانوں کی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کو نقل کرتے ہوئے ایک دوسرا عیسائی سیاح مصنف لکھتا ہے کہ:

''مسلمان عبادت اور پرہیز گاری اور خیرات دینے کے کیسے پابند ہیں۔

Marfat.com

جس وقت وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو کس محویت سے خدا کی بندگی میں مصروف ہوتے ہیں۔ پاکیزگی اور تقدس ان میں کس درجہ ہوتا ہے۔ اپنے علمائے دین کے کیسے مطیع ہوتے ہیں۔ سلطان بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ مفتی سے فتویٰ لے لے (ط،ط)۔ پنج وقتہ نماز کے خواہ کہیں اور کسی کام میں ہوں، مسلمان کیسے پابند ہیں۔ کس طرح صبح سے رات تک روزے مہینہ بھر کے رکھتے ہیں۔ ان میں آپس میں کس قدر محبت اور سلوک ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ کیسا مخیر ہے (ی،ی)، ان کے شفا خانوں سے جو غریبوں اور مسکینوں کے لیے انہوں نے بنائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ غیروں کے ساتھ بھی ان کو کس قدر ہمدردی ہے"۔ (۱۴۰)

یہی مصنف آگے لکھتا ہے کہ:

"اگر ان کے مسلمانوں کے انصاف اور ان کی پرہیزگاری اور نیکیوں کا ہم خیال کریں تو ہم کو اپنے اوپر شرم آتی ہے کہ خدا کی بندگی اور آپس کے سلوک میں ہم کیسے سست قدم ہیں"۔ (۱۴۱)

آخر میں مصنف کا قلم قابو سے نکل گیا ہے لکھتا ہے کہ:

"ہم کو (یعنی یورپ و ایشیاء کے عیسائیوں کو) اپنی بے انصافیوں پر اپنے ظالم ہونے اور پرہیزگار نہ ہونے پر شرم آنی چاہیے۔ بیشک انصاف کے دن مسلمانوں کا پلہ ہم سے بھاری رہے گا۔ بیشک ان کا ایمان، ان کی نیکیاں ان کی رحم دلی، وہ چیزیں ہیں جن سے اسلام کو فروغ ہوا"۔ (۱۴۲)

اسی سلسلے میں شہنشاہ لیوپولڈ کے ایک ترکی سفیر کی یادداشت یا اس رپورٹ سے جو قسطنطنیہ پہنچنے اور کچھ دن رہنے کے بعد اسی سفیر نے اپنی حکومت کو بھیجی تھی، آرنلڈ نے ان ہی نیک نہاد ایمانی ترکوں کے متعلق یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

Marfat.com

''ترک اپنے مذہب کے نہایت پابند ہیں اور ان کی یہ بات عیسائیوں سے کہیں بڑھ کر ہے کہ نماز کے وقت کسی ترک کا دھیان دوسری چیز کی طرف نہیں بٹتا، کوئی مسلمان ایسا نظر نہ آئے گا جو عبادت کے وقت ہمہ تن مصروف نہ ہو اور ادب و تعظیم کی وہ کل علامتیں اس کی صورت سے ظاہر نہ ہوتی ہوں جن علامتوں کا اپنے خالق کے لیے ظاہر کرنا اس کی مخلوق کا فرض ہے''۔ (۱۴۳)

یہی نہیں بلکہ مغربی ممالک کی ان ہی سفارتوں کے متعلق یہ عجیب وغریب رپورٹ خود یورپ کے مصنفین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے کہ:

''قسطنطنیہ میں عیسائی سفیروں کو ہر وقت اس کا اندیشہ رہتا تھا کہ ان کے وطن کا کوئی عیسائی جو نوکری کر کے ان کے ساتھ آیا ہے کہیں وہ مسلمان نہ ہو جائے''۔ (۱۴۴)

حاشیہ میں آرنلڈ ہی نے گملن کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے:

''عیسائی سفیروں کو کسی دن اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ملازم ان کو چھوڑ کر نہ چل دیں گے اور جب تک شام نہ ہوئی وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ دن خیریت سے گذرا''۔ (۱۴۵)

اور قسطنطنیہ یا ترکی کے متعلق تو ممکن ہے کہ اسلامی حکومت کی شان وشوکت ترکوں کے غیر معمولی فتوحات وغیرہ کا بھی اضافہ عام مسلمانوں کی دینی زندگی کے ساتھ کر دیا جائے۔ لیکن ایسے ممالک جہاں مسلمان فاتح ہونے کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے تھے، وہاں مسلمانوں کی عام دینی زندگی جن نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے چند نمونے ان کے بھی دیکھ لیجیے۔ مثلاً چین ہی کے مسلمانوں کو لیجیے، یورپ کے پادریوں کو جب خبر ملی کہ مشرق کے اس دور دراز گوشے میں بھی اسلام آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، تو کچھ لوگ وہاں بھی اس کے ٹوہ میں پہنچے۔ بڑی بڑی کتابیں چین میں اشاعتِ اسلام کے خطرے پر لکھی گئیں، ان رپورٹوں سے چند اقتباسات پیش کرتے

Marfat.com

جاتے ہیں، آرنلڈ نے اینڈرسن کے حوالہ سے ایک جگہ نقل کیا ہے:

''اسلام کو خاص چین میں بہت استحکام ہو گیا ہے، اس کا باعث یہ ہے کہ جب کسی صوبہ کی آبادی وبا یا قحط کی بلاؤں سے جن کا گذرا کثر اس ملک میں رہتا ہے، غارت ہو جاتی ہے، تو مسلمان بہت خوشی سے اور مستعدی سے ان برباد مقاموں کو آباد کر دیتے ہیں۔ قحط کے زمانہ میں مفلسوں سے ان کے بچے خرید لیتے ہیں اور ان کو مسلمان کر کے پرورش کرتے ہیں۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو ان کا نکاح کر کے ان کو سکونت کے لیے علیحدہ مکان دیئے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے گاؤں کے گاؤں نومسلموں سے آباد کر دیئے جاتے ہیں (ک،ک)''۔ (۱۴۶)

ایک دوسرا مصنف ڈبلیو جے سمتھ چین میں اسلام کی اشاعت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''مسلمانوں میں پابندی مذہب کے لیے ہر طرح کوشش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ غریب سے غریب آدمی کو بھی ابتدائی کتابوں کی مدد سے اسلام کے ضروری احکام اور ارکان سکھائے جاتے ہیں'' (۱۴۷)

الغرض ایک طرف مصیبت زدوں کی دستگیری، کڑے وقتوں میں مشکلات سے مقابلہ کی چینی مسلمانوں میں جو صلاحیت پائی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ غریب بھائی بندوں کو دل کھول کر امداد، ان کی مذہبی تعلیم کی طرف ان کی غیر معمولی توجہ ان عیسائی سیاحوں کو اسلام کی اشاعت کی ایک وجہ اگر نظر آئی تو دوسری طرف چینی مسلمانوں نے ہمیشہ حکومت کے امن پسند شہری اپنے آپ کو ثابت کرنے کی عموماً ہر زمانہ میں جو کوشش کی ہے اس کا ذکر بھی مختلف طریقوں سے ان ہی لوگوں نے کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک شاہی فرمان کی نقل بھی چین کے شاہی دفتر سے ان لوگوں کو

Marfat.com

ملی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ بعض تنگ نظر حکام نے بادشاہ وقت سے چینی مسلمانوں کی شکایت کی، اسی شکایت کے بعد ۱۷۳۱ء میں چین کے خاقان نے یہ فرمان شائع کیا تھا:

''ہماری سلطنت کے ہر صوبہ میں صدہا سال سے مسلمان موجود ہیں، جو ہماری رعایا کا ایک حصہ ہیں، اور جس طرح اور ہماری رعایا مثل ہماری اولاد کے ہے، اسی طرح یہ مسلمان بھی ہماری اولاد ہیں۔ میں مسلمانوں میں اور ان لوگوں میں جو مسلمان نہیں ہیں کوئی فرق نہیں سمجھتا''۔(۱۴۸)

پھر جس حاکم نے مسلمانوں کی شکایت کی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ نے لکھا تھا کہ:

''بعض حاکموں نے مسلمانوں کی خفیہ شکایتیں ہم سے کی ہیں جن کی بنا صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہب چینیوں کے مذہب سے مختلف ہے۔ مسلمان وہ زبان نہیں بولتے جو اور چینی بولتے ہیں اور لباس بھی چینیوں سے مختلف وضع کا ہے''۔(۱۴۹)

آگے اسی کے بعد ہے:

''مسلمانوں پر نافرمانی، گستاخی اور باغیانہ خیالات رکھنے کا الزام لگایا گیا ہے اور ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ مسلمانون کے خلاف سخت طریقے اختیار کیے جائیں''۔(۱۵۰)

بادشاہ نے ان الفاظ کے بعد لکھا تھا کہ:

''لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ ان شکایتوں اور الزاموں کی کوئی بنیاد نہیں ہے''۔(۱۵۱)

پھر مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے اسی فرمان میں لکھا گیا تھا کہ:

''مسلمان جس مذہب کے پابند ہیں وہ فی الحقیقت ان کے بزرگوں کا مذہب ہے۔ پھر سچ ہے کہ ان کی زبان وہ نہیں ہے جو اور چینیوں کی زبان ہے لیکن چین کے ملک میں بہت سی مختلف قوموں کی زبانیں بولی جاتی ہیں''۔(۱۵۲)

زبان کے اختلاف کا یہ واقعی منصفانہ جواب دیتے ہوئے بادشاہ نے مسلمانوں کی دوسری خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ان کی عبادت گاہوں کی نسبت اور لباس وطرزِ تحریر کے بارے میں جو چینیوں کی وضع وطرز سے مختلف ہیں جس قدر شکایتیں کی گئی ہیں، وہ ہرگز لحاظ کے قابل نہیں، یہ سب رواج اور دستور کی باتیں ہیں''۔(۱۵۳)

آخر میں بادشاہ نے لکھا تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہماری حکومت کے بڑے بڑے عہدوں تک پہنچتے رہے ہیں اور سرکاری امتحانوں میں اور لوگوں کی طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں میری حکومت کسی تفریق اور امتیاز کو جائز قرار نہیں دیتی (ل،ل)۔(۱۵۴)

اسی فرانسیسی مصنف دے تیرسان کے حوالہ سے آرنلڈ نے چینی مسلمانوں کے اس خاص طرزِ عمل کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ:

''مسلمان اپنے مذہب اور کنفیوشس کے مذہب میں جو باتیں مشابہ ہیں ان کو جتلاتے ہیں''۔(۱۵۵)

گویا جیسے عیسائی مسلمانوں سے اس لیے متاثر ہوتے تھے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کے احترام میں مسلمان کوئی کمی نہیں کرتے، یہ طریقہ چین کے عام مذہب کے پیشوا کے ساتھ انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے دین کا بھی اقتضاء یہی ہے۔ ان کو دنیا کے تمام ادیان وملل سے تکذیب وتحقیر کا نہیں بلکہ تصدیق وتکمیل وتصحیح کا تعلق ہے۔ خصوص چین کے عام

Marfat.com

شندوں، اس ملک کی حکومت، اس ملک کے باشندوں کے مذہب کے ساتھ ایک
ص قسم کا روادارانہ برتاؤ اور اسی کے ساتھ اس زمانہ میں ان کی پختہ دینی زندگی
ن ہی باتوں میں اسلام کے فروغ کا راز ان عیسائی سیاحوں کو نظر آیا تھا۔

افریقہ کے دور دست علاقوں یا جزیروں میں بھی یورپ والوں کو اسلام کی
ترقی کی تیز رفتاری کے اسباب جو ملے ہیں، ان ہی کی کتابوں سے بعض چیزیں جنہیں
آرنلڈ نے نقل کیا ہے، پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً افریقہ کے نیگرو اقوام کو مسلمانوں نے
کس طرح متاثر کیا، اس کی تفصیل کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف بیان کرتا ہے:

''انتہا درجہ کی ظالمانہ رسمیں جو ایک زمانہ سے تمام افریقہ میں پھیلی ہوئی تھیں
اور اب بھی براعظم افریقہ کے بعض حصوں میں گولڈ کوسٹ اور انگریزی
نوآبادیوں کے قریب جاری ہیں۔ یعنی مردم خواری اور انسان کی قربانی اور
بچوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج اسلام قبول کرتے ہی فوراً ہمیشہ کے لیے
موقوف ہو جاتا ہے''۔(۱۵۶)

آگے اسی کا بیان ہے کہ:

''اب تک جو برہنہ یا نیم برہنگی کی حالت میں رہتے تھے، کپڑے پہننے شروع
کرتے ہیں اور کپڑے ایسے جو پاک اور ستھرے ہوں اور وہ لوگ جو کبھی
نہانا اور منہ دھونا نہیں جانتے تھے، بار بار نہاتے ہیں اور منہ دھوتے ہیں۔
کیونکہ نفاست اور پاکیزگی کے قواعد ان کو بتائے گئے ہیں''۔(۱۵۷)

اسی کا بیان کیا ہے:

''اس خوفناک مکان کی جگہ جسے جوجو کا گھر کہتے تھے اور جس میں بدشکل
چیزیں پوجنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں''۔(۱۵۸)

جوجو کے اس گھر کی جگہ:

Marfat.com

''اب خوبصورت بنی ہوئی پاک اور ستھری مسجد جس کی محراب مکہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور جس میں مؤذن پانچ وقت اذان دے کر نمازیوں کو بلاتا ہے اور جس میں امام ہر جمعہ کو نماز پڑھاتا ہے، گاؤں کے مسلمانوں کا عام مرجع بن جاتی ہے''۔(۱۵۹)

وہی لکھتا ہے کہ پھر ان ہی مسجدوں میں:

''سب لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کرتے ہیں، جو حاضر و ناظر علیم و بصیر و رحیم ہے'' (۱۶۰)

بوسودتھ سمتھ کے حوالہ سے آرنلڈ نے ان ہی افریقی مسلمانوں کے متعلق نقل کیا ہے:

''یہ بات سب نے تسلیم کی ہے کہ افریقہ کے نومسلموں میں مذہب اسلام ایسی ہمت اور جرات اور قدرت، اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے کی قابلیت پیدا کر دیتا ہے، جن کا نشان ان ہی افریقی مسلمانوں کے ہم قوم ہم وطن بت پرستوں یا عیسائیوں میں مشکل سے ملتا ہے''۔(۱۶۱)

ذرا خیال کیجیے مغربی افریقہ کا اور اس کے دریائے گامبیا جو سنگھالی قوموں کے وطن سے گذرنے والے دریائے سنگھال کے قریب ہے اور دونوں بحر اوقیانوس میں جا کر گرتے ہیں۔ ۱۷۳۱ء میں ایک مغربی سیاح اس علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور دنیا کے آخری حصہ کے اس علاقہ میں دوسری وحشی اور بت پرست قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ان ہی ملی جلی شکلوں میں پاتا ہے۔ اس نے اس علاقے کے مسلمانوں کی دوسری خصوصیت کے ساتھ چند باتیں یہ بھی بیان کی ہیں کہ:

''ان مسلمانوں کو میں نے بہت جفاکش اور سیدھا سادہ پایا، اپنے صرف سے زیادہ اناج وہ پیدا کرتے ہیں''۔(۱۶۲)

اس کے بعد وہی لکھتا ہے کہ:

''ان مسلمانوں کی مہمان نوازی بہت مشہور ہے''۔(۱۶۳)

اور یہ کہ:

''اس دیس کی دوسری قومیں ان مسلمانوں کی آبادیوں کے قریب آباد ہونا، اپنے لیے نعمت تصور کرتی ہیں''۔ (۱۶۴)

اسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود اس قدر امن پسند اور حلیم و بردبار ہونے کے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس علاقے کے مسلمان بزدل ہیں بلکہ:

''افریقہ کی اور قومیں جس قدر دلیر اور بہادر ہیں، اسی قدر بہادر یہ لوگ بھی ہیں اور ہتھیار چلانے میں بڑے مشاق ہیں''۔(۱۶۵)

اور یہی ہے بھی درحقیقت دیندار مسلمانوں کی زندگی کی خصوصیت۔ اسی سیاح نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''یہ قوم بڑی متشرع مسلمان ہے، اس کا کوئی آدمی برانڈی یا پانی سے زیادہ تیز پینے کی چیز نہیں پیتا''۔(۱۶۶)

ابن بطوطہ نے بھی اسی نیگرو قوم کے علاقے میں چودھویں صدی میں سفر کیا تھا، تو اس وقت بھی اس نے یہی کہا کہ:

''یہاں کے مسلمان پابند صوم وصلوۃ ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، جمعہ کے روز کوئی شخص بہت پہلے مسجد میں نہ پہنچے تو پھر جگہ ملنی ناممکن ہے، کیونکہ جمعہ کے روز نمازیوں کی بڑی کثرت ہوتی ہے''۔(۱۶۷)

چودھویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کے سیاحوں کا بالاتفاق بیان ہے کہ نائیگرو علاقے کے مسلمانوں کی زندگی پر دینی رنگ چڑھا ہوا تھا اور ان کی یہی زندگی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسری قومیں ان کے پڑوس میں آباد ہونے کو نعمت

Marfat.com

تصور کرتی تھیں اور مسلمانوں کی دینی و اخلاقی زندگی سے متاثر ہو کر ان کے دین کو اختیار کرتی چلی جاتی تھیں۔ بلکہ انیسویں صدی کے آخر تک اس علاقے کے سیاحوں کی رپورٹوں سے ثابت ہوتا ہے کہ:

''ساحل اور اطراف نیز اندرونی علاقوں میں اشاعتِ اسلام کا کام ترقی پر نظر آ رہا ہے (م،م)''۔(۱۶۸)

ان ہی سیاحوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیادہ تر اشاعتِ اسلام کا یہ کام مسلمان تاجروں کے ذریعہ انجام پا رہا ہے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ:

''ان تاجروں کی طرف سے اس ملک کے دیسی باشندوں کے قلوب میں کسی قسم کی بدگمانی نہیں پائی جاتی''۔(۱۶۹)

اسی لیے جب کوئی مسلمان سوداگر بت پرستوں کے گاؤں میں پہنچتا ہے اور بار بار وضو کر کے رکوع اور سجدے سے نمازیں پڑھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں وہ خدا سے مخاطب ہے، تو گاؤں کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔(۱۷۰)

اور یہی نظارہ، نیز:

''مسلمانوں کی عقلی و اخلاقی برتری کی وجہ سے وہاں کے لوگ ان کی توقیر کرتے ہیں، ان پر بھروسہ کرتے ہیں''۔(۱۷۱)

یہ حال تو ان قوموں کے تاثرات کا ہوتا ہے اور دوسری طرف جیسا کہ اس سیاح کا بیان ہے:

''یہ مسلمان تاجر ہر وقت تیار رہتا ہے کہ جو خوبیاں خود اس میں موجود ہیں، وہی دوسروں میں پیدا کر دے''۔(۱۷۲)

دیکھا آپ نے مسلمان اپنی دینداری کے زور سے قوموں میں اعتماد اور بھروسہ کے پیدا کرنے اور پھر ان کو اپنے دین میں داخل کر لینے میں کس طرح

Marfat.com

کامیاب ہوتے ہیں، اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ حاکم ہوں، یا محکوم، ہر حال میں مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ اچھا سلوک بھی کیا ہے جو دین پر قائم تھے اور ان ہی لوگوں کو دینی دائرے کی توسیع کا موقع بھی غیر قوموں میں ملا ہے۔ ورنہ جن مسلمانوں نے قوموں کے آگے اپنے آپ کو غنڈوں، اٹھائی گیروں، بدمعاشوں، جھگڑالو آدمیوں کے قالب میں پیش کیا ہے، سچ پوچھئے تو ان سے اسلام دوسروں تک تو کیا پہنچے گا، آج اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لیے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے لکھا تھا: امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

آرنلڈ نے سر بارٹر فریری کے حوالہ سے افریقہ میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افریقہ میں تبلیغ اسلام میں جو بہت تیز ترقی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر نو مسلم افریقی یہ یقین کر لیتا ہے کہ مسلمانوں کا گھر اس کا گھر ہے، جہاں اس کو ٹھہرنے اور کھانے پینے کا سامان جس وقت بھی وہاں پہنچے گا، میسر آ سکتا ہے اور یہ کہ:

''اسلام قبول کرنے کے ساتھ اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک میں ایک ایسی قوم کا رکن ہو گیا ہے جو حکمران تو نہیں لیکن ملکی رسوخ کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہے''۔(۱۷۳)

سر بارٹر نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان ہونے کے ساتھ اس نو مسلم کو اخوت اور آپس میں برابر سمجھے جانے کا عملی برتاؤ اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر افسوس کیا ہے کہ گو عیسائی بھی اس دینی اخوت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن:

''گورے رنگ کا عیسائی کالے رنگ کے کافر اور غلام افریقی کا مدت سے آقا سمجھا جاتا ہے''۔(۱۷۴)

آرنلڈ نے اسلام اور عیسائیت کے اس فرق کو تفصیل کے ساتھ مختلف

Marfat.com

شہادتوں کی روشنی میں واضح کیا ہے، آخر میں ایک مشنری رپورٹ سے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ عیسائیوں کے اسی امتیازی سلوک کا نتیجہ ہے کہ:

''افریقیوں میں یہ عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ اسلام کالے آدمیوں کے لیے اور عیسوی مذہب گورے آدمیوں کے لیے مختص ہے، وہ جانتے ہیں کہ عیسوی مذہب ان کو نجات کے لیے بلاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو مذہب عیسوی ایسا ذلیل درجہ دیتا ہے کہ وہ ہمت ہار کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہماری قسمت میں اس مذہب کا حصہ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اسلام ان کو یقین دلاتا ہے کہ یہ تم پر منحصر ہے کہ جس قدر بلندی تک پہنچنا ممکن ہو پہنچ جاؤ''۔(۱۷۵)

پس سچی بات یہی ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، آج ہو یا کل، اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کے سامنے اپنے اسی تجربہ کو پیش کیا ہے، کہ حاکم ہوں یا محکوم، کسی حال میں بھی ہوں، دین سے جس قدر قریب رہیں گے، خدا بھی ان سے قریب رہے گا۔ اس کی امداد بھی ان کے قریب رہے گی، دنیا کی قوموں کے قلوب بھی ان سے نزدیک رہیں گے۔ یہاں تک کہ یہی نزدیکی بالآخر ان کو اسلام میں داخل کر کے رہتی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات تو افریقہ کے متعلق آپ نے سنے۔ مشرق کے مجمع الجزائر، ملایا جاوہ، سوماٹرہ وغیرہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آرنلڈ ہی نے کمتیر کی کتاب سے یہ فقرے نقل کیے ہیں:

''ملایا کے یہ مسلمان ..... مذہب کے نہایت پابند ہیں، مجمع الجزائر کے کل مسلمانوں میں ان کی پرہیزگاری کی ایسی شہرت ہے کہ بطور مثال کے ان کا ذکر کیا جاتا ہے''۔(۱۷۶)

مگر اس شدید قسم کی مذہبیت کے ساتھ یہ مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ:

''ملک کے ہندو، عیسائی، بدھ اور بت پرستوں سے رات دن ان کا میل

جول بھی رہتا ہے''۔(۱۷۷)

اور یہ کہ:

''مذہبی آزادی ورواداری، صلح کل کا اصول یہی ان کا دستور اور قاعدہ ہے''۔(۱۷۸)

یہ لوگ:

''دنیا کی باتوں میں لوگوں کو نفع پہنچانے کے ساتھ ان کی مذہبی بہبودی کا خیال بھی ان کو ہے''۔(۱۷۹)

اور ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کے باشندوں میں:

''اسلام کا اثر بہت پایا جاتا ہے۔ سپاہیوں میں جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں ان کو سمسام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ایسی زبان بولتے ہیں جو ملایا اور سامی زبانوں سے مرکب ہے۔ جزیرہ کی وحشی قوموں میں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں''۔(۱۸۰)

بہر حال بجائے اپنوں کے غیروں کی ان شہادتوں کو پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی اور اس زندگی کے نتائج کو غیروں کی آنکھوں نے کس نظر سے دیکھا ہے، خود مسلمانوں کو اپنی دینی زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن مسلمانوں کو اپنے دین سے جہاں کہیں بھی پانے والوں نے قریب تر پایا ہے، وہ ہمیشہ اسی اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں جس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے گذریں۔ قرآن میں اصحاب کہف کی ایمانی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے منجملہ اور باتوں کے آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

''لو اطلعت علیهم لو لیت منهم فراراً وّ لملئت منهم رعبا''(۱۸۱)

''ان کو جھانک کر اگر تم دیکھو گے تو رعب سے تم بھر جاؤ گے''

میں تو غار میں ان پناہ لینے والے نوجوانوں کے ایمان اور ان کی قوت ہی

کو اس رعب کا سبب قرار دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں کو گناتے ہوئے جن سے حق تعالیٰ نے خصوصی طور پر آپ کو سرفراز فرمایا ہے ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ:

''نصرت بالرعب علی مسیرة شهر''(۱۸۲)

''رعب سے میری مدد ایک مہینہ کی مسافت سے کی گئی ہے''

یعنی جن مقامات تک ایک مہینہ چل کر لوگ اس زمانہ میں پہنچے تھے، ان تمام مقامات کے باشندوں کے قلوب میں آپ کا رعب ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اس رعب کو رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ مختص سمجھا جاتا ہے لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں دوسری چیزیں مثلاً جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً (۱۸۲،الف) (زمین کا پورا کرہ میرے لیے مسجد بنادی گئی ہے اور یہ کہ اسی زمین کی مٹی طہارت (تیمّم) کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ یا احلت لی الغنائم (۱۸۲،ب) (جنگ کا مالِ غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا) ظاہر ہے کہ پیغمبر ﷺ کے ساتھ ان چیزوں میں امت کو بھی جب حصہ ملا ہے تو رعب سے نصرت و امداد کے متعلق آخر کیوں سمجھا جائے کہ پیغمبر کی امت اس نعمت سے محروم ہے اور صرف پیغمبر ﷺ کی ذات اقدس تک رعب والی یہ امداد محدود تھی۔

بورنیو کے مجمع الجزائر میں جزیرہ زولو میں ڈل رمپل نامی ایک مغربی سیاح ۱۷۶۱ء سے ۱۷۶۴ء تک مقیم رہا، اور وہاں کے حالت پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا۔ مسٹر آرنلڈ نے اسی مضمون سے نقل کیا ہے کہ:

''یہاں ایدان نامی ایک قوم ہے جس نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا ہے، لیکن اپنی جہالت پر ان کو میں دیکھتا تھا کہ نادم اور حسرت و افسوس میں مبتلا ہیں اور دل ہی دل میں خفیف رہتے ہیں''۔(۱۸۳)

Marfat.com

ڈل رمپل نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:

''جس وقت ایدان قوم کے لوگ مسلمانوں کے گھروں میں یا مسلمانوں کے جہازوں پر آتے ہیں، تو مسلمانوں کی بے حد تعظیم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان وہ ہیں جن کو اپنے پروردگار کا علم حاصل ہے''۔(۱۸۴)

اسی کا بیان ہے کہ اس نے یہ بھی دیکھا کہ:

''جس جگہ مسلمان سوتے ہیں وہاں یہ ایدان بیٹھتے نہیں اور مسلمان جس ڈبیہ سے چونا نکال کر کھاتے ہیں، اس میں یہ لوگ خود انگلیاں ڈال کر چونا نہیں نکالتے، بلکہ مسلمان جب ان کو خود پان یا چونہ دیتے ہیں، تو بہت ادب سے لیتے ہیں''۔(۱۸۵)

اور آخر میں اس نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:

''جس خدا کو ایدان کے لوگ خود نہیں مانتے، اس کی الوہیت کے اقرار میں وہ ایسے لوگوں کے سامنے جو خدا کا علم رکھتے ہیں، ہر بات میں عجز و انکساری ظاہر کرتے ہیں''۔(۱۸۶)

آپ ہی بتایئے کہ ایمانی رعب کے سوا قوم ایدان کے ان نفسیاتی تاثرات کی اور کیا توجیہ کی جائے۔

غیروں کی ان شہادتوں کو پڑھ کر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسلامی مؤرخین کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں عموماً جو پائی جاتی ہیں ان کا انکار کیا جائے۔ مثلاً ذہبی نے منصور بن ذاذان محدث کے ذکر میں لکھا ہے کہ عباد بن العوام جب کمسن تھے، منصور کے جنازے میں شریک ہونے کا موقع ان کو ملا تھا۔ یہی عباد کہتے تھے کہ:

''میں نے دیکھا کہ منصور کے جنازے میں مسلمانوں کے سوا یہود الگ شریک ہیں اور نصاریٰ الگ شریک ہیں''۔(۱۸۷)

ابن عساکر نے ابن ابی خثمہ کے حالات میں لکھا ہے کہ:

Marfat.com

''مصیصہ (شامی علاقہ کی چھاؤنی جو رومیوں کے حدود کے قریب تھی) اسی مقام پر ان کی وفات ۱۸۸ھ میں ہوئی۔ یہ ہارون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا، جس دن ان کا انتقال ہوا دیکھا گیا کہ (مسلمانوں کے سوا) اپنے اپنے سروں پر یہود و نصاریٰ بھی خاک ڈال رہے ہیں اور ان کی موت کے غم میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں''۔(۱۸۸)

ایسی صورت میں اس مشہور واقعہ پر کیوں تعجب کیا جائے جس کا تذکرہ امام احمد بن حنبل کے عام سوانح نگاروں نے کیا ہے، یعنی حضرت امام احمد کی جب وفات ہوئی تو:

''اسلم یوم مات عشرون الفا من النصاریٰ والیھود والمجوس''(۱۸۹)

''جس دن امام کی وفات ہوئی تو عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں میں سے بیس ہزار آدمی مسلمان ہو گئے''۔

صحیح اسلامی و دینی زندگی گذار کر مرنے والوں نے اپنی موت سے بھی ایمانی زندگی مختلف زمانوں میں جو بانٹی ہے، اس کا افسانہ تو اتنا طویل ہے کہ چاہنے والے کوئی مستقل کتاب ہی اس موضوع پر لکھنا چاہیں تو لکھ سکتے ہیں اور اس میں عبرت ہے ان زندہ مسلمانوں کے لیے جن کی بے دینی یا دین سے دور زندگی خود مسلمانوں کی ایمانی موت کا بسا اوقات سبب بن جاتی ہے، اپنی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان ہی مسلمانوں کی بدولت کتنوں کو آج دین سے مرتد ہونے تک مجبور ہونا پڑا ہے۔

﴿و ما اصابک من سیئة فمن نفسک﴾(۱۹۰)

''اور برائی جو کچھ بھی تمہیں پہنچتی ہے اس کا منشا خود تم ہو، تمہاری ذات''

بہر حال ہم غیروں کے شکوے شکایت اور ان کے جور و ظلم کی حکایت کے

Marfat.com

عادی ہو گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ غیروں کے رحم و کرم کے سوا اپنی پناہ گاہ اب ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ آسان بات کو خود اپنے ہاتھوں ہم نے دشوار بنا لیا ہے۔ زندگی کے وہی اوقات جو دوسروں کے شکوے شکایت کرنے میں ہم گزارتے ہیں ان سے تھوڑا بہت تھوڑا وقت بھی اپنے آپ سے شکایت کرنے میں ہر شخص ہم میں دینا اگر شروع کر دے تو اس کو نظر آئے گا کہ جن چیزوں کو ہم دوسروں کے اقتدار و اختیار میں پاتے ہیں، درحقیقت وہ خود ہماری اختیاری چیزیں ہیں۔

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جن شکایتوں کا ازالہ خود ہمارے زیر اقتدار ہے جب ان کے ازالہ کی ہمت خود ہم میں باقی نہیں رہی ہے تو غیروں سے ہمیں جو شکایتیں ہیں ان کے ازالہ کی ہم توقع کس بنیاد پر کر سکتے ہیں۔ ہمیں خود اپنے آپ پر جب رحم نہیں آتا تو دوسروں سے رحم کی امید بتایا جائے کہ کہاں تک درست ہو سکتی ہے۔ خدا کے جس رسول علیہ السلام کے دست حق پرست پر ہمارے آباؤ اجداد نے بھی بیعت کی اور خود ہم بھی اس بیعت پر بحمد للہ آج تک قائم ہیں، اسی بیعت پر اصرار کرتے ہوئے جینا بھی چاہتے ہیں اور اسی پر طے کیے ہوئے ہیں کہ مریں گے بھی۔ کیا ہمارے لیے جائز تھا کہ اسی پیغمبر ﷺ کی ان باتوں کو سن کر جن کا حدیث کی صحیح کتابوں میں بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ مثلاً قریش کے جاہلی عرب کو آپ خطاب کر کے فرماتے کہ:

''ہم ان سے کچھ نہیں چاہتے بجز ایک بات کے جس کا اقرار وہ کر لیں، ایسی بات جو عرب کو بھی ان کے سامنے جھکا دے گی اور عجم سے بھی ان کو جزیہ دلا دے گی''۔ (۱۹۱)

قریش کے صنادید پوچھتے کہ ایک بات کیا اگر واقعی یہ ممکن ہے جو تم کہتے ہو تو ہم ایسی دس باتیں تمہاری ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آنحضرت ﷺ تب فرماتے کہ:

Marfat.com

''لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) بس اس کی مان لو''۔(۱۹۲)

اسی کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جن باتوں کی ضمانت لی گئی ہے، خود دیکھو گے کہ تمہارے سامنے آتی ہیں یا نہیں۔قریش پر جب تک جاہلیت کا دورہ پڑا ہوا تھا وہ اس سے انکار کرتے رہے، یہی کہتے رہے:

''ما سمعنا بھذا فی الملۃ الآخرۃ ان ھذا الاختلاق(ن،ن)''(۱۹۳)

''کسی دوسری قوم کی قومی زندگی (اللہ کو اللہ احد بنانے پر مبنی ہو) ہم نے آج تک یہ نہیں سنا، یہ تمہارا ایک خودتراشیدہ نظریہ ہے''۔

بکر بن وائل کا قبیلہ جو ایرانیوں کی حدود میں رہتا تھا۔حج کے لیے مکہ معظمہ اسی قبیلہ کے بعض سردار آئے ہوئے تھے۔آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے بھی اسی ضمانت کو پیش کیا۔کسریٰ ایران جس کے نام سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ فرماتے کہ تم میری بات مان لو!

"ان لم تلبث قلیلا حتی یورثکم اللہ ارضھم و اموالھم"(۱۹۴)

''تو نہ ٹھہرو گے تم زیادہ دن تک کہ مالک بنا دے گا اللہ تعالیٰ تمہیں ایرانیوں کی زمین کا بھی، اور ان کے اموال کا بھی''۔

اسی عرصہ میں ابولہب آ گیا اور بولا یہ دیوانہ ہے، ان کی بات کا خیال نہ کرو۔لکھا ہے کہ بکر کے سرداروں نے تب ابولہب سے کہا کہ:

''ہاں فارس (ایران) کے متعلق جو باتیں اس شخص نے کیں، ان کو سن کر تو ہم نے بھی اس کو مجنون ہی خیال کیا تھا''۔(س،س)(۱۹۵)

مگر دنیا نے کل پندرہ بیس سال کے عرصہ میں دیکھ لیا کہ دیوانہ کون تھا، اور کون قوانین عالم کے سلسلہ کے کلیدی قانون کے پانے میں کامیاب ہوا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ قریش کے جاہلوں نے تو دیکھنے اور تجربہ سے پہلے انکار

کیا تھا لیکن اس امت کے متعلق اب میں کیا کہوں جس کے سامنے وہ سب کچھ گذر چکا ہے، جو کہا گیا تھا۔ اس نسخہ کا بار بار تجربہ کر کے نتائج کا مشاہدہ کر چکی ہے جس کے پسنے کی ابتدائی دعوت قریش کو دی گئی تھی۔

لیکن بجائے خطاب ہونے کے ہوتا کہ ہم میں کل نہیں تو بعض ہی لوگ اوّاب (ع،ع) ہونے کی زندگی اختیار کرتے اور ''دیگراں'' سے ہٹ کر اپنی نصیحتوں کا رخ کچھ دن کے لیے خود اپنی طرف پھیر دیتے، پھر کہف (غار) کے نوجوانوں نے جیسے کہا تھا:

﴿ربنا رب السموت والارض لن ندعو من دونه الهالقد قلنا اذا شططا﴾ (۱۹۶)

''ہمارا مالک وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے نہیں پکارتے ہم اس کے سوا کسی دوسرے الہ کو یقیناً اس وقت کہیں گے ہم غلط بات''۔

یہ کہتا ہوا آج بھی مسلمانوں میں نوجوانوں کا کوئی گروہ کھڑا ہو جاتا تو یقین مانیے کہ اسی کہنی زندگی سے وہ اپنے لیے بھی اور اپنی قوم کے لیے بھی مرافق حیات اور معاشی سہولتوں کے سرچشمہ کے پالینے میں کامیاب ہو جاتے اور آج زندگی کی صحیح راہ کے ڈھونڈنے میں انسانیت جو بھٹک رہی ہے اس کو اپنی اس جستجو میں ''ولی مرشد'' بھی مل جائے گا۔ وہی قومیں جو آج دنیا کے مردار پر کتوں کی شکل میں ٹوٹی پڑتی ہیں، ان کی محافظت پر دیکھیں گے کہ آمادہ ہو گئی ہیں۔ ہر دیکھنے والا ان سے مرعوب ہونے لگے گا اور مجال کسی کی نہ رہے گی جو ان کے سامنے ٹھہر سکے (ف،ف)۔

Marfat.com

حواشی

الف۔ ابوداؤد میں اس حدیث کے الفاظ یہی ہیں، طبرانی میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس پر میں دعویٰ کروں گا، اسے ہارنا پڑے گا۔ (کنز العمال، ۲/۲۷۱، علاء الدین علی المتقی ابن حسام الدین، حیدرآباد، مطبع معارف، ۱۳۱۲ھ)

ب۔ حدیث کی عام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ ایرانی علاقے کے بعض سپہ سالاروں کے نام حضرت عمر فاروقؓ کا یہ گشتی فرمان پہنچا کہ مترس (مت ڈر) کے فارسی لفظ کے کہ دینے کے بعد کسی غیر مسلم پر اگر کوئی مسلمان سپاہی ہاتھ چھوڑے گا تو میں اس کی گردن اڑادوں گا۔ (موطا امام مالک مع شرح المنتقیٰ، ۴/۳۴۴، مالک بن انس، المکتبۃ المکرمۃ، مکتبہ عباس احمد بن الباز، ۱۴۲۰ھ)

ج۔ عورتوں کو ان کی چند خصوصی نسوانی کمزوریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک کمزوری کی تعبیر تکثر ن اللعن کے الفاظ سے رسالت مآب ﷺ نے جو فرمائی ہے، میرا خیال ہے کہ کوسنے کی عام عادت عورتوں میں جو پائی جاتی ہے، غالباً یہ اسی کی طرف شاید اشارہ ہے۔ مردوں میں یہ عادت کم پائی جاتی ہے اہمیت عورتوں کی اس بری عادت میں اسی لیے پیدا ہوگئی ہے، کہ قانونِ قدرت کو بجائے قدرت کے گویا اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ مگر عصر حاضر کے رجائی دعوے یا اسی نوعیت کے دوسرے بے سروپا بڑے بولوں کا مطلب وہاں تحلیل و تجزیہ کے بعد خود سوچیے کہ اس میں اور مذکورہ بالا نسوانی کمزوری کے مآل و حاصل میں کوئی زیادہ فرق ہے؟۔

د۔ یہ ضمیر کا نشس یا اخلاقی حاسہ وغیرہ جس جس کا کچھ نہ کچھ سراغ عہد حاضر کے بے بصیرتوں کو بھی انسانی فطرت میں کسی نہ کسی رنگ میں مل رہا ہے، درحقیقت فطرت انسانی کے اسی جذبہ کی یہ ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور ناقص تعبیر میں قرآن نے جس کا پتہ ''الامانۃ'' کے لفظ سے دیا ہے، بتایا گیا ہے کہ آدمی کی فطرت میں ''الامانۃ'' کی کیل اگر نہ ٹھونک دی جاتی تو عملاً الانسان صرف ظالم نہیں بلکہ ظلوم (بہت بڑا ظالم) اور علما جاہل نہیں بلکہ جہول (بہت بڑا جاہل) بن کر رہ جاتا۔ یہ گفتگو قرآنی آیت ﴿انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا﴾ (الاحزاب/۷۲) کے

Marfat.com

متعلق ہے (از محقق) اس الامانۃ کے جذبہ کا مطلب یہی ہے کہ جن چیزوں پر آدمی کو اقتدار بخشا گیا ہے اس اقتدار و اختیار کے استعمال میں اسے اپنی مرضی کی نہیں بلکہ اس کی مرضی کی پابندی کرنی چاہیے جس نے بہ امانت اسے یہ اقتدار عطا فرمایا ہے کہ اپنے اقتدار و اختیار کے استعمال میں اپنی مرضی کے پابند نہیں، اس کا اقرار تو یہ ضمیر والے بھی کرتے اور سمجھتے ہیں کہ جو جی میں آئے کر گذریں۔ اس قسم کا مطلق العنان اختیار ہمیں نہیں ملا ہے، مگر الامانت کے اقتضاء کی صرف منفی یافت ہے آگے سوال ہوتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جب اپنے اقتدار کے استعمال میں ہم آزاد بن کر پیدا نہیں ہوئے تو پھر کس کی مرضی کی پابندی کریں اور مثبت اور ایجابی پہلو کا عصری مفکرین کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، حالانکہ فطرتِ انسانی کی یہی پیاس آدمی کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ جس کا وہ امین ہے اس کی مرضی کو دریافت کرے، اسی کے بعد نبوت اور وحی کے پانی کی تلاش پیدا ہوتی ہے ورنہ فرض کی پابندی فرض عائد کرنے والے کے بغیر مہمل بات ہے۔

ھ۔ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چاہو تو غیب کا یہ نظارہ تمہارے سامنے بھی آجائے، مؤمنہ خاتون نے جواب میں عرض کیا کہ آپ کے دیکھنے کے بعد اس کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ میں بھی اس کو دیکھوں (او کما قالت)

و۔ مغربی شاعر کا تخلص ہے فرماتے ہیں کہ دوست کو دیکھنا چاہتے ہو تو مغربی سے نگاہ قرض لے لو، کیونکہ دوست کے کمالات کا مشاہدہ کامل ہی کی نگاہ سے تم کر سکتے ہو۔

ز۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ مقدمہ میں مقتول کے وارثوں کو اسلام نے اختیار دیا ہے، چاہیں تو قاتل کو قتل کر کے اپنے دل کی تسکین انتقام سے حاصل کریں اور چاہیں تو بجائے قتل کے خاندان کی ایک کرنے والی قوت کے گھٹ جانے سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی نقصان کی تلافی دیت یعنی خون بہا لے کر کر لیں۔

ح۔ مطلب آنحضرت ﷺ کا جیسا کہ بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھا کہ زمین پر وہ رہیں گے اور زمین کسی کے چلنے پھرنے سے یا اٹھنے بیٹھنے سے ناپاک نہیں ہوتی، یہ تو خدا کا بچھایا ہوا فرش ہے، سب ہی کو اس پر چلنے پھرنے کا حق ہے۔ طائف کے اس وفد سے پہلے نجران کے عیسائیوں کو بھی مسجد میں اتارا گیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ان ہی رواداریوں میں اس کے دائرہ کی وسعت کا بڑا راز پوشیدہ تھا۔ جن ادیان و مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے ادیان

Marfat.com

و مذاہب کو صرف اپنی بلندی اور برتری کا ذریعہ بنا رکھا ہے، قوموں کے قلوب میں بغض و عداوت کا ان کی طرف سے پیدا ہو جانا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ بھلا یہودیوں کی ان خرمغزیوں کو کون برداشت کر سکتا تھا، جب وہ کہتے تھے کہ ہم تو خدا کے بیٹے اور خدا کے محبوب ہیں، یا بعض دوسرے ادیان و مذاہب والوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے متعلق اس قسم کے قوانین بنا رکھے تھے کہ ان کے مذہب کی کتاب کا کوئی فقرہ اس کے کان میں اگر اتفاقاً چلا جائے تو کان ہی سے نہیں بلکہ جان سے بھی ہاتھ اس کو دھونا پڑے گا۔ پچھتر قدم کا فاصلہ کم از کم پاکوں اور ناپاکوں میں باقی رہے اس لیے مجبور کیا جاتا تھا کہ ناپاک جو سمجھے جاتے ہیں، وہ راستہ چلتے ہوئے ہاتھ سے ڈگڈگی بھی بجاتے جائیں۔ قرآن میں اس کے برخلاف حکم دیا گیا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی خواہ مشرک ہی کیوں ہو قرآن سننا چاہے تو اس کو خدا کا کلام سنایا جائے۔ مسجدوں میں ٹھہرانے کی غرض بھی رسول اللہ کی یہی تھی کہ اسلام کے مشاہدے اور تجربہ کا لوگوں کو موقع ملے۔ یہی طائف والے کہاں تو اتنے سخت تھے، کہتے تھے کہ ہم اپنے سر بتوں کو اس طرح اٹھا بٹھا نہیں سکتے، جیسے تم لوگ رکوع اور سجدے میں کرتے ہو، مگر مسلمانوں کی نمازوں کی دل کشی نے دیکھنے کے بعد ان پر اتنا اثر کیا کہ واپسی سے پہلے وہ مسلمان ہو گئے۔ شمس الائمہ سرخسی نے شرح کبیر میں لکھا ہے کہ غیر مسلم رعایا کے لیے اسلامی حکومت نے سہاوات کا جو قانون نافذ کیا ہے، اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ

"وربما یرون محاسن الشریعة و یسلمون فکان هذا فی معنی الدعا بارفق الطریقین"

(شرح السیر الکبیر، ۲/۲۵۰، السرخسی محمد بن احمد، حیدرآباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ)

"یعنی اس ذریعہ سے ان کو اسلامی شریعت کی خوبیوں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور اسلام قبول کر لیتے ہیں گویا اسلامی دعوت کی یہ ایک نرم ترین راہ ہے"۔

ابن بطال کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے کہ قرآن و علم و حدیث وغیرہ فقہ کی تعلیم نہ صرف اسلامی قلم رو کے مسلم باشندوں بلکہ ان کے سوا دوسرے غیر مسلموں کو دینا چاہیے، یہ ابوحنیفہ و شافعی کا مقولہ ہے۔ (التراتیب الاداریۃ، ۲/۲۹۳، الکتانی، عبدالحی، بیروت، ناشر، حسن جعنا، س ن)

ط۔ غیر مسلم اقوام کے پڑوسیوں کے ساتھ مسلمانوں کے وہی تعلقات جنہیں عہد حاضر کا مسلمان پڑھتا ہے اور دل ہی دل میں دنیا کی ان ہی غیر مسلم اقوام کی موجودہ نسلوں کو خطاب کر کے کہتا ہے

Marfat.com

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

یہی یہودی قوم جس کے ایک فرد کی عیادت کے لیے رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے، سینکڑوں سال تک ان کی پناہ گاہ مسلمانوں کے ممالک رہے جس کا کچھ ذکر آگے بھی آرہا ہے لیکن ان کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہے، دنیا دیکھ رہی ہے، یورپ سویا ہوا تھا، ہم نے اس کو جگایا، جاگنے کے ساتھ ہمارے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور میں کس کس کا ذکر کروں، قوموں کو سوچنا چاہیے کہ آخر شرافت کیا اسی کا نام ہے، انسانیت اسی کو سمجھتے ہو۔

ی۔ کسی کو بلاوجہ افعال شنیعہ کے ساتھ متہم کرنا اور اس کی آبروریزی کی تعبیر ''قذف'' کے لفظ سے کی جاتی ہے، جس کی سزا اسی کوڑے مقرر ہیں اور ایسا آدمی مردود الشہادۃ عدالت سے قرار دیا جاتا ہے۔

ک۔ تفصیل تو اس کی سورہ کہف کی آیت فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم (الکہف/۶) کے لفظ کی تفسیر میں دیکھیے، یعنی خدا کے متعلق ولدیت کا عقیدہ جن آثار کو چھوڑ کر جائے گا ان کو خوب سوچ کر آنحضرت ﷺ کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو کیا آپ ہلاک کردیں گے۔ خاکسار کے نزدیک مسیحی دین کی تاریخ کی طرف آثارھم کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے کلیسا کا نظام کیسے پیدا ہوا، پوپ غیر معمولی اقتدار کا مالک سارے مسیحی ممالک میں ہوگیا اور کلیسا کی طاغوتی طاقت کی پشت پناہی میں دین مسیحی کے نمائندوں نے جو مظالم ڈھائے اسی کے ردعمل نے الحاد اور بے دینی کے اس دور کو پیدا کیا۔

ل۔ سیوطی نے بیہقی کی شعب الایمان اور ابن مردویہ کی تفسیر کے حوالہ سے روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے ان ہی میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن عنبسہ نے کہا سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من کان بینہ بین قوم عھد فلا یشدعقدۃ ولا یحلھا بکل حتی ینقضی امرھا او ینبذالیھم علی سواء یعنی جب کسی سے معاہدہ کیا جائے تو معاہدے کے بعد نہ کوئی گرہ بندھ سکتی ہے اور نہ کھل سکتی ہے جب تک کہ مدت معاہدے کی پوری نہ ہو جائے اور معاہدے کے فریق کے ساتھ منابذہ علی السواء کا معاہدہ نہ کیا جائے اسی منابذہ علی السواء کا وہ معاملہ کیا جائے جسے میں نے درج کیا ہے (دیکھیے الدر المنثور، ۳/۳۴۸، سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۱۱ھ)

Marfat.com

م۔ قرآنی آیت لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ (النجم/۳۸) کوامام اوزاعی نے مراسلہ میں نقل کیا تھا میں نے اسی کا ترجمہ کردیا ہے،

ن۔ آنحضرت ﷺ کے آخری الفاظ کے متعلق روایتوں میں بظاہر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے بعضوں میں ہے کہ اللھم بالرفیق الاعلیٰ آخری الفاظ تھے، بعضوں میں الصلوۃ وما ملکت ایمانکم ان لوگوں کا خیال رکھنا جن کے تم مالک ہو یعنی غلاموں کا خیال رکھنا، اور بعض روایتوں میں وہی ہے کہ غیر مسلم کی مذکورۂ بالا ذمہ داری کی نگرانی وحفاظت کی طرف توجہ دلائی، مگر بہ ظاہر اختلاف اس کو میں اس لیے قرار دیتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے متعلق آخری بات بالرفیق الاعلیٰ کی تھی، مسلمانوں کے ساتھ خصوصی وصیت نماز اور غلاموں کی تھی اور سارے جہان کی رحمت نے غیر مسلم اقوام کے متعلق جو آخری گفتگو فرمائی وہ مذکورہ الفاظ ہیں۔ (حضور علیہ السلام کے آخری الفاظ کے لیے ملاحظہ ہو)، (طبقات ابن سعد، ۲/۷۸۔۳۷۶، ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء) (از محقق)

س۔ دراصل قبرس (سائپرس) کا یہ جزیرہ بحرِ روم کے جزائر میں کلیدی جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے، قسطنطنیہ کی رومی حکومت ہمیشہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو عیسائی تھے، ساز باز کرنے کے لیے جوڑ توڑ کرتی رہتی تھی۔ اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی حکومت کو اس جزیرے کے غیر مسلم باشندوں سے شکایت پیدا ہو جاتی تھی، شکایتوں کا یہ سلسلہ زمانہ تک جاری رہا، لیکن ایک دفعہ نہیں بارہا یہ صورتیں پیش آئیں کہ رومیوں کی پشت پناہی اور ان کی سراغ رسانی کے جرائم کا علم جزیرے کے عیسائیوں کے متعلق مسلمانوں کی حکومت کو ہوا حکومت تشدد پر آمادہ ہوئی لیکن مسلمانوں کا دین آڑے آتا رہا اور ان کو بچاتا رہا، تفصیل کے لیے طبری ابن اثیر وغیرہ پڑھیے۔

ع۔ امام مالکؒ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں" سچ کی حمایت اس لیے کرنی چاہیے کہ وہ سچ ہے" اس قسم کے جھوٹ کے سمجھنے کی صلاحیت کم از کم مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی۔ ہم تو سچ کی حمایت اس لیے کرتے ہیں کہ سب سے بڑی قوت والا خدا سچ کی حمایت کرنے والوں کا حامی بن جاتا ہے۔ امام مالک نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے باقی اس کے سوا جو کچھ بھی ہے صرف لفظی مغالطے اور تعبیری منہ زوریوں سے زیادہ اس کی کچھ وقعت نہیں۔ (فتوح البلدان، ص ۱۵۶، البلاذری، احمد بن یحییٰ، برل، ۱۸۶۶ء)

Marfat.com

ف۔ بنی تغلب کے عیسائیوں کی پوزیشن کی تفصیل میری کتاب امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی میں مل سکتی ہے۔

ص۔ ابراہیم نے پھر یورپ کے باشندوں کے قتل کا حکم دیا جو ترکی علاقوں میں تھے لیکن اس حکم کی تعمیل بھی نہ ہو سکی۔ آخر میں صرف یورپین حکومتوں کے سفراء گرفتار کر لیے گئے اور ان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا کہ حکومت ترکی کی یہ رسوائی تم لوگوں نے اور تمہاری حکومتوں نے کیسے برداشت کی۔ ان میں انگلستان، ہالینڈ، وینس، وغیرہ کے سفراء سب ہی شریک تھے، غیروں نے جواب دیا کہ مالٹا کے ان لٹیروں پر ہماری حکومتوں کو کسی قسم کا اقتدار نہیں ہے۔ البتہ فرانس کی حکومت چاہتی تو ان کو روک سکتی تھی، ابراہیم نے ان کو تو چھوڑ دیا، اور حکم دیا کہ فرانس پر چڑھائی کا انتظام کیا جائے مگر وزراء نے کریٹ کی فتح کی طرف سلطان کو متوجہ کر کے اس ارادہ کو ملتوی کرایا۔ (تعلیقات شکیب ارسلان بر مقدمہ ابن خلدون، ۲/۲۴۸، شکیب ارسلان، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء)

ق۔ عیسائی سلطنتوں نے اپنی کل رعایا کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا اور یوں متحد مذہب والی قومیں بنالیں۔ ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم نے اپنی سیرت میں ایشا ٹک کوارٹرلی ری ویو سے یہ شہادت نقل کی ہے۔ دیکھو ان کی کتاب النبی والاسلام۔ (مکمل شہادت کے لیے ملاحظہ ہو، النبی والاسلام، ۲۲۲۔۲۲۱، عبدالحکیم، ڈاکٹر، انبالہ بلالی اسٹیم پریس، ۱۹۱۵ء)۔ خود ہندوستان میں بودھ مذہب کو اسی لیے ناپید کیا گیا مگر اسی زمانہ سے ہندوستان صدیوں کی غلامی میں مبتلا ہو گیا۔

ر۔ البلاذری نے لکھا ہے کہ امیر معاویہ اور یزید پھر مروان بنی امیہ کے ان حکمرانوں کے زمانہ تک اسلامی علاقہ کے سارے سرکاری دفاتر حضرت عمرؓ کے زمانہ سے رومی زبان اور خط ہی میں رہے۔ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں دفتر کے ایک رومی صیغہ دار کے متعلق عبدالملک تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ دوات میں پانی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ رومی صیغہ دار نے بجائے پانی کے اس میں پیشاب کر دیا، مقدمہ کی تحقیقات کی گئی اور مجرم کو سزا ہوئی۔ اسی کے بعد عبدالملک نے سلیمان ابن سعد کو بلا کر حکم دیا کہ دفتر کو عربی زبان میں منتقل کر دیا جائے، سال بھی پورا ہونے نہ پایا کہ رومی علاقے کے سارے دفاتر کی زبان عربی ہو گئی۔ (فتوح البلدان، ص ۱۹۴) مگر لطف یہ ہے کہ ایرانی علاقے میں دفتر کی زبان پھر بھی فارسی ہی باقی رہی۔ آخر حجاج کے زمانہ میں صالح بن

Marfat.com

عبدالرحمٰن نے اس کو بھی عربی میں منتقل کیا۔ (فتوح البلدان، ص ۳۰۸) یہی حال سکے کا بھی نظر آتا ہے۔ بظاہر باضابطہ ٹکسال بھی عبدالملک ہی کے زمانہ میں قائم ہوئی۔ قصہ جس کا طویل ہے، مصری کپڑوں پر رومی زبان میں خاص قسم کا طغرا بنتا تھا، عبدالملک نے منع کر دیا اور عربی میں طغرے کا لکھنے کا حکم دیا۔ قسطنطنیہ کے قیصر کو جب اس کی خبر ملی تو عبدالملک کو اس نے خط لکھا کہ سکہ تو تمہارے ملک میں ہمارے ہاں کا چلتا ہے ہم ہر سکہ پر تمہارے پیغمبر کے نام گالیاں چھاپنے کا حکم دے دیں گے خط کو پڑھ کر عبدالملک بہت پریشان ہوا لکھا ہے کہ گھبراہٹ میں ٹہلتا اور کہتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو اسلام میں مجھ سے زیادہ بدبخت آدمی گویا پیدا نہ ہوا کہ پیغمبر کی اسی اہانت اس کی وجہ سے ہوئی پھر لوگوں نے مشورہ دیا کہ دارالضرب خود قائم کر دیجیے، یہی کیا گیا۔

(علم الدین، ص ۵۲۵، تلاش بسیار کے بعد بھی یہ کتاب میسر نہیں آئی، البتہ اسلامی سکے کی تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو،

۱۔ الکامل، ۳/۴۵۲۔۴۵۳، ابن اثیر، مبارک بن محمد، بیروت، دارالکتاب العربی، ۱۴۲۰ھ

۲۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۶۱، ابن خلدون، عبدالرحمٰن ابن خلدون، بیروت، موسسۃ الاعلمی، س ن

۳۔ فوات الوفیات، ۲/۴۰۳، الکتبی، محمد بن شاکر، بیروت، دارصادر، ۱۹۷۳ء،) (از محقق)

ث۔ یہ تبلیغی مکتوب مستحق ہے کہ عربی سے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا جائے کئی مولویوں سے کہا لیکن متوجہ نہ ہوئے۔ خدا نے فرصت دی تو انشاء اللہ خاکسار ہی اس کام کو انجام دے گا۔ یہ طویل خط ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور مسلمان حکمرانوں کی دعوت اسلام کی عمدہ مثال ہے۔ از محقق

(عصر المامون، ۲/۲۳۶۔۱۸۸، رفاعی، احمد فرید، الدکتور، قاہرہ، دارالکتب المصریہ، ۱۹۲۷ء)

ت۔ دیکھو کتاب الفہرست لابن ندیم، ص ۳۳۸، ابن ندیم، مصر، المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۳۴۸ھ) مامون عموماً اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق جو محض دنیا کے لالچ میں مسلمان ہو گئے ہیں، شدید نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا، کہتا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں منافقین کا جو حال تھا مجھے تو کچھ اسی قسم کا حال ان لوگوں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ پھر جیسے آنحضرت ﷺ نے منافقین کے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیا تھا میں بھی دنیا کے لالچ سے مسلمان ہونے والوں کے مقابلہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

Marfat.com

ث۔ تھوڑا بہت مواد اس سلسلہ میں آپ کو آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام میں بھی مل سکتا ہے۔ خصوصاً صلاح الدین ایوبی، فیروز تغلق وغیرہ سلاطین کی تبلیغی دلچسپیوں کی تاریخی شہادتیں جو اس نے پیش کی ہیں لیکن مطالعہ سے چاہا جائے تو ایک کافی ضخیم کتاب اس سلسلہ میں لکھی جا سکتی ہے۔

خ۔ عثمان بن حنیف کا یہ بیان اگر صحیح ہے اور ان کا بیان اگر صحیح نہ ہوگا تو کس کا ہوگا، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں خلفاء کے زمانہ میں حکومت کے ذمہ دارانہ خدمات آپ کے سپرد رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی ہیں۔ بہر حال آپ کے اس بیان کا مطلب یہی ہوا کہ پیداوار کا دو تہائی حصہ کاشتکاروں کو دے دیا گیا تھا اور ایک تہائی حصہ حکومت کے لیے لیا گیا۔ ایک طرف اس واقعہ کو رکھیے اور اسی ارض سواد جو ایرانیوں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی تھی اسی کے متعلق شاہ ولی اللہؒ کی اس توجیہ کو بھی پیش نظر رکھیے وہ فرماتے ہیں ان کی عربی عبارت کا ترجمہ ازالۃ الخلفاء سے کر رہا ہوں۔

''میرے نزدیک حضرت عمرؓ کے اس عمل کی توجیہ (یعنی بعض صحابیوں نے خیال ظاہر کیا تھا) کہ عراق کے اس زرعی علاقہ کو جاگیر بنا کر ان لوگوں کے حوالہ کر دیا جائے جنہوں نے اس علاقہ کو فتح کیا ہے۔ مگر حضرت عمرؓ اور آپ کے ساتھ حضرت عثمان و علی، طلحہ نیز انصار کے بھی سربرآوردہ حضرات تھے ان سب کی رائے یہ تھی کہ ان مفتوحہ علاقوں کو قومی ملک بنا کر خالصہ کر لیا جائے یعنی حکومت ان پر قبضہ کر لے اور انفرادی جاگیروں کی شکل میں ان کو تقسیم نہ کیا جائے۔ بہر حال شاہ صاحب حضرت عمر کے فعل کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایران اور روم کے لوگوں نے زمین کے حقیقی مالکوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا اور ان سے وہ لگان وصول کیا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ جاگیردار نہ زمین کے مالک تھے، نہ اس کی کاشت کرتے تھے اور نہ اپنے آباء اجداد سے وراثت میں یہ زمین ان کو ملی تھی۔ مسلمانوں نے ان پر زبردستی غاصبانہ قبضہ کرنے والے جاگیرداروں سے جنگ کی اور شام و عراق کی زرعی زمینوں سے ان کو مار بھگایا، اب زمین تھی اور زمین کے حقیقی مالک یعنی کسانوں کی وہ جماعت رہ گئی تھی جو اس میں زراعت کرتی تھی اور اسی علاقہ میں توطن پذیر تھی۔ ان کے باپ داداؤں سے یونہی وراثۃً یہ علاقہ منتقل ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا۔ جب مسلمانوں نے روم و ایران کے زبردستی قبضہ کرنے والے جاگیرداروں کو مار بھگایا تو

ان کسانوں کی اکثریت نے مسلمانوں سے صلح کر لی اور لگان یعنی خراج ادا کرنے پر راضی ہو گئے لیکن ان کسانوں میں کچھ لوگ روم اور ایران کا ساتھ دے کر مسلمانوں سے لڑے بھی تھے دراصل اسی چیز نے ان زرعی علاقوں کے مسئلہ میں اشتباہ پیدا کر دیا۔ عوام نے تو یہ سمجھا کہ بزور شمشیر ان زمینوں کو ہم نے فتح کیا ہے۔ لیکن خواص صحابہ جانتے تھے کہ جنگ ان کسانوں (علوج) سے نہ تھی بلکہ ان جاگیرداروں سے تھی جنہوں نے زبردستی ان زمینوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور نہ زمین کے جو واقعی مالک اور کاشتکار تھے ان کی اکثریت نے تو مسلمانوں کی حکومت سے صلح کر لی تھی اس لیے اس کا حکم فئی کا ہوا۔ (ازالۃ الخفاء، (مترجم)، ۳/۴۸۵، شاہ ولی اللہ، احمد بن عبدالرحیم، مترجم مولانا محمد اشتیاق، کراچی قدمی کتب خانہ، س، ن)

آگے شاہ صاحب نے فئی وغیرہ کی قانونی بحث کی ہے۔ میری غرض اس عبارت کے پیش کرنے سے یہ تھی کہ عثمان بن حنیفؓ کی رپورٹ یعنی ایک تھالی لگان میں لی گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کا یہ خیال کہ رومی و ایرانی جاگیرداروں کو مار بھگا کر زمین کے اصل کاشتکاروں اور مالکوں کے حوالہ مسلمانوں نے ان زمینوں کو کر دیا ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ آج غریب کسانوں کے جن حقوق کا ماتم کیا جا رہا ہے ان حقوق کو عملاً اسلام تیرہ صدی پہلے کسانوں تک پہنچا چکا تھا۔ میں تو نہیں جانتا کہ لگان کے مسئلہ میں اتنی فیاضی کسانوں کے ساتھ کسی زمانہ میں بھی کی گئی ہو۔ اشتراکی حکومتوں کے متعلق اگرچہ دعویٰ یہی کیا جاتا ہے کہ کسانوں و مزدوروں کے فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوتی ہیں لیکن کسانوں کی ساری کمائی پر قوم کے نام سے حکومت کے وہ نمائندے قبضہ کر لیتے ہیں جن کے ہاتھ میں حکومت ہوتی ہے اور غریب کسانوں کو یتیم خانوں کے یتیموں کی طرح صرف کھانا کپڑا اور لابدی ضروریات پر قناعت کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔

ف۔ قاضی ابو یوسف ہی نے اسی عیسائی سوداگر کے متعلق یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ کچھ دن بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے آپ کے امین کر درگیری زیاد کے متعلق رپورٹ کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی تو وہی بوڑھا حنفی (الشیخ الحنیفی) ہوں جس نے تیری ضرورت پوری کی تھی۔ (کتاب الخراج، ص ۷۹، ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، مصر، مطبع میریہ، ۱۳۱۲ھ)

Marfat.com

الحسنیٰ سے مطلب حضرت عمرؓ کا وہی تھا کہ ابراہیم حنیف کی ملت کا پیرو ہوں جس کی پیروی کی قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے۔

ض۔ پرنچنگ آف اسلام کے حاشیہ سے میں نے مذکورۂ بالا یادداشت نقل کی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے کل پانچ سال پہلے ''جس ٹی نین'' قیصر روم کی وفات ہوئی تھی۔

ظ۔ عراق کے ایک قدیم قصبہ کا یہ نام ہے۔ کہتے ہیں کہ بعد کو اسی آبادی کا نام ''عکبرا'' مشہور ہوا۔ بغداد سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

غ۔ خود کعبہ کی عبادت گاہ جو تین چار صدیوں سے مخلوقات کی پوجا پاٹ کا مرکز بن گئی تھی، اللہ کے آخری رسول ﷺ نے خالق کی عبادت کے اس پہلے گھر کا تعلق پھر خالق ہی سے قائم کر دینے میں جو کامیابی حاصل کی، تو اس وقت بھی اس کے سوا اور کیا کیا کہ مخلوقات کے پوجنے والوں کو خالق کا پرستار بنا لیا گیا، ان ہی نے بجائے مخلوقات کے کعبہ کو خالق کی عبادت کا مرکزی مقام بنا دیا۔ مسلمانوں پر بعض عبادت گاہوں کی علامتوں کی بنیاد پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ زبردستی دوسری قوموں کی عبادت گاہوں کو انہوں نے مسجد بنا لیا تھا، ممکن ہے کہ بعض ناواقف مسلمانوں نے دین کے احکام سے جہالت کی وجہ سے کبھی ایسا کیا ہو، لیکن جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے، یہی معلوم ہوا کہ کعبہ کے ساتھ جو صورت پیش آئی یہی صورت عموماً ان عبادت گاہوں کی بھی ہے، یعنی وہی لوگ جو مخلوقات کی عبادت ان مکانوں میں کرتے تھے، خالق کی عبادت ان میں کرنے لگے۔

الف، الف۔ البلاذری نے لکھا ہے کہ قتیبہ نے سمرقند میں جن مسلمانوں کو آباد کیا تھا، ان ہی میں ضحاک بن مزاحم بھی تھے۔ (فتوح البلدان، ص ۴۲۷) اور ضحاک بن مزاحم کے متعلق اس واقعہ کا ذکر تو تقریباً اکثر مؤرخین نے کیا ہے کہ ان کے مکتب خانوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد تین ہزار تھی، خچر پر سوار ہو کر طلبہ میں وہ گشت کرتے تھے مگر حوالہ اس وقت محفوظ نہ رہا کسی مستند کتاب میں میں نے پڑھا ہے کہ تین ہزار طلبہ کے سوا پانچ سو طالبات یعنی تعلیم پانے والی بچیوں کی بھی تھی بہرحال پہلی صدی ہجری کے وسطانی عہد کا تھا۔

ب، ب۔ دمشق کے گرجا یوحنا یا ماریحنا کے متعلق جیسے یہ صورت پیش آئی کہ عیسائیوں کی خواہ

Marfat.com

دھمکی نے ولید کو آپے سے باہر کر دیا۔ (فتوح البلدان، ص ۱۲۵) البلاذری نے لکھا ہے کہ سمرقند میں بھی لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کے متعلق بھی قتیبہ کو یہی دھمکی دی گئی کہ جوان کو ہاتھ لگائے گا تباہ ہو جائے گا۔ قتیبہ نے کہتے ہیں کہ ان کو جلا کر دکھا دیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ (فتوح البلدان، ص ۴۲۸) میری غرض یہ ہے کہ دوسری قوموں کی عبادت گاہوں یا معبودوں کے متعلق جاہل مسلمانوں کی طرف سے ایسی غیر ائینی مشکلیں اگر پیش آئی ہیں تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قسم کے غلط دعوؤں نے خواہ مخواہ کی ضد پیدا کر کے نا واقفوں کو اس پر آمادہ کیا، ورنہ برا بھلا کہنے کی ممانعت غیر اقوام کے معبودوں کی قرآن میں جب کی گئی ہے تو توڑنے پھوڑنے پر وہ کیسے راضی ہو سکتا ہے۔

ج، ج۔ حالانکہ ان بے چاروں کو یہ معلوم نہیں کہ صحابہ تک کے عہد میں کاتب کا عہدہ غیر مسلموں کو دیا جاتا تھا، ابو موسیٰ اشعریؓ کا کاتب سیکرٹری عیسائی تھا۔ حضرت معاویہؓ کا سیکرٹری بھی سرجون عیسائی ہی تھا۔ مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ عبدالملک مروانی سے پہلے دفاتر کی زبان رومی و ایرانی تھی، ظاہر ہے کہ بجز عیسائیوں اور پارسیوں کے بے چارے عرب ان دفاتر میں کیسے کام کر سکتے تھے۔ اگر ملازمت سے ان کو روکا گیا تو دین کی وجہ سے نہیں بلکہ رشوت کی بد عادت کی وجہ سے۔

د، د۔ قرون وسطی کی شخصی حکومت کے زمانہ میں ایک ایرانی دیسکھ حکومت کے صحیح نصب العین کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے، اسی کو کتخدائیت کا کمال قرار دیتا ہے، لیکن بیسویں صدی کی روشنی والے زمانے میں حکومت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ پچاس آدمی جس جماعت میں شریک ہیں ان کے ساتھ (۵۱) افراد پر مشتمل جماعت جو کچھ چاہے کر سکتی ہے۔

ھ، ھ۔ اس سلسلہ میں بلا وجہ غریب عالمگیر کو زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا جواب مستقل مقالات اور کتابوں کے ذریعہ سے لوگ دے چکے ہیں، آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر انا راللہ برہانہ کے متعلق ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ عالگیر کے پاس کسی نے یہ عرض پیش کی کہ دفتر حسابات میں جو پارسی ملازم ہیں ان کو برخاست کر دیا جائے اس لیے کہ وہ آتش پرست ہیں، جواب میں عالمگیر نے سختی کے ساتھ لکھا کہ یہ درخواست بیہودہ ہے اور آخر میں بادشاہ نے ارقام فرمایا تھا کہ

Marfat.com

سلطنت کا یہی دستور العمل ہوتا تو چاہیے تھا کہ ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیا جاتا۔ (اشاعتِ اسلام، ص ۲۵۹، آرنلڈ، ڈی ڈبلیو، مترجم، شیخ عنایت اللہ لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء)

و،و۔ اسی پادری کی ایک تقریر کا آرنلڈ نے حاشیہ میں تذکرہ کیا ہے، ترکوں کا ذکر کرتے ہوئے وہی لکھتا ہے کہ ترک جسم کو ایذا نہیں دیتے بلکہ پرہیزگاری کے بھیس میں ظاہرا طریق پر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اپنے شیطانی فریب سے وہ روح کو جو جسم کے اندر ہے، اس کا ایمان لے کر تلف کر دیتے ہیں۔ (اشاعتِ اسلام، (حاشیہ)، ص ۱۷۵)

ایک انگریز سیاح سلیڈن نامی نے تو مسلمانوں کی حکومت پر بھی تنقید نما طعن کیا ہے کہ

''وہ حد سے زیادہ دوسرے مذاہب کو آزادی دیتی ہے'' (النبی والاسلام، ص ۱۰۸)

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ زمانے تک اسلام کے جبر و اکرہ کا ڈھنڈھورا پیٹا گیا لیکن اب لہجہ بدل کر اسلام کی غیر معمولی نرمی کو تیر ملامت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اسی یورپ کی طرف سے مطالبہ تھا کہ مذہب کو عقلی معیار پر پورا اترنا چاہیے لیکن کچھ لوگ یورپ ہی میں اب کہنے لگے ہیں وہ مذہب ہی کیا ہوا جو عقل میں سما جائے۔

ز،ز۔ آل حمدان کی اصطلاح سے اسلامی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے ناواقف نہ ہوں گے، خلافت بغداد کی مرکزیت جب ختم ہوئی تو اطراف و جوانب میں چھوٹے بڑے حکمرانوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں ان ہی میں ایک آل حمدان والے بھی تھے۔ سیف الدولہ جس کا نام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن حمدان بن حمدون التغلبی الربعی تھا اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔ حلب کو اس نے دار السلطنت قرار دیا تھا۔ مصر کی اخشیدی حکومت اور قسطنطنیہ کی رومی حکومت سے برسرپیکار رہتا تھا، مشہور شاعر متنبی نے اس کی بھی دربار داری ایک زمانہ تک کی تھی، تفصیلات کے لیے عام تاریخی کتابیں دیکھیے۔ ۳۵۶ھ میں سیف الدولہ نے وفات پائی۔

ح،ح۔ اسی موقع پر آرنلڈ کی کتاب کے ان حواشی کا پڑھنا بھی مفید ہوگا جن میں مختلف سیاحوں اور مصنفین کی کتابوں سے اس نے نقل کیا ہے کہ ترکوں کی حکومت کا یہ وہ زمانہ تھا جس میں عیسائیوں سے زیادہ ترکی سلطنت میں مسلمان بیچارے مصیبتوں کے شکار تھے۔ لکھا ہے کہ مسلمانوں کا افلاس عیسایوں کے افلاس سے اتنا بڑھا ہوا ہے کہ ان مسلمانوں کو دیکھ کر سیاحوں کو رحم آتا ہے۔ یہ اور

Marfat.com

اسی قسم کی باتوں کا بے دینی کے عہد میں پیدا ہو جانا تعجب خیز نہیں ہے۔(اشاعتِ اسلام، ص ۱۶۷)

لیکن بقول امیر شکیب ارسلان آج یورپ کی ذہنیت اسلامی حکومتوں کے متعلق یہ جان کر کہ اسلام کی دینی حکومت میں عیسائیوں کو ہر قسم کے حقوق سے استفادہ کا موقع بہ سہولت میسر آتا ہے لیکن باوجود اس کے پھر یہ مسلمانوں کی لادینی حکومت ہی پسند بھی کی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لادینی حکومت کے قائم کرنے پر مسلمان حکمرانوں کو آمادہ کیا جائے۔امیر نے یہ لکھنے کے بعد خوب لکھا ہے کہ اسلام کے ساتھ تعصب اور تنگ نظری کی یہ بدترین مثال ہو سکتی ہے جسے انسانی عقل سوچ سکتی ہے۔اسلام کو وہ ناپسند کرتے ہیں خواہ ان کا وہ محافظ ہی کیوں نہ ہو اور اسلام کے زوال کو وہ چاہتے ہیں، خواہ اسلام کے زوال میں خود ان کا زوال بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔(تعلیقات، مقدمہ ابن خلدون، ۲/۱۷۸)

ط، ط۔ بجز اس ایک توجیہ کے جس کا ذکر مخدوم و محترم مولانا عبدالباری الندوی سابق استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ فقیر سے کیا کرتے تھے کہ میں کشمیر میں تھا۔مشہور منکرِ خدا مسٹر ظریف بھی کشمیر آئے ہوئے تھے۔کانپور کی مسجد کا قصہ اسی عرصہ میں چھڑا، مسلمان شہید ہوئے۔مسٹر ظریف کو اس واقعہ سے میں نے متأثر پایہ۔پوچھا کہ جب خدا ہی کے آپ منکر ہیں تو مسلمانوں سے ہمدردی کے کیا معنی؟ مسٹر ظریف جھنجھلا کر بولے کہ واہ کیا میری قومیت بھی مسلمانوں کی نہیں ہے؟

ی، ی۔ مگر جو نہیں جانتے ہیں انہوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ گذشتہ اسلامی سلاطین کی حکومت کا قانون اسلامی قانون نہ تھا۔یہ عجیب وغریب مغالطہ ہے جس میں اچھے پڑھے لکھے لوگ اس وقت تک مبتلا ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ جب تک اسلامی حکومتیں مغربی دول کے سیاسی اثر سے آزاد تھیں، عموماً اسلامی فقہ سارے اسلامی ممالک کا قانون تھا۔مشرق کی حکومتوں میں زیادہ حسنِ قبول اسلامی قوانین کی اس تشریح نے حاصل کیا، جو امام ابوحنیفہ اور ان کے مکتب خیال کی طرف منسوب ہے۔اور مغرب، اندلس وافریقہ وغیرہ میں امام مالک کی فقہ عموماً مروج تھی، انشاء اللہ اس کی پوری تفصیل کتاب ''تدوین فقہ'' میں کی جائے گی۔اگر اس کی تکمیل کا موقع ملا۔امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کے نام سے خاکسار نے جو کتاب لکھی ہے، ابتدائی حالات اس میں بھی مل سکتے ہیں۔مجلہ عثمانیہ میں ایک مقالہ بھی میرا شائع ہوا ہے۔یہی ایک فقرہ کہ سلطان بھی اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ مفتی سے فتویٰ لے لے۔لوگوں کی آنکھوں کے کھولنے کے لیے کافی ہے، کہ یہی

Marfat.com

حال سارے اسلامی سلاطین کا تھا۔

ک،ک۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری تصریحات سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ ہسپتالوں کا موجودہ مغربی نظام مسلمانوں سے یورپ نے سیکھا ہے۔ ہم نے چھوڑ دیا اور انہوں نے اس نظام کو ترقی دی۔ آخر اگر یورپ میں شفا خانوں کا نظام پہلے سے موجود ہوتا، تو مسلمانوں کے شفا خانوں کا ذکر کر کے اپنی قوم کو یہ مصنف عبرت کیوں دلاتا؟

ل،ل۔ اسباب کچھ بھی ہوں لیکن ہندوستان خصوصاً مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا جو سیلاب بے خانماں ہو کر مغربی پنجاب پہنچا لوگوں کو حیرت ہے کہ اتنے بڑے طوفان کو مسلمانوں نے کیسے سنبھال لیا۔ لیکن مسلمانوں میں موروثی طور پر مواسات و ہمدردی کے عناصر جو پائے جاتے ہیں ان کا مقابلہ ان لوگوں کے جذبات سے کرنا صحیح نہ ہوگا جن میں باہم ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو نجس اور ناپاک سمجھتا ہے۔

م،م۔ یہ چین کی شخصی حکومت یا قرونِ وسطیٰ کے تاریک عہد کی ایک تاریخی یادگار ہے۔ کیا جمہوریت کے اس طلائی اور روشن عہد میں لوگ قرونِ وسطیٰ کی شخصی حکومت کے اس فرمان سے کوئی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ کہنا بہت آسان ہے لیکن کر دکھانا واقعات ہی کی روشنی میں ممکن ہے۔ اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق شکایتوں کے اسباب بھی پرانے ہیں اور شکایت کرنیوالے بھی نئے نہیں ہیں لیکن باوجود ان تہمتوں کے چین میں مسلمان بحمد اللہ اس وقت تک موجود ہیں۔

ن،ن۔ یہ سورہ ص کی مشہور آیت ہے، اس سورہ کی ابتداء اس مضمون سے کی گئی ہے کہ بل الذی کفروا فی عزة و شقاق (اسلام کے نہ ماننے والے دراصل، عزت اور چیر پھاڑ کے عارضہ میں گرفتار ہیں) موجود، قومیت کا بھوت قوموں پر جو سوار ہے، حاصل اس کے اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر قوم اپنی عزت و سربلندی و برتری کی مدعی ہے اور یوں بنی آدم کی ایک ہی نسل کو قوموں اور امتوں کی شکل میں چیر پھاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام جس توحید کی دعوت پیش کر رہا تھا، کہتے ہیں کہ کسی دوسری قوم میں یہ بات سنی نہیں گئی۔

س،س۔ یہ پوری روایت کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکی۔ اس لیے دو علیحدہ علیحدہ حوالے دیئے گئے ہیں۔ (از محقق)

Marfat.com

ع،ع۔ مجاہد امام المفسرین سے اوّاب کے قرآنی لفظ کی تشریح میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ابن عمرؓ سے اوّاب کے معنی مجاہد نے پوچھا، ابن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''اوّاب وہ ہے جو تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے حق تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی درخواست کرتا رہے''۔(تفسیر فتح القدیر،۴/۴۶۱،الشوکانی،محمد بن علی،بیروت،داراحیاء التراث العربی،۱۴۱۸ھ)

ف،ف۔ اس موقع پر مناسب ہوگا کہ سورہ کہف کی ان آیتوں کو پیش نظر رکھ لیا جائے جن کے مضامین کی طرف ان فقروں میں اشارہ کیا گیا ہے۔تشریحی ترجمہ ان آیتوں کا یہ ہے یعنی کہف والوں کے قصہ کو بتاتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

''وہ چند نوجوان تھے، جنہوں نے اپنے رب (مالک) کو مان لیا تھا اور ہم نے رہنمائی میں ان کو ترقی عطا کی۔ان کے دلوں کو ہم نے باندھ دیا (مخلوقات کا خوف اسی لیے نکل گیا کہ خالق سے بندھ جانے کے بعد مخلوق کا وزن قدرۃً انسانی قلوب میں باقی نہیں رہتا اور دیکھو! جب نوجوانوں کی یہ ٹولی کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی ہمارا مالک وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ہم اس کے سوا کسی کو نہ پکاریں گے ایسا اگر ہم نے کیا تو راہِ حق سے ہٹ جائیں گے۔ ہماری قوم نے خالق کے سوا مخلوقات کو اپنا معبود اور الٰہ بنا رکھا ہے۔کیوں نہیں اپنے اس فعل کے جواز میں کوئی ایسی کھلی دلیل پیش کرتے جو عقل پر چھا جائے۔اس سے بڑا ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے، جب قوم کے ان لوگوں کو اور جن کو خدا کے سوا یہ پوجتے ہیں تم نے چھوڑ دیا تو آؤ چلو اس غار میں ہم پناہ لیں اپنی رحمت کو خدا وہاں پھیلائے گا اور مرفق (زندگی کی سہولتوں کو تمہارے لیے مہیا کرے گا ان کے رہنے سہنے کے اطمینان بخش نظم کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جسے راہ دکھائے وہ ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکائے تو اس کے لیے تم کوئی راہ دکھانے والا پشت پناہ نہیں پا سکتے ان کا کتا ان کے دروازے پر ہاتھ پھیلائے پڑا تھا ان کو تم دیکھو تو بھاگ کھڑے ہو اور رعب سے تم بھر جاؤ۔(الکہف/۱۸۔۱۳)

حوالہ جات

۱۔ الزمر/۶۷ ۲۔ النوح/۱۳

۳۔ کنز العمال، ۲/۲۷۱، علاء الدین، علی المتقی بن حسام الدین، حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ، ۱۳۱۲ھ

۴۔ کتاب الخراج، ص ۱۴۴، ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، مصر، مطبع میریہ، ۱۳۲۰ھ

۵۔ محولہ بالا ۶۔ محولہ بالا

۷۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۶

۸۔ البنایہ شرح الہدایہ، ۷/۳۶۲، عینی، محمود بن احمد، مکۃ المکرمۃ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۱ھ

۹۔ بحر الرائق، ۲/۲۱۰، ابن نجیم، زین الدین، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ، س ن

۱۰۔ شرح السیر الکبیر، ۳/۱۹۰، السرخسی، احمد بن محمد، حیدرآباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ

۱۱۔ ایضاً، ۳/۲۰۰ ۱۲۔ مریم/۱۹

۱۳۔ الانفال/۶۱ ۱۴۔ الانفال/۶۱

۱۵۔ الانفال/۶۲ ۱۶۔ الانفال/۶۲

۱۷۔ السیرۃ النبویہ، ۳/۳۴۷، ابن ہشام، عبدالملک بن ہشام، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۵ھ

۱۸۔ محولہ بالا

۱۹۔ السیر الکبیر مع الشرح، ۱/۱۸۱ ۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ کتاب الخراج، ص ۷۲ ۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ نصب الرایہ، ۵/۹۰، زیلعی، محمد عبداللہ بن یوسف، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ

۲۴۔ محولہ بالا ۲۵۔ نصب الرایہ، ۵/۹۰-۸۹

۲۶۔ محولہ بالا ۲۷۔ محولہ بالا

۲۸۔ محولہ بالا ۲۹۔ نصب الرایہ، ۴/۵۸۰

۳۰۔ محولہ بالا

۳۱۔ کتاب الآثار، ص ۹۲، الشیبانی، محمد بن الحسن، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن

Marfat.com

۳۲۔ محولہ بالا

۳۳۔ الطبقات الکبریٰ، ۳/۱۷۵، ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء

۳۴۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۲۵، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ

۳۵۔ محولہ بالا ۳۶۔ محولہ بالا ۳۶، الف۔ محولہ بالا

۳۷۔ تاریخ بغداد، ۳/۳۶۸، خطیب بغدادی، احمد بن علی، مصر، مطبع السعادہ، ۱۹۳۱ء

۳۸۔ محولہ بالا ۳۹۔ محولہ بالا

۴۰۔ محولہ بالا ۴۱۔ محولہ بالا

۴۲۔ الدر منثور، ۳/۳۴۸، سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۱۱ھ

۴۳۔ محولہ بالا

۴۴۔ فتوح البلدان، ص ۱۵۶، البلاذری، ابوالعباس، احمد بن یحییٰ، برل، ۱۸۶۶ء

۴۵۔ محولہ بالا ۴۶۔ محولہ بالا

۴۷۔ فتوح البلدان، ص ۱۶۲ ۴۸۔ محولہ بالا

۴۹۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۸، الماوردی، محمد بن حبیب، مصر، مطبعۃ الاتحاد المصری، ۱۳۲۸ھ

۵۰۔ فتوح البلدان، ص ۱۶۲ ۵۱۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔۱۵۵

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۵۵ ۵۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔۱۵۵

۵۴۔ تاریخ بغداد، ۲/۱۷۴ ۵۵۔ محولہ بالا

۵۶۔ محولہ بالا ۵۷۔ محولہ بالا

۵۸۔ محولہ بالا

۵۹۔ تعلیقات مقدمہ ابن خلدون، ۲/۱۷۷، شکیب ارسلان، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۶۰۔ محولہ بالا ۶۱۔ تعلیقات مقدمہ ابن خلدون، ۲/۲۴۸

۶۲۔ محولہ بالا

۶۳۔ تاریخ فرشتہ، ۱/۱۸۷، فرشتہ، محمد بن قاسم، لکھنؤ، نولکشور، س ن

۶۴۔ محولہ بالا ۶۵۔ محولہ بالا

Marfat.com

۶۶۔ الفہرست، ص ۳۳۸، ابن ندیم، محمد بن اسحاق، مصر، المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۳۴۸ھ

۶۷۔ محولہ بالا ۶۸۔ محولہ بالا

۶۹۔ سرو آزاد، ص ۱۶۵ (تلاش بسیار کے بعد بھی کتاب میسر نہیں آئی)

۷۰۔ حاشیہ حاضر العالم الاسلامی (مترجم عربی)، ۱/۱۴۶، Lothrop Stoddard، مترجم، عجاج نویہض، تعلیقات وحواشی، امیر شکیب ارسلان، قاہرہ، المطبعۃ السلفیہ، ۱۳۴۳ھ

۷۱۔ محولہ بالا ۷۲۔ محولہ بالا

۷۳۔ حاضر العالم الاسلامی، ۱/۱۴۷ ۷۴۔ محولہ بالا

۷۵۔ کنز العمال، ۱/۹۹۹ ۷۶۔ محولہ بالا

۷۷۔ محولہ بالا ۷۸۔ کتاب الخراج، ص ۲۱

۷۹۔ محولہ بالا ۸۰۔ محولہ بالا

۸۱۔ فتوح البلدان، ص ۱۵۷ ۸۲۔ کتاب الخراج، ص ۷۹

۸۳۔ محولہ بالا ۸۴۔ فتوح البلدان، ص ۱۳۷

۸۵۔ محولہ بالا ۸۶۔ محولہ بالا

۸۷۔ محولہ بالا ۸۸۔ فتوح البلدان، ص ۱۳۶

۸۹۔ رحمۃ للعالمین، ۳/۱۲، منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن

۹۰۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۰۹۔۱۰۸، آرنلڈ ڈی ڈبلیو، مترجم شیخ عنایت اللہ، لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء

(بوقت تحقیق میسر آنے والا نسخہ بجائے اشاعتِ اسلام کے دعوتِ اسلام کے نام سے موسوم ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کے زیرِ مطالعہ جو نسخہ ہو اس کا عنوان ''اشاعت اسلام'' ہو۔ بہر حال عنوان جو بھی ہو یہ کتاب "Preaching of Islam" ہی کا ترجمہ ہے۔ قاری کی سہولت کے لیے حوالہ جات وحواشی میں نام ''اشاعتِ اسلام'' ہی ذکر کیا گیا ہے)۔ (از محقق)

۹۱۔ The Present Stage of Egypt, p 11، بحوالہ حاشیہ اشاعتِ اسلام ص ۱۰۸،

۹۲۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۰۹ ۹۳۔ کتاب الخراج، ص ۷۲۔۷۱

۹۴۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۵ ۹۵۔ محولہ بالا

۹۶۔ محولہ بالا ۹۷۔ محولہ بالا

۹۸۔ فتوح البلدان، ص ۱۵۹ ۹۹۔ محولہ بالا

۱۰۰۔ فتوح البلدان، ص ۱۲۵ ۱۰۱۔ محولہ بالا

۱۰۲۔ فتوح البلدان، ص ۱۲۶ ۱۰۳۔ فتوح البلدان، ص ۴۲۲

۱۰۴۔ محولہ بالا ۱۰۵۔ محولہ بالا

۱۰۶۔ محولہ بالا ۱۰۷۔ اشاعتِ اسلام، ص ۲۱۲

۱۰۸۔ المسالک والممالک، ص ۱۸۰، ابن حوقل، محمد بن حوقل، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۴ھ

۱۰۹۔ مروج الذہب، ۸۶/۴، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع احمد الحلمی، ۱۳۰۳ھ

۱۱۰۔ اشاعتِ اسلام، ص ۲۱۲

۱۱۱۔ تاریخ دمشق، ۳۷/۳، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ

۱۱۲۔ الطبقات الکبریٰ، ۱۹۳/۵ ۱۱۳۔ ایضاً، ۱۸۹/۵

۱۱۴۔ ایضاً، ۱۷۲/۵ ۱۱۵۔ ایضاً، ۱۷۲/۵

۱۱۶۔ ایضاً، ۱۶۸/۵ ۱۱۷۔ ایضاً، ۲۰۳/۵

۱۱۸۔ ایضاً، ۲۰۳/۵ ۱۱۹۔ ایضاً، ۱۷۴/۵

۱۲۰۔ ایضاً، ۱۶۹/۵ ۱۲۱۔ تاریخ دمشق، ۴۶۰/۲

۱۲۲۔ اشاعت اسلام، ص ۲۱۲ ۱۲۳۔ ایضاً، ص ۲۶۰

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳ ۱۲۵۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۷۸

۱۲۶۔ محولہ بالا ۱۲۷۔ المسالک والممالک، ص ۱۴۱

۱۲۸۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۶۰ ۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۱۳۰۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب فی تعشیر اھل الذمہ: ۳۰۵۳، ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، بیروت، مکتبہ دار الجیل، ۱۹۹۲ء

۱۳۱۔ الجامع الصحیح، کتاب الجزیہ، باب اثم من قتل معاھدا بغیر جرم: ۲۹۹۵، بخاری، محمد بن اسماعیل، بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ

Marfat.com

۱۳۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفئی، باب فی تفسیر اھل الذمۃ: ۳۰۵۲

۱۳۳۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الامام یستجن بہ فی العھود: ۲۷۵۸

۱۳۴۔ محولہ بالا

۱۳۵۔ الدر منثور، ۴/۳۶۸

۱۳۶۔ القیامۃ/۱۵۔۱۴

۱۳۷۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۷۰

۱۳۸۔ محولہ بالا

۱۳۹۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۷۲۔۱۷۱

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۴۱۔ اشاعت اسلام، ۱۷۶

۱۴۲۔ محولہ بالا

۱۴۳۔ اشاعتِ اسلام، ۱۸۲۔۱۸۰

۱۴۴۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔۱۷۹

۱۴۵۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۴۶۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۰۳۔۳۰۲

۱۴۷۔ محولہ بالا

۱۴۸۔ اشاعت اسلام، ص ۳۰۰

۱۴۹۔ محولہ بالا

۱۵۰۔ محولہ بالا

۱۵۱۔ محولہ بالا

۱۵۲۔ محولہ بالا

۱۵۳۔ محولہ بالا

۱۵۴۔ محولہ بالا

۱۵۵۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۰۴

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۳۴۶

۱۵۷۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۶

۱۵۸۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۴۷

۱۵۹۔ محولہ بالا

۱۶۰۔ محولہ بالا

۱۶۱۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۴۸،

۱۶۲۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۱۷

۱۶۳۔ محولہ بالا

۱۶۴۔ محولہ بالا

۱۶۵۔ محولہ بالا

۱۶۶۔ محولہ بالا

۱۶۷۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۱۲

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۱۶۹۔ ایضاً، ص ۳۴۰۔۳۴۱

۱۷۰۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۱

۱۷۱۔ محولہ بالا

۱۷۲۔ محولہ بالا

۱۷۳۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۳

۱۷۴۔ محولہ بالا

۱۷۵۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۴۔۳۴۳

Marfat.com

۱۷۶۔ اشاعت اسلام، ص ۳۵۹ ۱۷۷۔ محولہ بالا

۱۷۸۔ محولہ بالا ۱۷۹۔ محولہ بالا

۱۸۰۔ اشاعت اسلام، ص ۳۶۰ ۱۸۱۔ الکھف/ ۱۸

۱۸۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب التیمم، باب قول اللہ ولم تجدوا ماء فتیمموا: ۳۲۸

۱۸۳۔ اشاعت اسلام، ص ۳۷۲ ۱۸۴۔ محولہ بالا

۱۸۵۔ محولہ بالا ۱۸۶۔ محولہ بالا

۱۸۷۔ تذکرۃ الحفاظ، ۱/۱۴۲، ذہبی، شمس الدین، محمد بن حسین، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۳۷۶ھ

۱۸۸۔ تاریخ دمشق، ۳/۲۵۵

۱۸۹۔ وفیات الاعیان، ۱/۶۵، ابن خلکان، شمس الدین، احمد بن محمد، ایران، منشورات الرضی، ۱۹۷۱

۱۹۰۔ النساء/ ۷۹

۱۹۱۔ الجامع الصحیح للترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ ص: ۳۲۳۲، ترمذی، ابوعیسیٰ، محمد ابن عیسی، مصر، مطبعۃ المصطفیٰ البابی، ۱۳۹۸ھ ؛
مسند الامام احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عباس: ۲۰۰۹، ابن حنبل، احمد بن حنبل، مکۃ المکرمہ، مکتبہ عباس احمد الباز، ۱۴۱۴ھ

۱۹۲۔ محولہ بالا ۱۹۳۔ ص/ ۷

۱۹۴۔ دلائل النبوۃ، ۲/۴۲۶، بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ

۱۹۵۔ السیرۃ النبویہ، ۲/۱۶۰۔۱۵۹، ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، بیروت، داراحیاء التراث العربی، س ن

۱۹۶۔ الکہف/ ۱۴

Marfat.com

مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام

اس مضمون میں بجائے اسلامی حکومت کے مسلمانوں کی حکومت کا عنوان قصداً قائم کیا گیا ہے۔ کیونکہ عام استعمال کی رو سے تو ہر وہ چیز جو مسلمانوں کی طرف کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب ہو آج کل اس کو بھی لوگ اسلامی کہہ دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس بنیاد پر ''اسلامی پانی'' جیسے الفاظ آج تک کانوں میں نہ سہی لیکن حافظوں میں تو اب بھی گونج رہے ہیں۔ جب چاء بیچنے والے اپنی چاء کو بیچنے کے لیے اسلامی کے اس لفظ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور اسٹیشنوں کے بھشتی اسی لفظ کی پشت پناہی میں بخشش کا مستحق اپنے آپ کو قرار دیتے تھے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اسلام تو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کا ایک پیغام ہے، ایسا پیغام جس میں اپنے بندوں پر حق تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں عائد فرمائی ہیں۔ کائنات کے ماضی و مستقبل و حال کے متعلق فکری نظام عطا کیا گیا ہے۔ یعنی ہستی کا موجودہ نظام جس کا ایک جزو خود ہم انسانوں کا وجود ہے اس کی ابتداء اور اس کے آخری انجام و انتہاء اور یہ کہ اس وقت یہ نظام جو چل رہا ہے کیسے چل رہا ہے، کون چلا رہا ہے، انہیں اساسی اور بنیادی سوالوں کے جواب کے متعلق ہمیں کیا سوچنا چاہیے۔ خود اس عالم کے پیدا کرنے والے نے جو علم اس راہ میں عطا کیا ہے اس علم کو یقین و قطعیت کی قوت کے ساتھ ماننا اسی کی مذہبی تعبیر و اعتقاد ہے اور جو معلومات اس سلسلہ میں خالق کائنات کی طرف سے ہم پر کھولے گئے ہیں، ان

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں نومبر ۱۹۵۰ء، جنوری و فروری ۱۹۵۱ء کو چار اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

ہی کو عقائد کہتے ہیں۔ پھر زندگی کو اسی فکری نظام کے تحت رکھتے ہوئے صحیح انجام تک پہنچنے کے لیے ایک عملی دستور العمل یا ضابطہ پیدا کرنے والے نے عطا کیا۔ یہی اسلام کا عملی نظام ہے۔ آمنوا وعملوا الصالحات کا تعلق علم وعمل کے ان ہی دو نظاموں کے ساتھ قائم ہے۔

ظاہر ہے کہ اسٹیشنوں پر بکنے والی چائے یا تقسیم ہونے والا پانی، مندرجہ بالا دونوں باتوں یعنی اسلام کے فکری یا عملی نظام سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا، نہ چاء آسمان سے اتری اور نہ پانی اور نہ چاء بنانے کا طریقہ اسلام میں بتایا گیا ہے اور نہ پانی کو کنوئیں یا تالاب سے نکالنے، مشکوں میں بھرنے، پشت پر اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم کے کنارے ٹہلنے پھرنے کا طریقہ، بہشتیوں کو اسلام نے سکھایا ہے۔

مگر یہ فرض کر کے کہ مسلمان اس چاء کو استعمال کریں گے، یا اس پانی کو پئیں گے کہنے والوں نے اس چاء اور پانی کا نام اسلامی چاء اور اسلامی پانی رکھ دیا۔ اور یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''اسلامی'' کے اس لفظ کو اتنی وسعت دیکر لوگ اگر استعمال کر رہے ہیں، تو یہ بالکل ایک جداگانہ اور اپنی من مانی گھڑی ہوئی خود تراشیدہ اصطلاح ہے، جو خاص خاص اغراض کے زیر اثر کسی طرح چل پڑی ہے۔ لیکن اسلام کے اس لفظ کو صرف اس پیغام اور فکری وعملی نظام کی حد تک اگر محدود رکھا جائے جو بندوں کو پیدا کرنے والے خالق کی طرف سے پہنچایا گیا ہے اور یہی اسلام کے لفظ کا صحیح مطلب ہے بھی۔ پیغام پہنچانے والے پر اعتماد کر کے خدا کے جن بندوں نے اس پیغام کو قبول کر لیا اور اس کے مطابق جینے، اسی پر مرنے کا قطعی فیصلہ جو کر چکے ہیں، ان ہی کا نام ''مسلم'' ہے۔ اور اسی کی فارسی جمع لفظ ''مسلمان'' ہے جو مسلمانان کی فارسی اور مسلمانوں کی اردو جمع الجمع کے بعد اب خود مفرد ہو کر رہ گیا ہے۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغام یعنی اسلام کا خطاب بندوں کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ محدود نہیں ہے۔ اس کے مخاطب جیسے مرد ہیں، عورتیں بھی ہیں، جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی، مسافر بھی ہیں، اور مقیم بھی، مالدار بھی ہیں اور وہ بھی جو زائد از ضرورت آمدنی نہیں رکھتے، جو صحت مند اور چنگے ہیں، وہ بھی اور صحت کی نعمت سے جو محروم ہیں وہ بھی، باپ بھی ہیں اور بیٹے بھی، ماں بھی اور بیٹی بھی، الغرض انسانیت کے سارے ''تکلیفی مظاہر'' اس خطاب کے مخاطب ہیں، جن میں جیسا کہ عرض کیا گیا، ہر طرح کے لوگ مرد و عورت، جوان، بوڑھے وغیرہ شریک ہیں۔ اسی طرح حکمرانی کا اقتدار جن افراد کے ہاتھوں میں قدرت پہنچا دیتی ہے، جنہیں حاکم کہتے ہیں اور وہ بھی جنہیں اس اقتدار کا کوئی حصہ نہیں بخشا گیا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ اس پیغام کے مخاطب جیسے حاکم ہیں، اسی طرح اس کے مخاطب محکوم بھی ہیں، وہ بھی ہیں جو کسی کو ملازم اور نوکر رکھتے ہیں، اور وہ بھی ہیں جو ان نوکروں یا ملازموں سے کام لیتے ہیں۔

اسلام کے اس الٰہی پیغام کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے مخاطب سارے تکلیفی مظاہر ہیں لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں اسی پیغام کی بعض باتیں، ایسی بھی ہیں جن کی تعمیل کی ذمہ داری خاص خاص طبقوں پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے مخاطب صرف مرد ہیں اور بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو صرف عورتوں تک محدود ہیں۔ بہت سے واجبات و فرائض ہیں، جن سے بیماروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، یا کہنہ سال بوڑھوں سے وہ معاف ہیں۔ بہت سے مطالبات کا رخ صرف مالدار کی طرف ہے، غریبوں کم مایہ لوگوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ احکام ہیں جن کا پابند اسلام ان لوگوں کو بنانا چاہتا ہے جو دوسروں سے کام لیتے ہیں کچھ ذمہ داریاں ان کی بھی ہیں، جو دوسروں کا کام کرتے ہیں، پدری منصب کے

Marfat.com

کچھ فرائض ہیں، جو ان فرائض سے بالکل مختلف ہیں، جن کے مکلف بیٹے ہیں۔

اسی سلسلہ میں احکام وقوانین کا ایک مستقل ضابطہ اسلام (الف) نے ان لوگوں کے بھی سپرد کیا ہے جو زمین کے کسی علاقہ میں حاکمانہ اقتدار کے مالک ہیں۔ اسی کے مقابلہ میں کچھ ذمہ داریاں ان کی بھی اسلام ہی نے مقرر کی ہیں، جن کی جان و مال، عزت و آبرو، فلاح و بہبود وغیرہ جیسے امور کی نگرانی کے لیے حکومت قائم ہوئی ہے۔

ایسی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ مثلاً مسافر بن جانے کے بعد جن اسلامی مطالبات کی تعمیل کی طرف مسافروں کو توجہ دلائی گئی ہے۔ جیسے یہی کہ نماز میں قصر کریں، روزے ماہِ رمضان سے چاہیں تو مؤخر کر سکتے ہیں یا ازیں قبیل سفر کے متعلق دوسرے مشورے جو مسافروں کو دین کی طرف سے دیئے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر کو بھی دو قسموں میں تقسیم کر کے سفر کی ایک قسم کا نام اسلامی سفر اور دوسری قسم کا نام ''غیر اسلامی سفر'' رکھنے پر اصرار اور اس اصرار کو اس حد تک بڑھا دینا کہ اسلامی سفر کے ہر ہر جزو کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ کتاب وسنت میں اس کا ماخذ کیا ہے۔ مسافر نے بستر اجو باندھا ہے تو اس کی بندش میں اس نے قرآن کی کس آیت اور رسول اللہ ﷺ کی کس حدیث کو پیش نظر رکھا ہے، بستر اکس چیز سے باندھا، رسی سے باندھا، چمڑے سے باندھا، ہولڈال میں باندھا، پھر یہ کہ کس سواری پر سوار ہوا، زادراہ میں اپنے ساتھ کیا کیا رکھا۔ یہ اسی قسم کے بے شمار سوالوں کو اٹھا اٹھا کر اس پر بحث کرنا کہ مسلمان مسافر کا یہ سفر واقعی اسلامی سفر کہے جانے کا مستحق ہے بھی یا نہیں۔ خود سوچنا چاہیے کہ کس حد تک مناسب ہے؟ اور ایک سفر ہی کیا؟ ان کل قصوں میں جن میں بعض کا ذکر ابھی تمثیلاً کیا گیا، کیا ہر ایک میں اسلامی وغیر اسلامی کی اس تقسیم کو جاری کرنا اور اسلامی قرار پانے والی قسم کے متعلق

Marfat.com

تنقیحی سوالات کے اٹھانے ، اور اس کے ہر ہر پہلو کو اسلامی قوانین کے اساسی ماخذوں اور بنیادی سرچشموں پر منطبق کرنے کی ضرورت اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں کیا کبھی محسوس کی گئی ہے۔ لباس ہی کو لیجیے، چند ضوابط اسلام میں لباس کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مردوں کو چاہیے کہ ریشم کا لباس استعمال نہ کریں، لوگ اسبال ازار کے مرتکب نہ ہوں۔ ان چند باتوں کو دیکھ کر اسلامی و غیر اسلامی لباس کی تقسیم اور اسلام کے متعلق یہ سوالات کہ اس کی تراش کیا ہو، سلائی کیسے کی جائے، کیسے پہنا جائے، کیا کسی زمانہ میں لوگوں نے ان سوالوں کو اٹھایا۔ عام طریقہ اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی مسلمانوں کو اسلام نے جن حدود میں رہنے کا حکم دیا ہے، بس ان حدود کو تو دیکھ لیا جاتا ہے، ان حدود کے اندر رہنے والے اپنے دین کے پابند مسلمان سمجھے جاتے ہیں اور ان حدود سے تجاوز کرنے والوں کو سمجھا جاتا ہے کہ اپنے دین کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

پھر فرض و واجب، سنت و مستحب، اولیٰ، یا حرمت و کراہت، تحریمی و تنزیہی، خلاف اولیٰ وغیرہ ہونے کے حساب سے مطالبہ کی جو نوعیت ہوتی ہے، اسی کے اعتبار سے خلاف ورزی کی نوعیت پر حکم لگایا جاتا ہے، یعنی کبیرہ گناہ کا مرتکب حدود سے تجاوز کرنے والا ہے، یا صغیرہ کا یا صرف قابل ملامت ہے۔

بہر حال اتنا دیکھ لینے کے بعد اس خاص شعبہ کے جن دوسرے پہلوؤں کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کسی قسم کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنی اپنی ضرورتوں اپنے اپنے حالات اور دوسرے اقتضاؤں کی بنیادوں پر عقل و تجربہ سے عمل کی جو راہ پیش کرے، اسے مسلمان اختیار کریں۔ اصطلاحاً انہیں کو "مباحات" کہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سفر ہی کو لیجیے، جب پیش آتا ہے تو چند خاص باتوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے سفر کے تمام پہلوؤں کے متعلق آزادی عطا کی گئی ہے

Marfat.com

ن تک مصلحت کے مطابق جو کچھ اس کی سمجھ میں آئے اختیار کرتے [illegible]
[illegible] ظاہر ہے کہ کسی خاص مقام مثلاً لکھنؤ سے دلی تک ایک ہی سفر کوئی کرے
[illegible] سفر کے سارے اسلامی مطالبات کی تکمیل اس میں کی جائے۔ پھر بھی اس مسافر کا
[illegible] یہ خاص سفر جن بے شمار امور پر مشتمل ہوگا ان میں ایسی چیزیں جن کو ہم اسلامی
[illegible] مطالبات کہہ سکتے ہیں، ان امور کے معاملہ میں جن کا "مباحات" سے تعلق ہے،
[illegible] شاید آٹے میں نمک سے زیادہ ان کی حیثیت نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ گو سفر میں بھی
[illegible] آدمی کو ذہن کے بعض مشوروں کو شریک کرنا پڑتا ہے، مگر محض اس کی وجہ سے سفر کی
[illegible] ایک مستقل قسم "اسلامی سفر" کی اصطلاح نہیں بنائی گئی [illegible]
[illegible] ہم یہی پوچھنا چاہتے ہیں کہ حاکمانہ اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کو بھی
[illegible] اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ضابطہ ضرور دیا ہے، لیکن جیسے قصر صلوٰۃ یا تاخیر
[illegible] صوم وغیرہ دینی مسائل کے جاننے والوں کے لیے سفر کی تمام مشکلات حل نہیں
[illegible] ہو جاتیں، بلکہ ابتدائے سفر سے آخر تک ہر ہر قدم پر عقل و تجربہ، ضرورت وغیرہ کے
[illegible] لحاظ سے ہزاروں فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور عقل و تجربہ وغیرہ کی روشنی میں کیے
[illegible] ہوئے ان فیصلوں کی وجہ سے اس مسافر کا سفر جس نے "اسلامی مطالبات" کی تعمیل
[illegible] میں اپنے پورے سفر میں کوتاہی نہ کی ہو، جیسے اس مسافر کے سفر کو نہ غیر اسلامی کہا
[illegible] جا سکتا ہے اور محض اس لیے کہ دوران سفر میں وہ نمازوں میں قصر کرتا رہا، یا روزے
[illegible] میں تاخیر سے کام لیا، یہ یا اسی قسم کے چند گنی چنی چیزوں کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل
[illegible] قسم "اسلامی سفر" نکالی گئی [illegible]
[illegible] اسی طرح کسی علاقہ میں حکمرانی کا اقتدار جن مسلمانوں کے ہاتھوں میں
آ جائے، اور جن مطالبات کی تکمیل کے ذمہ دار مسلمان حکمران ٹھہرائے گئے ہیں۔
[illegible] ظاہر ہے کہ محض ان ذمہ داریوں کی تکمیل بھی اگر حکمرانی کے لیے کافی نہ ہو، تو یقیناً یہ

Marfat.com

اسلامی تعلیم کا نہ تو نقص ہوگا اور مکان وزمان، حالات و ماحول وغیرہ خصوصیات کی وجہ سے حکمرانی کے سلسلہ میں ان مسلمانوں کو عقل وتجربہ کی راہوں سے جن چیزوں کو اختیار کرنا پڑے، ان کی وجہ سے وہ بیچارے اس کے مستحق ہوں گے کہ ان کے طریقہ حکومت کو غیر اسلامی طریقہ حکومت قرار دیا جائے۔ اور جیسے یہ فتویٰ لگانا ان پر درست نہ ہوگا، اسی طرح میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ایسی حکومت جس میں زیادہ تر عقل وتجربہ کی روشنی میں نظر آنے والے حقائق ضرورۃً اختیار بھی کیے جاتے ہوں اور چھوڑے بھی جاتے ہوں اور ان ہی عقلی وتجربی عناصر سے حکومت کی مشینری بھری ہوئی ہو۔ اگر ان ہی کے ساتھ ان معدودے چند اسلامی ضوابط کو بھی اس میں شریک کرلیا جائے جن کی تعمیل کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے کیا گیا ہے، جیسے مسافر اپنے سفر کے عقلی وتجربی عناصر کے ساتھ ان چند باتوں کا بھی پابند ہو، جن کا حکم دین میں مسلمان مسافروں کو دیا گیا ہے، تو مسلمان حکمرانوں کے محض اس طرزِ عمل سے یعنی حکمرانی کے ان معدودے چند ضوابط کو اپنے طریقہ حکمرانی میں شریک کرلینے کی وجہ سے ایسی حکومت کو اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت کہنے کی وجہ بہ ظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اور آج تک مسلمانوں کی حکومت جہاں کہیں قائم ہوئی، جہاں تک میں جانتا ہوں اس کو ''اسلامی حکومت'' یا ''الٰہی حکومت'' وغیرہ کے ناموں سے شاید کبھی موسوم نہیں کیا گیا۔ یہ نام نہ عہد خلافتِ راشدہ میں حکومت کا ہم پاتے ہیں اور نہ اس کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں کو یہ نام کسی زمانہ میں دیا گیا، حکومت بنی امیہ، حکومتِ عباسیہ، حکومت غزنویہ، غوریہ، مغلیہ، عثمانیہ، اس قسم کے نام تو سننے میں آتے ہیں، لیکن ان مسلمان حکمرانوں نے کسی زمانہ میں اپنی حکومت کا نام ''حکومت اسلامیہ'' یا ''حکومت الٰہیہ'' رکھا ہو، کم از کم فقیر اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے کلیسا کے نام سے ''پوپ'' کے ہاتھ میں

Marfat.com

حکمرانی کا اقتدار آہستہ آہستہ جب منتقل ہوا، اور یورپ کے عام حکمرانوں پر برتری حاصل کرنے کے لیے دین کی پشت پناہی کی ضرورت پوپوں نے محسوس کی، تو شاید دنیا میں یہ پہلی بدعت انہوں نے قائم کی، کہ عام حکمرانوں کی حکومت کے مقابلہ میں ''دینی حکومت'' یا عیسائی حکومت یا کلیسائی حکومت وغیرہ نام اپنی حکومت کو دیا، پھر جب ''کلیسا'' کے خلاف یورپ میں ردعمل ہوا تو کلیسائی حکومت کے مقابلہ میں ضرورت پڑی کہ تمیز کے لیے سیکولر حکومت یا لادینی حکومت ان حکومتوں کا نام رکھا جائے جو ''پوپ'' کے سیاسی اقتدار کو توڑنے کے لیے اور ان کو توڑ کر قائم ہوئی تھیں۔

بہرحال جیسے سفر یا لباس یا اسی قسم کی ہر وہ چیز جس کے متعلق مسلمانوں کو مذہب کی طرف سے کچھ احکام وضوابط عطا کیے گئے ہیں ان کی تعمیل کی وجہ سے الٰہی سفر، غیر الٰہی سفر یا اسلامی سفر غیر اسلامی سفر، الٰہی لباس، اسلامی لباس، غیر اسلامی لباس، وغیرہ کی قسمیں کچھ ان سنی اور انجانی پائی ہیں۔ مجھے تو خیال یہی گذرتا ہے کہ الٰہی حکومت غیر الٰہی حکومت یا اسلامی حکومت، غیر اسلامی حکومت، حکومتوں کے نام رکھنے کی یہ رسم شاید نئی رسم ہے یا کچھ تعجب نہیں کہ کلیسا اور پوپیت کی تاریخ کے ساتھ اس کا رشتہ نکل آئے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پینے والوں کی خصوصیت کی وجہ سے چاء یا پانی کا نام اسلامی چاء یا اسلامی پانی لوگوں نے جیسے رکھ دیا تھا کچھ ہی حال حکومتوں کے ان ناموں کا بھی ہو اور کیا تعجب ہے کہ آئندہ بجائے اسلامی کے چاء اور پانی کا نام بھی الٰہی چاء اور الٰہی پانی رکھ دیا جائے اور توجیہ یہ کی جائے کہ اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ چونکہ یہ چاء اور پانی مخصوص ہے اور اسلام الٰہ کا عطا کیا ہوا دین ہے، اس لیے اس چاء اور پانی کا نام الٰہی چاء اور الٰہی پانی رکھ دیا گیا۔

بہرحال بات ذرا طویل ہو گئی ورنہ کہنے کی بات صرف اسی قدر ہے کہ آئندہ جو کچھ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، میرے لیے یہ مشکل تھا کہ ''اسلامی حکومت یا

Marfat.com

ن الٰہی حکومت' وغیرہ الفاظ جن کا چرچا بیسویں صدی کے اس عہد میں پھیلا ہوا ہے اور جس
د قسم کی توقعات ان ناموں کے ساتھ قائم کر لی گئی ہیں یا قائم کر دی گئی ہیں ان توقعات
ن کے لئے معیار پر دنیا کی ساری حکومتیں پوری اترتی ہیں جن کے ذریعہ حکومت میں رہنے والی
ں غیر مسلم قوموں کا اجمالی تذکرہ یہاں مقصود ہے
ں اتنی بات میں جانتا ہوں کہ حکمرانوں کا یہ گروہ مسلمان تھا اور ان میں اگر
ب نہیں تو اتنی حقیقت تھی خواہ وہ کچھ بھی ہوں لیکن حکمرانی کے سلسلہ میں ایسے کم
ی تھے جن کے طریقہ حکومت میں ضوابط کا وہ مجموعہ شریک تھا جس کی تعمیل و نفاذ کا
ں کام مسلمان حکمرانوں کے ذمہ اسلام کی طرف سے سپرد کیا گیا ہے۔ فقہائے اسلام
نے دین اسلام کے انہی سرچشموں سے جن اجتہادی نتائج کو پیدا کیا تھا عموماً ان
ہی کے مطابق فصل خصومات اور رفع نزاع کا کام آخر وقت تک انجام پاتا رہا اور
ں اسی کے ساتھ اپنے اپنے زمانہ اور اپنے اپنے ملک کے خصوصی حالات کی بنیاد پر ہر
ں زمانہ میں عقل و تجربہ سے ہمیشہ کام لیا گیا۔ یہی ان کی حکمرانیوں کا عام طریقہ تھا۔
ں اب چاہیے کہ اسلامی یا الٰہی حکومت کے معیار پر وہ پوری اترتی ہوں یا نہ اترتی ہوں۔
ں اس سے اپنی جھگڑا نپٹنے کے لیے میں نے بجائے اسلامی حکومت کے
ں مسلمانوں کی حکومت کے عنوان کو قصداً اختیار کیا ہے، جیسے عام مسلمانوں میں اچھے
ں برے مذہبی مطالبات کی تکمیل میں کامیاب و ناکام نیابی سطح کے لوگ ہیں،
ں وہ بھی تھے یا ان وقت میرے سامنے ان کی حکومت کا صرف ایک پہلو ہے یعنی غیر مسلم
ں اقوام کا مقام اور ان کے عام حالات میں مسلمان حکمرانوں کی مملکتوں میں کیا تھی۔
ں یہ ایک پورا صفحہ ہے کس جنگ و جدال، لڑائی بھڑائی میں کس وقت تک ہوتی رہتی تھی، اس
ں کی نوعیت اس زمانہ سے بالکل مختلف تھی جب کسی علاقہ میں حکومت قائم ہو جاتی تھی
ں یہ ہوتا تھا اگرچہ جنگ و تبدیلی کے وقت ان کے قصبوں کے متعلق بھی بہت زیادہ

Marfat.com

غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی غلط فہمیوں کا عہد نبوت تک جنگی ہمہ تل ہونے کے متعلق ا
سوچئے اقوام کے تاثرات کا مقابلہ ذرا ان واقعات سے کیجئے کہ ذہن انسانی کی طویل
مدت عمر میں نبی محمد کے متعلق کیا کچھ کہا گیا ہے؟ ان امیین قریش و اعراب کے علاوہ
قبائل نجد و یمن و عمان و بحرین کے سب ہی اس مقابلے ہوئے اگر جانتے ہیں ان مختلف
اقوام کی ان رسالہ آویزشوں کے متعلق کہ آنحضرت کے دشمنوں یعنی قتل ہونے والوں کی
تعداد بمشکل پانسو تک یا ہزار تک پہنچ سکتی ہے مدت میں عرب و یہود عیسائی اور
مسلمان الغرض جنگ کے ہر فریق کے مقتولوں کی تعداد شریک ہے (اب) یہ
خیر لڑائی بھڑائی کا قصہ تو اب ہے بحث اس وقت بقیام امن و امان کے
بعد اس زمانہ کے متعلق ہے جب باضابطہ حکومت کسی علاقہ میں قائم ہو گئی میں دنیا
کے مورخوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ ہزار سال سے زیادہ طویل مدت میں دنیا کے
مختلف حصوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے
کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اس لیے قتل کر دیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے
یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کر دے
میں نے شاید نصف صدی سے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہوں، لیکن
میرے حافظہ میں ایسی کوئی شہادت محفوظ نہیں ہے جس کی روشنی میں اس سوال کا
جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہو۔ ممکن ہے کہ پہلے اس سوال کی طرف توجہ نہ ہو، مگر
جب سے اس کا خیال آیا ہے کتابیں پڑھتا رہتا ہوں لیکن کوئی تائیدی شہادت کم از کم
اس وقت تک تو مجھے نہیں ملی ہے حالانکہ مسلمانوں کی یہ حکومتیں مشرق میں بھی قائم
ہوئی ہیں اور مغرب میں بھی۔ اقتدار کی باگ کبھی ایسی فطرت کے لوگوں کے قبضہ
میں رہی اور ان ہی میں بعض غیر معتدل دل و دماغ بھی تھے اور کیسے غیر معتدل!
ان اللہ ان زیادہ ہے زیادہ اس سلسلہ میں اگر کبھی کوئی چیز ہزار ہا ہزار صفحات کے

Marfat.com

الٹ پھیر کے بعد ملتی بھی ہے تو وہی ہے کہ فوری محرکات نے غیظ وغضب کے جذبہ میں مغلوب کر کے بعض نا کردنی اقدامات کا ارادہ حکمرانوں میں سے کسی کے اندر پیدا کیا۔ مگر یہ ارادہ کبھی پورا ہوا؟ میرے مطالعہ کا نتیجہ تو یہی ہے کہ کبھی پورا نہیں ہوا۔ سب سے بڑی روک اس قسم کے فاسد ارادوں کی تکمیل میں بسا اوقات خود اسلام بن گیا۔ معارف کے ناظرین کو شاید یاد ہوگا کچھ دن پہلے مسلمانوں کی طرف سے معذرت کے وجوہ پیش کرتے ہوئے خاکسار نے ایک طویل مضمون اس مجلہ میں شائع کرایا تھا۔ اس میں ان نہ پورے ہونے والے فاسد ارادوں کی کچھ تاریخی مثالوں کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ترکی کے بعض سلاطین کے ساتھ ہندوستان کے بعض حکمرانوں کا بھی نام لیا گیا تھا۔ عرض کیا گیا تھا کہ اسی ہندوستان میں سکندر لودھی نے کورک شیستر کی تیرتھ گاہ کی بعض رسوم میں دخل اندازی کا ارادہ کیا تھا، لیکن دربار کے ایک عالم نے بادشاہ کو اسی وقت ٹوکتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ لودھی نے غضبناک ہو کر تلوار کھینچ لی اور غریب مولوی کو دھمکاتے ہوئے کہنے لگا کہ تم کفر کی پشت پناہی کرتے ہو، مولوی نے جواب میں جو کچھ کہا تھا اس کا حاصل یہی تھا کہ میں پشت پناہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان کا پشت پناہ تو خود اسلام ہے۔ اسی مقالہ میں آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت کی اس آخری وصیت کا بھی ذکر کیا گیا تھا، جس میں ان غیر مسلم باشندوں کی جو مسلمانوں کی حکومت میں آباد ہوں، ذمہ داری لیتے ہوئے تاکید فرمائی گئی تھی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ ارشاد فرمایا گیا تھا کہ قیامت کے دن میں خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں حجیج بن کر کھڑا ہوں گا، یعنی نبوت کی طرف سے ان حکمرانوں پر دربار الٰہی میں دعویٰ دائر ہوگا، جن سے اس وصیت کی تعمیل میں کوتاہی ہوگی۔

ان ہی پیغمبرانہ شدید تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ عموماً اپنے زمانہ میں اعلان

Marfat.com

کرتے پھرتے تھے، کہ ہمیں منع کیا گیا کہ

''ان اصیب من معاهد ابرة''(۱)

''معاہد یعنی (مسلمانوں کے قلمرو کے غیر مسلم) سے ایک سوئی بھی لیں''

مسلمانوں کو صحابہ ہی کی طرف سے یہ بھی سنایا جاتا تھا کہ

''اذا احضرت الذمة اديل العدوُ''(۲)

''ذمہ جب توڑا جائے (یعنی غیر مسلم رعایا جن کی حکومت نے ذمہ داری لی اور ان کی ذمہ داری کو پورا نہ کرے گی) تو دشمن کو پلٹا دیا جائے گا (یعنی مسلمانوں سے حکومت چھن جائے گی)''

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اور دینی وثائق نے ان حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ لیا، جنہوں نے کسی فوری جذبہ کے تحت قانون کی حدود سے نکلنے کا کبھی ارادہ کیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان ہی کی تاریخ کی ایک دلچسپ مثال وہ بھی ہے، جس کا تذکرہ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے۔

جلال الدین خلجی جو خلجی خاندان کا پہلا حکمران تھا، تقدیر نے اس ترک سپاہی کو موقع دیا اور دِلی کے تخت پر قابض ہو کر سارے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ غوریوں سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں کی حکومت پر سو سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا کہ جلال الدین نے خلجی خاندان میں حکومت منتقل کر دی۔ اس ایک صدی سے زیادہ مدت میں ہندوستان کے عام غیر مسلم باشندے جس قسم کی زندگی گذار رہے تھے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن اپنے درباریوں سے دیکھا گیا کہ جلال الدین کہہ رہا ہے:

''ہر روز ہندوان، مندل زنان و یوق زنان در زیر کوشک می گذرند، و در جون می آیند و بت پرستی می کنند و در دار الملک با ہزر ناز و کرشمہ و باژوت

Marfat.com

نعمت زیست دتلذذ ہا و تنعمہا گیرند، و درمیان اہل اسلام مباہی و مفاخر باشند تے

و آشکارا و کشادہ بت پرستیہا می کنند و طبل زنان با علام کفر و شرک در اواج

می زنند و [illegible]

''ہندو روزانہ تجا نجھو بجاتے ہوئے اور [illegible] بھونکتے ہوئے کوشک

(شاہی محل) کے نیچے سے گذرتے ہیں اور جمنا گھاٹ پر پہنچ کر پوجا پاٹ کرتے ہیں

اور دارالسلطنت میں ہر روز ناقوس کی شنیع اور دولت و شوکت کے ساتھ زندگی

گزارتے ہیں اور ان سے لذت گیر ہوتے ہوئے مزے کر رہے ہیں اور مسلمانوں

کے درمیان عزت و فخر و سربلندی کیساتھ رہتے ہیں اور کھلے بندوں اعلانیہ بتوں کی

پوجا پاٹ کرتے ہیں ڈھول بجاتے ہوئے کفر و شرک کی باتوں کو رواج دیتے ہیں''۔

[illegible] سو سال سے زیادہ زمانہ تک ان عالم دستور کے فکر سے جلال الدین کی

غرض کیا تھی، اگرچہ صراحۃ برنی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر قرینہ حال سے جو

کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا تذکرہ تو ابھی آپ سنیں گے مگر قطع نظر اس سے میرے

خیال میں غوریوں کے عہد کے متعلق یہ ایک شاہی شہادت ہے، جس سے اندازہ کیا

جا سکتا ہے کہ تسلط تام اور کامل قبضہ کے بعد غوری بادشاہوں نے یعنی غوری خاندان

کے غلام بادشاہوں نے اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کو کس حال میں رکھا۔ [illegible]

[illegible] درمیان اہل اسلام مباہی و مفاخر باشند [illegible]

[illegible] کے فارسی فقرے کا ٹھیک ترجمہ جیسا کہ لفظ بہ لفظ ہونا چاہیے الرتوہ میں [illegible] ہوسکا

مطلب اس کا یہی ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کسی قسم کی کمتری کے احساس کا موقع

بھی جیسا کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کو نہیں دیا

جاتا تھا، بلکہ ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ ان کے دوش بدوش فخر و مباہات کے

ساتھ زندگی گذار رہے تھے [illegible]

Marfat.com

آج "سیکولر حکومت" کا دنیا میں بہت چرچا ہے، لیکن مذکورہ بالا شاہی شہادت کی رو سے غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسن سلوک کے جس بلند معیار کو واقعہ کے قالب میں اسی ہندوستان کے آسمان اور اسی کی زمین نے دیکھا تھا، کیا "سیکولر حکومت" اسی معیار کو پھر اس ہندوستان میں قائم کرنے میں کامیاب ہوگی؟ توقع تو اسی کی کرنی چاہیے، خدا کرے کہ طبعی حکومت کا مطلب لوگوں کی سمجھ میں آجائے، یعنی حکومت کا وہی نظام جس میں تیر بڑھی کا بال بھی محفوظ ہو، خواہ اس کا تعلق اکثریت سے ہو، یا اقلیت سے [illegible]

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس ترک سپاہی کی جو ادنیٰ درجہ کی ملازمتوں سے ترقی کرتے ہوئے ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تھا، اس کی غرض اپنے اس بیان سے کیا تھی؟ برنی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی بادشاہی کے نشہ اقتدار پر غوری سلاطین کا یہ قدیم دستور اس ترک جوشیلے سپاہی کے لیے کچھ باعث گرانی ہوا اور گو برنی نے تصریح نہیں کی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ کسی غلط اقدام کا کچھ وسوسہ بھی اس کے دل میں ابھرا ہو، لیکن حسرت و یاس کے ان الفاظ یعنی:

"خاک بر سر و خاک بر بادشاہی و دین پناہی ما" (۴)

کے ساتھ ان وسوسوں پر خاک ڈالنے کے سوا اور بھی اس نے کچھ کیا یا کر سکتا تھا۔ اس کا جواب آپ کو تاریخ دے گی۔ کم از کم میں تو نہیں جانتا کہ غوریوں کے زمانہ سے ہندوستان نے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو دستور چلا آرہا تھا، اس میں کسی قسم کا ردوبدل کسی زمانہ میں کیا گیا ہو۔ کچھ بھی نہ ہوتا، تو صرف ایک یہی شاہی شہادت ان بے بنیاد افواہوں کو پادر ہوا بنا دینے کے لیے کافی ہے، جو زبانوں سے تو نکلتی ہے لیکن ان کی تائید میں کوئی شاہی بیان تو بڑی چیز ہے کسی معتبر مورخ کی ایسی کوئی شہادت بھی پیش نہیں ہو سکتی جس سے معلوم ہو کہ ہندوستان کے دور دراز

مضافاتی و مفصلاتی مقامات ہی میں نہیں ، بلکہ خاص دارالسلطنت میں شاہی محل سرا کے نیچے سے روزانہ پوجا پاٹ کے لیے نرسنگھا پھونکتے ،ڈھول بجاتے ، جمنا گھاٹ پر آتے جاتے دیکھنے کا جلال الدین جو عادی تھا اور اسی دارالسلطنت کے شہر میں مسلمانوں کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جن لوگوں کو وہ پا رہا تھا، حکومت نے کسی جگہ کسی زمانہ میں کسی قسم کی عملی مداخلت ان کے اس طرزِ عمل میں کبھی کی ہو، خودتراشیدہ افسانوں میں نہیں ، بلکہ تاریخی وثائق کی روشنی میں انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے ؟ مگر جس دنیا میں ''دیوانہ گفت ابلہ باور کرد'' کا دور دورہ ہو، وہاں سنجیدگی کے ساتھ حقائق و واقعات کی جستجو کی توفیق لوگوں کو کیون ہونے لگی۔

بہر کیف درد کا یہ افسانہ تو بہت طویل ہے اور اپنے گذشتہ مقالہ میں اس مسئلہ کے متعلق فقیر کافی چیزوں کا تذکرہ کر چکا ہے۔

اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کروں جن میں مسلمانوں کی حکومت میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کے مختلف طبقات اور جس طرح اس حکومت کے زیر اثر علاقوں میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے ، اس کے متعلق ان تاریخی شہادتوں کو درج کروں جو کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں ۔

اُس سلسلہ میں پہلی قسط ان لوگوں کے حالات پر مشتمل ہوگی ، جنہوں نے طبابت ، علاج و معالجہ کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کے بعد خیال ہے کہ تجارتی کاروبار کرنے والوں کا ذکر کیا جائے۔ اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے والون کے حالات اگر وقت میں گنجائش نکلی تو آپ کے سامنے ان شاء اللہ آتے رہیں گے۔

Marfat.com

قطع نظر ایک علمی خدمت کے ایک غرض مضمون نگار کی یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کے طرز عمل کے متعلق جو عام غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کا بھی ازالہ ان شاء اللہ ان شہادتوں سے ہوسکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمین کے جن علاقوں میں سیاسی اقتدار سے آج مسلمان محروم ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب ان کے جینے کی کیا صورت ہوگی۔ طرح طرح کے وسوسوں میں یوں بھی مبتلا ہیں اور مشرکانہ جراثیم سے جن مسلمانوں یا ان کے رہنماؤں کے دل و دماغ ماؤف ہیں وہ بھی مستقبل کی ہیبت ناک تصویریں ان کے سامنے کھینچ کھینچ کر گویا کچھ ایسا باور کرا رہے ہیں کہ سیاسی اقتدار کے بغیر نہ کوئی قوم ہی زندہ رہ سکتی ہے اور نہ کسی قوم کے افراد۔ عاف رومی نے شاید اسی قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ:

تو مرا چون برّہ دیدی بے شبان — تو گمان بردی ندارم پاسبان
بے شبان دانستہ اند آن ظلمی را — رائگان دانستہ اند آن سبی را
کے کم از برّہ کم از بز غالہ ام — کہ نہ باشد حارس از دنبالہ ام

پھر شرک کا شاخسانہ جن کی ایمانی بصیرتوں پر چڑھا ہوا ہے، ان کو چونکاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ (ج)

حارے دارم کہ ملکش می سزد — اندان بادے کہ بر من می وزد
سرد بود آن باد یا گرم آن علیم — نیست غافل نیست غائب متیم

اور یہی مسلمانوں کو سمجھایا بھی گیا تھا، زندان مصر میں قیدیوں کو تلقین کرتے ہوئے سیدنا یوسف علیہ وعلی نبینا الصلوۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ:

﴿ما کان لنا ان نشرک باللہ من شئی ذلک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون﴾ (۵)

Marfat.com

میرے لیے کسی طرز تجزیہ ادا نہیں رکھا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی
ہم شریک کرو۔ بنا بھی ہمیں نہ یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور تمام انسانیت
پر مگر بہت سے لوگ اس فضل الٰہی کا شکر ادا نہیں کرتے۔ ان کا یہ طرز عمل
ان آیت جس کا مطلب ان کے تمام اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔ ہمارے پیدا کرنے والے
خالق قدیر نے دوسروں کے محتاج ہونے کے لیے ہمیں نہیں چھوڑا بلکہ
ہر چھوٹی بڑی ضرورت کی کفالت ہر بندہ کی اس نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔
ضرورتوں کا محتاج بنا کر اس نے ہمیں ضرور پیدا کیا ہے لیکن کسی کے لیے
کا یہ کرم اور کیسی عظیم مہربانی ہے کہ ہماری ہر محتاجی کا تعلق صرف اپنی ذات کے
کے ساتھ قطعاً نہیں رکھا ہے۔ ہم محتاج ضرور ہیں لیکن ہر ایک پیدا کرنے والے
خالق کے جو ہمارا ذو القوۃ المتین رازق ہے۔ ہاں ایک کے محتاج بن کر ہر ایک کی
محتاجی کی ذلت و رسوائی اور در در بھٹکنے کی خواری سے آزاد ہیں۔ یہی
اللہ کا وہ فضل ہے جس کا کفران شکر انسان بہت کم کرتا ہے۔ اسی ناشکری کا نتیجہ ہے کہ
اس ایک کی محتاجی سے لاپرواہی اختیار کرنے والے ہر ایک کی محتاجی کا طوق گلے میں
ڈالے مارے مارے پھرتے ہیں۔ فضل و کرم کی مذکورہ بالا عجیب و غریب حقیقت کو
واشگاف کرنے کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار ﴾

''کیا بہت سے متفرق طرز طریق کے پروردگاروں کا ہونا بہتر ہے یا جو
ایک سب پر غالب و قاہر اللہ ہے اس کی پروردگاری بہتر ہے''

جس یقین اور یقین کی روشنی کو ایمانی وجدان ان قرآنی آیتوں میں پاتا ہے
ہے، اس کے بعد خواہی نہ خواہی سوچیے کہ سمجھنے والے نے اگر یہ کہا کہ

از خدا خواہم دو زیں غیر خدا ہم بہ شما نا خدا ہم ناخدا

Marfat.com

[illegible] کہ نیم بندہ غیر نہ خدائے دگر ست [illegible]

[illegible] تو اس کے سوا اپنا احساس آخر اور کیا بتائے [illegible]

پس مقصد یہی ہے کہ اپنے اندر کو تو چاہیے کہ قرآن کی اس بخشی ہوئی ٹھنڈی اور خنک روشنی سے مسلمان جگمگا تا رکھیں۔ اضطراب بھی پیدا ہوگا، عقلی اندیشے بھیانک شکلوں میں سامنے آ کر اس روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف دھکیلیں گے۔ پ محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنے علم و یقین کا قطعی ذریعہ ایسا قطعی ذریعہ کہ احساس و علم کے دوسرے سارے ذرائع اس کے مقابلہ میں متہم ہو سکتے ہیں، جو قرآن کی روشنی میں گھومتا اور اسی میں تہہ و بالا ہوتا رہے گا، وہ پائے گا کہ اس سے پیدا ہونے والی ٹھنڈک بھی اس کی روح اور قلب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں پیوست ہے۔

[illegible] "اندر" کو اس حال سے معمور رکھتے ہوئے اپنے باہر کو چاہیے کہ:

﴿لیس للانسان الا ما سعی﴾ (۷) [illegible]

[illegible] "نہیں ہے آدمی کے لیے مگر وہی جو اس نے کوشش کی"۔

[illegible] ﴿للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن﴾ (۸)

[illegible] "جو کچھ مردوں نے کمایا اس سے ان کو حصہ ملتا ہے اور جو کچھ عورتوں نے [illegible] کمایا اس سے ان کو حصہ ملتا ہے" [illegible]

[illegible] یہ یا اسی قسم کی دوسری "قرآنی مسلمات" کے مطابق سرگرم عمل ہو جائیں۔ [illegible] جن واقعات اور سرگذشتوں کا ذکر آئندہ آپ سنیں گے ان میں آپ کو مسلسل ملتا چلا [illegible] جائے گا کہ حکمرانی کے اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود اپنی محنت، محنت سے [illegible] حاصل کیے ہوئے کمالات اور اپنے اخلاص و صداقت وغیرہ صفات کی مدد سے کتنے [illegible] چھوٹے مسلسل بڑے بنتے چلے گئے، نہ صرف عوام بلکہ حکومت میں بھی وقار و وزن کے حاصل کرنے میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوئے۔ یہ قدرت کے مقررہ قوانین ہیں،

Marfat.com

ان قوانین کی پابندی بھی پابندی کے نتائج کو سامنے لائی ہے اور ان قوانین سے لاپروائی اختیار کرنے والوں کو بھی اپنی لاپروائیوں کا خمیازہ بہر حال بھگتنا ہی پڑتا ہے اور قرآنی حقیقت:

﴿ما ظلمنا هم ولكن كانوا انفسهم يظلمون﴾ (۹)

''اور نہیں کیا ہم نے ان پر ظلم، بلکہ اپنے آپ پر انہوں نے خود ہی ظلم کیا''

کے اقرار پر ہر اس شخص اور قوم کو مجبور ہونا پڑا ہے، جس نے اپنے آپ کو مظلومیت کا کبھی شکار پایا ہے۔

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم میں مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

''مسلمانوں کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہیں'' (۱۰)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت لیکن ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر میں وہ مدتوں گھومتے رہے ہیں، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے۔ امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں سارے علوم و فنون جو غیر قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے۔ طب ہی کے سلسلہ میں بڑی بڑی نامور ہستیاں چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے۔ گویا یہ صورتِ حال اضطرار یا مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً دعویٰ غلط ہوگا۔

Marfat.com

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانوں کے دینی احساسات میں رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سو اس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ غزالی مانا کہ چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہیں، لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ غزالی سے سینکڑوں سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی کے نصف میں پیدا ہونے والے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابوں میں یہ شہادت منسوب کی گئی ہے، یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تین حصوں (د) میں سے ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے، اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثلث العلم وکلوہ الی الیھود و النصاری "(۱۱)

''علم کے تہائی حصہ کو مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے''۔

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانوں میں اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان میں پہلے پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی ہجری میں بھی اگر اس سے وہ خالی ہی تھے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیوں کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ نرے ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مالکم کیف تحکمون

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے جس دین کی طرف تنگ نظریوں، کوتاہ فکریوں کو منسوب کرنے والے آج منسوب کر رہے ہیں کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا تو برعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قوموں کے ساتھ ساری فراخ چشمیاں اور رواداریاں جن کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں کیا جاتا ہے، ان کی ضمانت خود مسلمانوں کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر ﷺ کے وسیع طرزِ عمل میں پوشیدہ ہے۔

اس قسم کے چھوٹے موٹے ، نا قابل توجہ واقعات مثلاً رغب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسیؓ ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے عربی زبان میں جیسی کہ چاہیے ، گفتگو نہیں کر سکتے تھے ، تو تاریخ خمیس وغیرہ میں لکھا ہے کہ

"طلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترجمانا و کان فی المدینة یهودی عارفا بالعربی والفارسی" (۱۲)

"تلاش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ترجمان کو مدینہ میں ایک یہودی تھا جو عربی اور فارسی زبان سے واقف تھا"

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا۔ (۱۳)

اور کبھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کا سب سے بڑا ابولہول جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا یعنی سفر ہجرت میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالکل پروا نہ کی کہ اس اہم ترین دینی اقدام میں راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں کر حاصل کی جائے ؟ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ

"استاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ابوبکر رجلا من بنی الدئل هادیا خریتا و هو علی دین قریش" (۱۴)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبیلہ بنی الدئل میں کے ایک شخص کو ملازم رکھا کہ (مدینہ کا) راستہ بتائے گا اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا (یعنی مسلمان نہ تھا)"

Marfat.com

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہی لکھتے ہیں:

"عامل النبی ﷺ یھو د خیبر"(۱۴)

''خیبر کے یہودیوں سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا''۔

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیوں سے معاملہ کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک دو میں محدود نہ تھی۔ دراصل یہ اور اسی کی قوم کے نبوی نمونوں کو پیش نظر رکھ کر شارح بخاری ابن بطال کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ:

"الفقھاء یجیزون استیجارھم عند الضرورۃ و غیرھا"(۱۵)

''علماء اسلام نے غیر مسلم لوگوں کے خدمات سے معاوضہ دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ ضرورت ہو یا نہ ہو''۔

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال میں مسلمانوں کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں۔

اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبوں سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے وہ یمن پہنچا۔ جہاں اس زمانہ میں ایرانیوں کی حکومت قائم تھی۔ لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب میں حارث نے یمن ہی میں حاصل کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جندسابور میں باضابطہ علاج و معالجہ

Marfat.com

میں حذاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ طبی معلومات اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا اور عرب ہی میں عوام وخواص کے علاج ومعالجہ کا مرکز ومرجع بن گیا۔

عمر اس نے کافی طویل پائی، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔ لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں نقل کیا ہے:

"لا یصح اسلامه" (۱۶)

''حارث کا مسلمان ہونا صحیح نہیں ہے''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں اس نے اسلام قبول نہیں کیا اور جیسا کہ طبقات الاطباء میں لکھا ہے:

''حارث رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی تھا، اور آئندہ ابوبکر وعمر وعثمان وعلی ومعاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا'' (۱۷)

اس نے چاروں راشدین خلفاء اور امیر معاویہ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف میں بلکہ ایام حج میں مکہ معظمہ پہنچ کر علاج ومعالجہ کا کام اس نے جاری رکھا اور کیوں جاری نہ رکھتا۔ معمولی تاریخی کتابوں میں نہیں بلکہ حدیث کی مستند کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہو گئے تو ایک طرف آنحضرت ﷺ نے خود سعد کو مشورہ دیا:

"ایت الحارث بن کلده اخا ثقیف فانه متطبب "(۱۸)

''ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے''۔

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ:

"عالج سعدا اصابه"(۱۹)

''سعد جس مرض میں مبتلا ہیں تم اس کا علاج کرو''

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانوں نے آئندہ مسلسل قائم رکھا، ان میں خود ان کے پیغمبر ﷺ کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کر کے صحابہ کو آپ نے دکھایا تھا۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر چاہتے تو مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے۔ خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر میں بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجائش اس مسئلہ میں باقی رہتی ہے کہ آئندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانوں کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشاء خود مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا۔

پیغمبر ﷺ کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی حارث کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں حاصل ہوئے، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، حارث سے بسا اوقات طبی مسائل میں گفتگو بھی فرماتے اور یہی طریقہ امیر معاویہ کا بھی تھا سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مسلمان جب پہنچے اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتوں

Marfat.com

کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہیں کہ عمرو بن عاصؓ صحابی جب حضرت عمرؓ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے تو مصر پہنچ کر عمرو بن عاصؓ کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا تامسطیوس تھا (و)۔ لیکن مسلمانوں میں یحیٰ نحوی کے نام سے مشہور ہوا۔ علاوہ طب و فلسفہ و ادب کے دین مسیحی میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا۔ قسطنطنیہ کے عیسائی دربار میں بڑا رسوخ اسے حاصل تھا اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت میں رہا تھا۔ قیصر کے دربار جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلوثیوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان میں فیوینوس مجتہد کو کہتے ہیں، فلکدونیہ نامی مقام میں صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علمائے دین مسیحی کی جو مجلسیں ہوتی رہیں، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جس میں (۶۳) اسقف یعنی پادریوں نے نمائندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے حضرت عمرو بن عاص کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاصؓ نے بلایا:

"و اکرمه وروی له موضعاً"(۲۰)

''اور اسکی عزت کی اور خاص حیثیت اس کی، ان کی نظر میں قائم ہوگئی''۔

قفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ۔

"فلا زمه و کان لا یکاد یفارقه"(۲۱)

''اور اس کو عمرو بن عاص نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے''

پھر دونوں کے تعلقات کی تفصیل کی ہے۔

Marfat.com

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہؓ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے وہی مرکز وحید تھے۔ اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی رکھتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دوسرے صیغوں اور محکموں کے سوا ان کے دربار میں بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیوں یعنی غیر مسلم اطباء کے ہاتھوں میں ہے، جن میں ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہیں، مگر مسلمانوں میں ابوالحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے تذکروں اور ان کے قصوں سے کتابیں معمور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج و معالجہ میں مشہور تھا اور ابو الحکم دواسازی میں امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطباء میں ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ:

''جب حضرت معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق میں کیا تو ابن اثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح وشام اس سے گفتگو کرتے''۔ (۲۲)

اسی طرح ابوالحکم کے متعلق یہ لکھ کر کہ کان طبیبا نصرانیا (یعنی وہ ایک عیسائی طبیب تھا) لکھا ہے کہ

''طبی امداد امیر معاویہ اس سے بھی حاصل کرتے اور دواؤں کی ترکیب میں اس پر بھروسہ کرتے تھے'' (۲۳)

جب گورنروں اور گورنروں سے بھی آگے بڑھ کر خود وقت کے حکمران کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کی اسلام کے آغاز یعنی عہد صحابہ ہی میں یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانوں میں ان غیر مسلم طبیبوں کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی۔

دوسری صدی کے امام، امام شافعی سے لے کر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیوں کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانوں کے

عام علاقے غیر مسلم طبیبوں سے بھرے ہوئے تھے، کیا مذکورہ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ دین سے بعد، یا طول امد، کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا۔

میں تو کہتا ہوں کہ تاریخوں میں یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا کہ امیر معاویہ کے دربار کا یہی عیسائی طبیب یا دواساز ابوالحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم میں مکہ معظمہ آیا، اور ساتھ ساتھ رہا، یا عباسیوں کے زمانہ میں اسی ابوالحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی، عباسی گورنر عبدالصمد بن علی نے اپنے علاج کے لیے مکہ بلوایا (۲۴) اور مسلمانوں کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہیں ہوا، تو اس کیوجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی کہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حارث بن کلدہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر ﷺ کے حکم سے انجام دے چکا تھا۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنی طبقات میں کیا ہے۔ یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر مکہ معظمہ پہنچا اور وہیں اس نے مطب قائم کیا، طبقات کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"کان عبد الرحمن ابو داؤد نصرانیا و کان رجلا من اهل الشام و کان یتطبب فقدم مکة فنزلها" (ز)(۲۵)

"عبدالرحمٰن جس کی کنیت ابوداؤد تھی ایک عیسائی تھا، شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا، پھر مکہ آیا اور وہیں رہ پڑا"۔

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبدالرحمٰن الطبیب النصرانی کے تذکرہ میں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہاں قائم کیا، ابن سعد کا بیان ہے کہ:

"عبد الرحمن یجلس فی اصل منارة المسجد الحرام من قبل

Marfat.com

الصفا''(۲۶)

''کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو مینارہ تھا عبدالرحمٰن اسی مینارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھے''۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے؛ ذرا اندازہ کیجیے مسلمانوں کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر میں آ کر قیام کرتا ہے، جہاں ان کی نمازوں کا قبلہ اور بیت اللہ ہے، جس کا وہ حج کرتے ہیں اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے مینارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے۔ لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفاء قریش میں آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی۔ ابن سعد ہی میں ہے:

''و والی ال جبیر بن مطعم بن عدی ''(۲۷)

''موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے خاندان والوں سے عبدالرحمٰن نے قائم کیا تھا''۔

آج دنیا میں ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہیں، جہاں اس لیے کہ مسلمانوں کی آبادی اتفاقاً اقلیت کے داغ سے داغدار ہوگئی ہے، اکثریت والوں نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے اور کہا جاتا کہ اپنے عہد اقتدار میں غیر قوموں کے ساتھ موجودہ مسلمانوں کے باپ دادوں نے جو سلوک کیا تھا، یہ اسی کا انتقام ہے۔

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلے میں تاریخ کی شہادتیں کیا ہیں؟ یا جرم کی سزا ان لوگوں کو دینی، جنہوں نے خود کوئی جرم نہیں کیا ہے مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمہارے باپ داداؤں نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً وعقلاً کس حد تک غیر مجرموں سے بدلہ لینا درست ہوسکتا ہے۔ ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے میں صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ان ہی

Marfat.com

باپ دادوں کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے جو اپنے مقدس ترین شہر میں بھی اپنی اس سب سے بڑی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے گذشتہ آباء واجداد جن پر تنگ نظری اور قومی وملی عصبیت کے مریض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہیں، کاش اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہوکر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا، کہ جن گذرے ہوئے بزرگوں کو طعن وتشنیع کا آج نشانہ بنایا جارہا ہے۔ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہیں اتنی وسیع تھیں اور اسی بنا پر ایسی باتیں وہ کر گذرتے تھے کہ جن کو کرنا تو کرنا، شاید عہدِ جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہیں لاسکتے۔

دور کیوں جایئے، اسی طب وطبابت کے قصہ میں ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیر بن بخت یشوع کے تذکرے میں یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار میں بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کر کے کہا:

''تم جانتے ہو، میرے دل میں تمہاری کتنی جگہ ہے'' (۲۸)

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانوں سے بھرے ہوئے دربار میں کہنا شروع کیا:

''خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہاں کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہیں ہوتا اسی میں موقف ہے)، جبرئیل میں نے تیرے لیے دعائیں کیں اور بہت زیادہ دعائیں کیں''۔ (۲۹)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانوں میں جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہیں، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہارون اس وقت کیا

Marfat.com

کہہ رہا تھا اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کر رہا تھا، جذبہ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جس پر عمل کر کے ہارون نے دکھایا۔ مسلمانوں پر جنہوں نے احسان کیا ان کو وہ کہیں نہیں بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں اور حد یہ ہے کہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نا مقبول نہیں ہوتی، درباریوں سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ:

''میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے۔ اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے''۔

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر دربار والوں نے کہا:

"صدقت یا أمیر المومنین "(۳۰)

''آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر''۔

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی کرہ پر حبشہ (ابی سینا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محلِ وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں بآسانی اس علاقے کو بھی شریک کر سکتے تھے۔ مگر اسی جذبہ امتنان و تشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشور کشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقہ میں گھستے چلے گئے لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اسلیے نگاہ غلط

Marfat.com

انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی۔ حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے۔

کچھ بھی ہو، میرا ناچیز خیال یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے خدمات سے استفادہ کے سلسلہ کو آئندہ جو جاری رکھا اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت و خلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ میں اطباء کے ساتھ مروانی حکمرانوں کے جو تعلقات تھے، ان میں صرف یہی نہیں کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں جو کیا تھا اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالوں کا بھی اضافہ اس کتاب میں اسکی طرف سے عمل میں آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے چالیس دن تک اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ میں رکھا اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانوں میں یہ کتاب پھیلا دی جائے۔ (۳۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جس اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اطباء تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس میں سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات میں ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق میں بجائے مردہ سانپ کے ڈالا جائے۔ "الحیۃ ذکیۃ" (۳۲) "ذبح کیا ہوا سانپ"۔

حالانکہ سانپ خواہ میتہ (مردہ) ہو یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال میں حرام

Marfat.com

ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خیال بھی وہی تھا جو بہت سے دوسرے ائمہ اسلام کا ہے کہ دواءً حرام چیزوں کا استعمال بھی جائز ہوتا ہے (ح)۔ میں خود طبیب نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ تریاق میں سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے۔ آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤں میں مسلمانوں کے لیے عام ابتلا کی جو صورت پیش آ گئی ہے، ارباب علم وفتویٰ چاہیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس ''اثر'' سے سہولت کی راہ پا سکتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدا آیا تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوئے شعلے ان کے زمانہ میں بھڑک اٹھے تھے، جس اسلامی نظام میں ایران کا نومسلم رسول اللہ ﷺ کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج میں دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں (ط)۔

حبشی بلالؓ ان ہی عمر فاروقؓ کا سیدنا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام میں بنی امیہ کے فرمانرواؤں نے عربی وعجمی موالی وغیر موالی کے سوال کو اٹھایا اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا، اس کلمہ مستنہ (بدبو بات) (ی) سے نفع اٹھانے میں کمی نہ کی۔

مگر باوجود اس کے ہم اطباء کے لباس میں ان ہی اموی فرمانرواؤں کی شاہی خواب گاہوں میں یہودی اور عیسائی طبیبوں کو پاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ پہلا مروانی حکمران عبدالملک جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانوں نے ابوالحکم رکھ دی تھی (ک)، پہلے بھی اس کا ذکر آ چکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج میں امیر معاویہؓ نے اس کو

حجاز بھیجا تھا، اسی ابوالحکم کا بیان ہے کہ عبدالملک نے اس کو اپنے زمانہ میں بلالیا، اس کی روایت کے الفاظ ہیں:

"فانی مجالس و عنده بناته"(۳۳)

"میں عبدالملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبدالملک کی لڑکیاں بھی وہاں موجود تھیں"۔

واللہ اعلم درمیان میں کوئی پردہ تھا یا برقع اوڑھ کر باپ کے پاس عبدالملک کی یہ شہزادیاں آئی تھیں۔ میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبوں کو مروانی حکومت میں دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جاسکتا ہے (ل)۔

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جو برتابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم قہار حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں وجہ اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہو کر وہ طبیبوں کا دست نگر ہو گیا تھا، لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بہ یک اشارہ چشم بدل دیا تھا، اس کے لیے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطباء کو اپنے اردگرد جمع کر لیتا، خصوصاً بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطباء کا ذکر لوگوں نے کیا ہے، یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا اور اس کو بھی جانے دیجیے، حجاج کے لیے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ جند سابور کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لیے عربی النسل اطباء کا اسٹاف مہیا کر لیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی

Marfat.com

سب زیادہ سر برآوردہ اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی تھا، نام اس کا لوگ تیاذوق بتاتے ہیں، لفظ کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل ہے، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب ''اخبار الحجاج'' گذر چکی تھی، جس میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کیے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کر کے تیاذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ:

''کان یعتمد علیه و ثیق بمداواته و کان له من الجامکیة الوافر لا والافتقاد الکثیر ''(۳۴)

''حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا اور اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا، حجاج کے ہاں سے غیر معمولی تنخواہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی اور یوں بھی اس کی بہت زیادہ خبر گیری کرتا تھا''۔

یہ بھی لکھا ہے کہ جب تیاذوق مرض موت میں مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لیے براہِ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ:

''لما حضرته الوفاة دخلت علیه اعوده ''(۳۵)

''جب تیاذوق مرض الموت میں مبتلا ہوا تو میں اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لیے''۔

آج ان الفاظ کے وزن کو ہم محسوس نہیں کر سکتے، لیکن حجاج جو اموی حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی و حاکم تھا اور نخوت و کبر میں اس کا جو حال تھا ان امور سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں تیاذوق کی غیر معمولی حذاقت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے

Marfat.com

لڑکے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ:

''بقائے صحت کے متعلق تیاذوق کے طبی مشوروں کو میں نے اپنے تجربہ میں بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا'' (م)۔(۳۶)

یا تیاذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیوں سے حجاج کے دل میں غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات میں گھرا پاتا تھا، تیاذوق جب آجاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لیے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں لوگوں نے تیاذوق کے متعدد لطیفوں کا ذکر کیا ہے جن میں اس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر میں درد تھا، تیاذوق بلایا گیا، اس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤں پر گرم پانی ڈالا جائے، اور تیل کی مالش کی جائے ایک خواجہ سرا جو عموماً خصی ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر میں ہے اور یہ عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤں دھویا جائے، تیاذوق نے کہا کہ میرے دعویٰ کی دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمہارے اندر سے نکالی گئی، وہ کہاں تھی اور داڑھی تمہارے چہرے سے غائب ہوگئی، خواجہ سرا شرمندہ ہوگیا۔

بہر حال عبدالملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہنچے تھے بداوت کہیے یا دہقانیت سے زیادہ دور نہیں ہوئے تھے، جب ان کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کو عزت و جاہ کی ان بلندیوں پر ہم پا رہے ہیں، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ ان مروانی حکمرانوں کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبوں کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہنچ گئی ہوگی، جنہوں نے شاہی خانوادہ میں پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانوں میں جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے جو فخر کرتے تھے کہ میں کسریٰ کا

Marfat.com

بیٹا ہوں اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہے اور خاقان بھی۔ (ن)

سوچا جا سکتا ہے کہ اپنی ہم رشتہ قوموں کے افراد کے ساتھ حسن سلوک میں اگر انے خالص عربی نژاد بزرگوں سے وہ آگے بڑھ گئے ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

افسوس ہے کہ مردانیوں کے اسی سال کے دور حکومت میں دربار سے جن جن اطباء کے تعلق رہا، لوگوں نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابوں میں نہیں کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی میں پاتے ہیں کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصبیعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لیے تیاذوق نے کناش کبیر بھی لکھی تھی اور کتاب الادویہ بھی جس میں بیان کیا ہے کہ:

"کیفیة دقها و ایقاعها و اذابتها و شیٔ من تفسیر الادویة"(۳۷)

''ذواوں کے کوٹنے اوران کے ڈالنے پگھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کیے گئے تھے، اور بعض دواؤں کے نام کی بھی تشریح کی تھی''۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردوں کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی، جن میں ایک یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ:

"کان تیا ذوق المتطبب یقدمه علی جمیع تلامذته"(۳۸)

''تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردوں پر ترجیح دیتا تھا''

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ:

''خدم الحجاج بن یوسف و هو حدث''(۳۹)

''اس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس زمانہ میں خدمت کی تھی جب یہ

Marfat.com

یہودی طبیب جوان تھا''۔

فرات نے کافی عمر پائی ، مزوانیوں کا دور جب ختم ہوگیا اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار میں فرات داخل ہوگیا ، کوفہ کے عباسی گورنر عیسی بن موسی نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا ، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ، عیسی کا وہ صرف طبیب ہی نہیں تھا ، بلکہ سیاسی مشیر بھی ، بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیئے تھے ، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے ، تو عیسی کہا کرتا تھا کہ

''فرات ! تو کتنا صائب الرائے آدمی تھا ، جو بات بھی تو کہتا تھا ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہوکر تیرے سامنے آجاتی تھی ، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہیں ، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا'' (۴۰)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشوروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں ۔ افسوس ہے کہ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے ، ان کے پڑھنے سے ایک طرف جہاں اس کا پتہ چلا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبوں پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانوں کے سلاطین و امراء کرتے تھے ، تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدر شناسوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی بہی خواہیوں پر مبنی تھے ۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا مروانی حکمرانوں کے دربار کے ان طبیبوں کا تفصیلی تذکرہ کتابوں میں نہیں پایا جاتا ، لیکن جب عباسیوں نے اپنے ہاتھ میں مسلمانوں کی حکومت کی باگ لی ، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ میں پیش آیا وہ دیکھنے کے قابل ہے ۔

عباسیوں نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ زیادہ تر کامیابی

Marfat.com

غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرۃ ان کا دربار عجمیوں سے بھر گیا، عموماً مالی کاروبار کا عباسیوں کے زمانہ میں یہودی جھبدوں یا موجودہ اصطلاح میں یہودی بینک کاروں سے تعلق تھا۔

عباسیوں کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطباء اور معالجین کا قصہ ہے، آیئے پہلے اس کو سن لیجیے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے 'جہاندیدہ' کی داستان بھی سنائی جائے گی اگر ''اجل مسمی' نے فرصت نہ دی تو میں دوسرے احباب علم و قلم سے درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ اس مضمون کی تکمیل فرمادیں گے۔

سچ پوچھیے تو غیر مسلم اطباء کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیوں ہی کا عہد ہے، ان کے دربار میں یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی اطباء کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبوں کا بھی داخل ہوگیا تھا کہتے ہیں کہ عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور ضعف معدہ میں مبتلا تھا، اچھا نہ ہوتا تھا ایک ہندوستانی طبیب نے پھکی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی اور اس کے دل میں ہندی طریقہ علاج کا وزن پیدا ہوا، نیز خالد برمکی کو ہند اور ہند علوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیوں کے دربار میں ''ہندی طب'' بلکہ دوسرے ہندی علوم و فنون کی روشناسی میں بہت دخل ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں، ہندوستانی اطباء کی کافی تعداد مختلف زمانہ میں بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا، اردو زبان میں کافی مواد اس سلسلہ میں جمع ہو چکا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطباء اور ہندی طب کی جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ان کی فہرست درج کی ہے جس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ منجملہ اور کتابوں کے ایک کتاب ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام ''علاجات النساء'' تھا، یا اسی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ

ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

"کتاب روسی الھندی فی علاجات النساء"(۴۱)

''روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتوں کے علاج کے متعلق ہے''

میں نہیں جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اس نے انجام دی تھی، دوسروں نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہیں، اور اس زمانے میں اس کے متعلق لوگوں کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو اس کو مسلمانوں کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے حوالہ کر کے میں اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

سب سے پہلے تو اس سلسلہ میں دیکھنے کی خبر یہ ہے کہ دربار خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطباء کی تعداد کیا ہوگی، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی عہد کے امراء بھی اپنے ہاں طبیبوں کی ٹولیوں کو ملازم رکھتے تھے طبقات الاطباء میں مشہور عباسی امیر ابو دلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کان مجلس ابی دلف مجمعا للمتطببین"(۴۲)

''ابو دلف کی مجلس میں طبیبوں کا مجمع رہتا تھا''۔

طبیبوں کے اس مجمع میں جو لوگ شریک تھے، ان میں بعضوں کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''کان معہ من المرتزقة جماعة منھم یوسف بن صلیبا و سلیمان بن داؤد بن بابان و یوسف القصیر و یونس بن حنون "(۴۳)

''امیر ابو دلف کے ساتھ تنخواہ یاب اطباء کا ایک گروہ تھا، جن میں یوسف

بن صلیبا، سلیمان بن داؤد بن بابان ابو یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور یونس بن حنون بھی تھے"۔

نام ونسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہیں تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ مرتزقہ کے سوا:

"ربما اجتمعوا فی مجلسه منهم عشرون رجلا "(۴۴)

"بسا اوقات (غیر تنخواہ دار اطباء میں سے) بیس بیس آدمی اس کی مجلس میں جمع ہو جاتے تھے"۔

افسوس ہے کہ لوگوں نے مفصل فہرست ان طبیبوں کی نہیں دی ہے جو مختلف عباسی خلفاء کے دربار سے تعلق رکھتے تھے لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل میں ایسی چیزیں مل جاتی ہیں، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے جس میں اس نے اپنی اور بختیشوع طبیب کی باہمی کش مکش اور سازش کی داستان کی ہے اسی رسالہ میں حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطباء جو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہیں اور خلفاء کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے ان کی تعداد

"ستة و خمسون رجلا جملتهم من اهل المذهب"(۴۵)

"چھپن ہے اور سب ہمارے ہم مذہب ہیں"

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہوں گے جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے مددگاروں، دواسازوں وغیرہ کی تعداد کیا ہوگی؟

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتوں کی بنا پر میرا خیال ہے کہ طب اور علاج

ومعالجہ کی راہ سے عباسی دور میں غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والوں نے اقتدار واثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہوگی۔ ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت وفراخی کا تصور کیجیے اور سوچیے کہ اس وسیع علاقے کے باشندوں کی طبی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ اس پیشہ کو مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام ہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیوں کے زمانہ میں طبابت کی راہ سے معاش حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتوں کو ترک کر کے یا ان سے لاپروائی اختیار کر کے مسلمانوں کے دلوں میں ان لوگوں نے جگہ پیدا کی تھی۔

ابو جعفر منصور عباسیوں کے دوسرے خلیفہ کا زمانہ ہے۔ جند سابور کی طبی درسگاہ کے پرنسپل جورجس کو منصور بغداد طلب کرتا ہے اور یہ پہلا عیسائی طبیب ہے جو عباسی دربار میں بلایا گیا ہے۔ منصور سے ملاقات ہوتی ہے، اس کی باتوں سے غیر معمولی طور پر منصور متاثر ہوتا ہے اور حاجب ربیع کو حکم دیتا ہے کہ:

''کسی ایسے محل کا انتخاب جورجس کے قیام کے لیے کرو جس میں اپنے خاندان کے خاص عزیزوں کو میں اتارتا ہوں''۔(۴۶)

حکم کی تعمیل کی گئی، جورجس منصور کا علاج کرتا ہے، کامیاب ہوتا ہے، کرسمس کی عید میں جورجس خلیفہ سے ملنے آیا، مل کر جب رخصت ہونے لگا تو خلیفہ نے پوچھا تمہارے ساتھ کیا عورتیں بھی ہیں۔ جورجس نے نفی میں جواب دیا، منصور نے پوچھا کہ تمہاری خدمت کون کرتا ہے جورجس نے کہا میرے تلامذہ اور شاگرد جو ساتھ آئے ہیں، منصور نے کہا اپنی بیوی کو تم ساتھ کیوں نہیں لائے، جواب دیا کہ وہ بوڑھی ہو چکی ہے، سفر اس کے لیے دشوار تھا، جورجس یہ باتیں کر کے گرجا چلا گیا، منصور نے اسی وقت حکم دیا کہ تین نوجوان چھوکریاں جورجس کی قیام گاہ پر پہنچا دی

Marfat.com

جائیں۔ساتھ ہی تین ہزار اشرفیاں بھی بطور عیدی کے منصور نے بھیجیں ، جب جورجس گرجا سے واپس ہوا تو خلیفہ کے بھیجے ہوئے تحفوں کی خبر ملی ،طبقات الاطباء میں ہے کہ لونڈیوں کا ذکر سن کر جورجس آپے سے باہر ہوگیا ، اپنے شاگردوں سے کہا تم لوگوں نے اسی وقت ان کو واپس کیوں نہیں کر دیا اور حکم دیا ابھی ان کو دارالخلافت پہنچا دیا جائے لونڈیوں کی واپسی کی خبر منصور کو ملی ،اسی وقت جورجس کو اس نے طلب کیا اور غصہ میں پوچھنے لگا کہ تم نے یہ اس تحفے کو رد کر دیا؟ جواب میں کسی اضطراب اور پریشانی کے بغیر سکون اطمینان کے ساتھ جورجس نے منصور سے کہا:

''جناب والا! ہم لوگ عیسائی ہیں ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی مکان میں ان کے ساتھ جمع ہوں''۔(۴۷)

آگے جورجس نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے دینی مسلک کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''جناب والا! ہمارے مذہب میں ایک عورت سے زیادہ عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے، جب تک وہ عورت زندہ رہے گی ،ہم لوگ دوسری عورت سے عقد نہیں کر سکتے''۔(۴۸)

جورجس کی اس صاف بیانی سے منصور بہت متاثر ہوا ،اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ وہ بھی کہ بغداد ہی میں جورجس بیمار پڑا ،حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی ، عمر بھی کافی تھی ، منصور اس کی عیادت کے لیے پیدل چل کر اس کے پاس پہنچا ، جورجس سے حال پوچھا ،رونے لگا ،اور رو رو کر عرض کرنے لگا کہ:

''بڑی مہربانی سرکار کی ہوگی اگر زندگی کی ان آخری گھڑیوں میں مجھے اپنے بال بچوں میں پہنچا دیں تا کہ ان کو ایک دفعہ تو دیکھ لوں اور میرا وقت ہی اگر آگیا ہے تو اپنے آباؤ اجداد کے ہڑاوڑ میں دفن ہونے کا موقع ملے گا''۔(۴۹)

منصور جورجس کی خدمات سے زیادہ متاثر تھا، اس وقت اس سے رہا نہ گیا، کہنے لگا:

''جورجس! دیکھو تم مسلمان ہو جاؤ، میں جنت کی ضمانت تمہارے لیے لیتا ہوں''(۵۰)

یہ سننے کی بات ہے ایک مطلق العنان فرمان روا التجا کی شکل میں ایک بات پیش کرتا ہے جواب میں جورجس نے کہا:

''بندہ تو اپنے باپ داداؤں ہی کے دین پر مرنا چاہتا ہے، میرے آباء واجداد جہاں کہیں بھی ہیں وہیں میں بھی جانا چاہتا ہوں، خواہ وہ جنت میں ہوں یا جہنم میں''۔(۵۱)

کہتے ہیں کہ منصور بوڑھے جورجس کے اس جواب کو سن کر ہنسنے لگا دس ہزار اشرفیاں سفر خرچ کے لیے منظور ہوئیں، جورجس اپنے بال بچوں میں پہنچا دیا گیا۔(۵۲)

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ ان غیر مسلم طبیبوں کے اثر ورسوخ کی یہ توجیہ قطعاً غلط ہوگی کہ زمانہ سازی سے کام لے کر انہوں نے کامیابی حاصل کی تھی، یہ صحیح ہے کہ ان میں سب کا حال وہی نہ تھا، جس کا نمونہ جورجس کے استوار کردار میں آپ پا رہے ہیں۔ ان میں جہاں جورجس جیسے لوگ تھے، وہیں یوحنا ابن ماسویہ جیسے عیسائی بھی تھے، اس نے مامون، معتصم، واثق، متوکل ان چاروں عباسی فرمانرواؤں کی طبی خدمت انجام دی تھی، ہارون الرشید نے اسی کو ان کتابوں کے تراجم کی نگرانی کا کام سپرد کیا تھا، جو ایشیائے کوچک کے مرکزی شہروں انقرہ اور عموریہ کے کتب خانوں میں ملی تھیں۔ کہنا یہ ہے کہ اسی یوحنا بن ماسویہ کے متعلق طبقات میں لکھا ہے کہ جورجس کے برخلاف علاوہ بیوی کے اپنے پاس چند لونڈیوں کو

Marfat.com

بھی اس نے رکھ لیا تھا، بغداد کے عیسائیوں کی شماسیت کی نمائندگی بھی کرتا تھا، جو دین النصاریٰ کا ایک عہدہ ہے۔ عیسائیوں کو جب یوحنا کی اس حرکت کی خبر ملی تو انہوں نے مجبور کیا کہ یا لونڈیوں سے تعلقات منقطع کر لے، یا شماسیت کا عہدہ ترک کر دے، کہتے ہیں کہ یوحنا کے سامنے جب یہ مطالبہ پیش ہوا، تو جھلا کر اس نے کہا کہ ہمیں جہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک عورت سے زیادہ عورت نہ رکھیں وہیں یہ حکم بھی موجود ہے کہ ایک جوڑے سے زیادہ جوڑے نہ رکھیں، پھر میں تو صرف شماس ہوں، ہم سے زیادہ اہم دینی عہدہ آج جس کے ہاتھ میں ہے، یعنی بغداد کا جو جاثلیق ہے، گالیاں دیتے ہوئے اس نے کہا وہ بجائے ایک کے بیس بیس جوڑے کپڑوں کے کیوں رکھتا ہے، یہ بھی بولا کہ:

''بد بخت یوحنا تو چار عورتوں کے رکھنے کی وجہ سے اس کا مستحق ہو گیا کہ شماسیت کے عہدے سے دست بردار ہو جائے تو پھر اپنے جاثلیق کو تم لوگ کیوں نہیں کہتے کہ اپنے دین کے احکام کی پابندی کرے، اگر اس کے لیے کپڑوں میں خلاف ورزی دین کی جائز ہے، تو عورتوں کے معاملہ میں ہماری خلاف ورزی بھی قابل برداشت ہونی چاہیے'' (۵۳)

اسی کتاب میں ایک لطیفہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہی یوحنا ایک دفعہ بیمار ہوا، مرض بڑھتے ہوئے مایوسی کی حد تک پہنچ گیا، عیسائیوں کے دستور کے مطابق چند پادری بلائے گئے، اس کے بالین علالت کے نزدیک بیٹھ کر وظائف، اوراد اور دعاؤں میں مشغول ہو گئے، یوحنا نے آنکھ کھولی تو اپنے سرہانے تماشے کو دیکھ کر بولا:

''اے بدکاروں کے بچے، میرے گھر میں یہ کیا کر رہے ہو'' (۵۴)

پادریوں نے کہا کہ خدا تم پر فضل فرمائے اس کی دعا ہم لوگ کر رہے ہیں، سننے کے ساتھ بے ساختہ یوحنا کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگے:

Marfat.com

''ابتدا سے قیامت تک سارے جہاں میں جتنے عیسائی پیدا ہوں گے، یا پیدا ہو چکے ہیں مل کر بھی دعا کریں تو ان کی دعا سے سچ کہتا ہوں گلاب کی ایک ٹکیہ زیادہ کارگر اور مفید ہے'' (س)۔(۵۵)

کچھ بھی ہو، مجھے دوسروں سے اس وقت بحث نہیں ہے مگر مسلمان حکمرانوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ کمال کی قدر افزائیوں میں صاحب کمال کے دینی رجحانات اور مذہبی رویہ کی خصوصیتوں کو انہوں نے کبھی نہیں دیکھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ جورجس جیسے کٹر عیسائی اور یوحنا جیسے رند مشرب لاابالی آدمی، دونوں کی حیثیت عباسی دربار میں برابر تھی۔ جورجس کے ساتھ ابوجعفر منصور جیسے جزءرس، بلکہ شاید بخیل آدمی کی طرف سے فیاضیوں کے تھوڑے بہت قصے تو آپ سن چکے، اب سنیے یوحنا کا حال یہ تو بیان ہی کر چکا ہوں کہ ہارون کے زمانہ میں یونانی کتابوں کے تراجم کا وہ نگران تھا اور بعد کو مامون سے متوکل تک مسلسل عباسی خلفاء کا وہ شاہی طبیب رہا۔

عیسی بن ماسویہ طبیب جو غالباً یوحنا کا شاگرد بھی تھا، اسی سے اپنے مرنے سے تین سال پہلے اس نے بیان کیا تھا کہ اب تک طبابت کے ذریعہ سے ایک ملین دس لاکھ درم میں کما چکا ہوں، واثق باللہ خلیفہ ایک معمولی بات پر یوحنا سے خوش ہوا، اور حکم دیا کہ ایک لاکھ درم اسی وقت اس کے پاس بھیجے جائیں، تھوڑی دیر بعد دریافت سے واثق کو معلوم ہوا کہ یہ رقم اب تک یوحنا کے گھر نہیں پہنچی ہے، حکم دیا کہ بجائے ایک لاکھ درم کے دو لاکھ بھیجے جائیں۔ یہ حکم عصر کے وقت دیا گیا تھا، مگر کسی وجہ سے تعمیل حکم کی عشاء کے وقت تک نہ ہو سکی، واثق کو جب معلوم ہوا کہ رقم اب بھی نہیں بھیجی گئی ہے، تو بجائے دو لاکھ کے انعام کی رقم تین لاکھ کر دی گئی، واثق کا خادم خاص جسے حکم دیا گیا تھا، خلیفہ کے اس رجحان کو پا کر مہتمم خزانہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، کہ بھائی روپے فوراً یوحنا کے پاس روانہ کرو ورنہ اندیشہ ہے کہ واثق آج پورے خزانہ کو یوحنا پر نثار

کردے گا۔ (۵۶)

اسی یوحنا بن ماسویہ کا دلچسپ لطیفہ طبقات میں نقل کیا ہے کہ متوکل خلیفہ ایک دن دجلہ میں تخت بند ہو کر مچھلی کا شکار کر رہا تھا، یوحنا اس کے داہنے جانب بیٹھا تھا، اتفاق سے دیر تک کوئی مچھلی ہاتھ نہ لگی، متوکل نے یوحنا کی طرف خطاب کر کے کہا کہ تو ہی منحوس آدمی ہے کہ آج شکار نہیں ہو رہا ہے، قصہ سننے کا اسی کے بعد ہے، لکھا ہے یوحنا نے متوکل کے اس فقرے کو سن کر کہا کہ:

''جناب والا! بندہ تو کسی معنی میں بھی منحوس نہیں ہوسکتا، میرا باپ ماسویہ خوزستان کا ایک معمولی آدمی تھا اور ماں میری سسلی کی ایک لونڈی تھی جو آٹھ سو درم میں خریدی گئی تھی، پھر میرے اقبال کا دور آیا اور آج میں خلفاء کا ندیم و انیس بنا ہوا ہوں، دنیا مجھ پر رشک کر رہی ہے، بھلا ایسا آدمی کہیں منحوس ٹھہرائے جانے کے قابل ہوسکتا ہے''۔ (۵۷)

اس کے بعد اس نے کہا کہ اگر امیر المومنین کی اجازت ہو تو میں اس شخص کو بتا سکتا ہوں جو واقعی منحوس ہے، متوکل نے کہا کہ بتاؤ کون ہے، یوحنا نے جواب دیا کہ:

''منحوس آدمی وہ ہے جو چار پشتوں سے یکے بعد دیگرے خلفاء کی نسل میں منتقل ہوتا ہوا دنیا میں پیدا ہوا، اور پھر خود بھی خلیفہ بن گیا مگر (تقدیر کی خوبی دیکھیے) کہ وہی اپنے شاہانہ جاہ و جلال، ایوان و محلات کو چھوڑ کر دجلہ کے کنارے بیس ہاتھ کی ایک چوکی پر بیٹھا ہے اور دنیا کی مفلس ترین قوم مچھیروں کی شکل اختیار کی ہے''۔ (۵۸)

آپ سمجھ رہے ہیں کہ منحوس ہونے کا طنز کون کس پر کر رہا ہے یہ طنز ایک عیسائی طبیب کر رہا ہے اور بقول اسی کے جو سسلی کی ایک لونڈی کا بچہ ہے اور جس پر طنز کر رہا ہے یہ مبالغہ نہیں ہے کہ مشرق ہی کا نہیں بلکہ شاید اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقتور حکومت کا بادشاہ اور حکمران ہے۔ لیکن اس کے کمال نے خلیفہ کے دل میں ایسی

جگہ اس کے لیے بنادی تھی کہ بے تکلفی میں وہ اس حد تک پہنچ جاتا تھا۔

اور ابن ابی اصیبعہ نے طیفوری خاندان کے ایک عیسائی طبیب کا ایک طویل قصہ نقل کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ طیفوری اور عباسی دربار کے ایک امیر ابو غانم کے درمیان گفتگو میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ امیر نے طیفوری کو ایک فحش گالی دی جواب میں طیفوری نے بھی اسی گالی کو امیر کی طرف منسوب کر کے دہرایا، امیر جو بیمار تھا، اس نے غصہ میں کہا کہ تیری جسارت اس حد تک پہنچ گئی، طیفوری نے امیر کے اس سوال کے جواب میں جو بات کہی تھی، وہی سننے کے قابل ہے، اس نے کہا کہ:

تمہارا کیا ذکر ہے، خلیفہ ہادی کی خدمت میں جب رہتا تھا، تو ایک دفعہ نہیں بلکہ اس نے کہا کہ:

"لقد کان یسبنی فار دعلیه مثل قوله"(۵۹)

"مجھے جب کبھی گالی انہوں نے دی ہے ٹھیک اسی گالی کو ان پر واپس کر دیا کرتا تھا"

بجائے خود گالی گفتہ، یا پھکڑ بازی کی یہ شکل جتنی بھی بیہودہ اور مستحق نفرت و ملامت ہو، اسلام ہی کیا عام انسانی تہذیب کے لیے بھی یہ صورت حال حد سے زیادہ ناپسندیدہ ہے اور روایت اگر صحیح ہے تو دوسری عام کمزوریوں کے ساتھ سلاطین و ملوک کی مجلسوں کی ایک ناقابل عفو کمزوری اس کو شمار کرنا چاہیے۔

مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کی غیر مسلم رعایا جن کا اصطلاحی نام ذمی ہے۔ ذمی کے اس لفظ کو بلا وجہ رسوا کرنے کی کوشش جو کی گئی ہے اور ایسے مہیب تصورات کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ شاید خود مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال میں گونہ شرمندگی سی محسوس ہونے لگی ہے، حالانکہ اس لفظ ہی میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کے لیے باعث ندامت ہو۔ اردو میں بھی ذمہ کا عربی لفظ مستعمل ہے، مسلمانوں کی حکومت غیر مسلم اقوام کے جن لوگوں کی عزت جان

Marfat.com

و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے، ذمہ کے لفظ کے ساتھ نسبت کی ''ی'' کا اضافہ کر کے ذمی کا لفظ بنا لیا گیا ہے اور رعایا کے اس طبقہ کی تعبیر اس سے کی جاتی ہے، پھر آپ ہی بتایئے کہ اس میں مسلمانوں کے لیے شرمانے کی کیا بات ہے۔ باقی جو سلوک غیر مسلم اقوام کے اس طبقہ کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کرتی تھی، مجھے اس سے انکار نہیں ہے، کہ ''حاکم و محکوم'' میں قدرۃً مراتب کا جو فرق پیدا ہو جاتا ہے، چاہا جاتا یا نہ چاہا جاتا مگر اس فرق کا پیدا ہو جانا ایک طبعی بات تھی، مگر یہ فرق بھی عام حالات میں جہاں تک میں جانتا ہوں، اس سے زیادہ نہ تھا، جو ایک ہی خاندان کے بڑے اور چھوٹے بھائیوں میں پایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے قرآن کے لفظ صاغرین کا ہی مطلب بیان بھی کیا ہے کہ مسلمان جن کو حاکم ہونے کی وجہ سے کبیر یا بڑے بھائی ہونے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، ان کے مقابلہ میں رعایا غیر مسلم طبقہ صغیر یا چھوٹے بھائی ہونے کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے، اسی صغیر کی جمع صاغرین ہے۔ خیر موقع اس مسئلہ کے بسط و تفصیل کا نہیں ہے، یہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ذمیوں کی اس عام قانونی حیثیت کے برخلاف مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ مل جائے جس کی ذمہ داری زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی کسی شخصی اور انفرادی ہستی کے سر عائد ہوتی ہے۔ غصہ میں کسی مسلمان حکمران یا امیر کی طرف سے غیر مسلم رعایا کے کسی فرد کے ساتھ ظلم و زیادتی کی صورت غیظ و غضب وغیرہ جذبات کا وقتی تاثر کے ماتحت اتفاقاً پیش آ گئی ہے، اور غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی آئے دن پیش آتی رہتی تھی، مگر غیر مسلم رعایا کے اس جزئی واقعہ کو کلی قالب کا دستور عطا کر کے آسمانوں کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔

میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ تاریخی اقاصیص و حکایات سے نتائج اگر نکالے جاتے ہیں تو کیا انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا کہ ناگوار حوادث و واقعات کے ساتھ

Marfat.com

ان قصوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا جس کی ایک نظیر طیفوری خاندان کے اس ذمی طبیب کی مذکورہ بالا روایت ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ انبساطی اور بے تکلفی کے تعلقات کی ابتداء ہندوستان کے بعض مغل بادشاہوں کی طرف سے اس وقت ہوئی جب ہنسی مذاق کے رشتے غیر مسلم قوموں کے ساتھ اس بادشاہ نے قائم کیے، مگر آپ کے سامنے اس زمانہ کی تاریخی شہادت پیش کر رہا ہوں، جب سن ھجری کی دوسری صدی بھی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، یہ الہادی، عباسیوں کا خلیفہ جس کا نام موسیٰ تھا اور ہارون الرشید کا بڑا بھائی، ہارون سے پہلے مسند خلافت پر متمکن ہوا تھا اس کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی۔ طیفوری نے اسی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کو گالیوں کے جواب میں ان ہی گالیوں کو ہادی کی طرف منسوب کر کے دہرا دیا کرتا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا مجلسی آداب کے لحاظ سے یہ جتنی بھی گندہ اور گھناؤنی بات ہو مگر ہندوستان کے مغل بادشاہ نے ہنسی مذاق کا رشتہ قائم کر کے ذمی رعایا پر اگر کوئی احسان کیا تھا، تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ تقریباً ہزار سال پہلے مسلمانوں کی تاریخ میں اس احسان کی نظیر قائم ہو چکی تھی اور رشتہ داری کے ان تعلقات کے بغیر قائم ہو چکی تھی جن کی رسم ڈالنے والے نے نہ اسلام ہی کے معاشرتی قوانین اور حدود کی پروا کی اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اپنی رعایا کی عزت و ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری جو اس پر مذہب و اخلاق کی طرف سے عائد ہوتی تھی، اس سے بھی وہ صحیح معنوں میں عہدہ برآ نہ ہوا۔

آپ دیکھ رہے ہیں جو قصہ سنایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ ہی نہیں بلکہ خلیفہ کے دربار کے امیر بھی رعایا کے ذمی طبقہ سے اس قسم کی باتوں کے برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے، بلکہ ملوک اور سلاطین کے متعلق شیخ سعدی کا مشہور مثالی فقرہ یعنی:

Marfat.com

''گاہے بہ سلامے بر نجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند''

اس کے پہلے جزء کی مثالیں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ میں ملتی ہو، یا نہ ملتی ہو لیکن دوسرا جزء یعنی گاہے بدشنامے خلعت دہند کی عملی مثال ان ہی عباسی خلفاء کی زندگی میں نظر آتی ہے اور ان ہی ذمی طبیبوں کے متعلق نظر آئی ہے، اسی طیفوری خاندان کا ایک طبیب اسرائیل بن زکریا بھی تھا۔ خلیفہ متوکل کے وزیر اعظم فتح بن خاقان کا طبیب خاص تھا، لکھا ہے کہ تنخواہ اور انعام کی شکل میں وزیر اعظم لاکھوں روپے کا سلوک اسرائیل کے ساتھ کیا کرتا تھا، وزیر کے اشارے سے شاہی دربار میں بھی اسرائیل کی آمد و رفت شروع ہوئی، متوکل بھی اس کا حد سے زیادہ معتقد ہو گیا تھا، اسرائیل بیمار پڑتا، تو بہ نفس نفیس اس کی عیادت کے لیے خود اس کے گھر جاتا۔

طبقات ہی میں ہے کہ ایک دفعہ تو یہ صورت پیش آئی کہ اسرائیل مرض کے شدید حملہ کی وجہ سے متوکل کے سامنے بیہوش ہو گیا، اس وقت دیکھا گیا کہ اپنے اس ذمی طبیب کے سر کے نیچے بطور تکیہ متوکل اپنے ہاتھ کو ڈالے بیٹھا ہے اور اپنے وزیر فتح بن خاقان سے اپنے قلبی تعلق کا جو اس ذمی طبیب سے اسے ہو گیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا تھا:

''اگر اسرائیل مر گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا، میری جان اب اس کی جان کے ساتھ لٹک کر رہ گئی ہے''۔ (۶۰)

کہنا یہ ہے کہ متوکل نے ایک دفعہ اسرائیل سے مشورہ لیے بغیر پچھنا لے لیا، اسرائیل جب آیا اور اس واقعہ کی خبر ملی تو بیان کیا ہے کہ غصہ سے بھر گیا اور اس وقت تک غصہ میں تمتما تا رہا جب تک کہ متوکل نے اپنے قصور کی معافی چاہتے ہوئے تین ہزار اشرفیوں کے ساتھ ایک مسلم گاؤں کا وثیقہ اپنے دستخط کر کے اسرائیل کے آگے پیش نہ کیا، لکھا ہے کہ گاؤں جو قصور کی معافی کے سلسلہ میں اس ذمی طبیب کی جاگیر میں

Marfat.com

خلیفہ نے دیا تھا اس کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار روپیہ تھی۔(۶۱)

لوگ پڑھتے نہیں ہیں یا پڑھتے ہیں تو سوچتے نہیں، ورنہ ذمی رعایا کے ان طبیبوں کی شان وشوکت، ثروت و دولت کے قصے کیا کوئی چھپی ڈھکی بات تھی۔ اسی طیفوری خاندان کے طبیب اسرائیل بن زکریا کے حال میں ابن ابی اصیبعہ نے بعض تاریخی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جب اسرائیل سے متوکل مانوس ہوگیا تو اسرائیل ترقی کرتے ہوئے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ جس وقت اسرائیل اپنے گھر سے نکلتا تھا تو اس کی سواری بغداد کے بازاروں میں اسی شان سے نکلتی تھی، جس شان سے بڑے بڑے نامور اور فوج کے ممتاز ترین افسر اور سپہ سالار نکلا کرتے تھے''۔(۶۲)

آگے بیان کیا ہے کہ

''اسرائیل کے موکب کا حال یہ تھا کہ آگے آگے ہاتھوں میں کوڑے اور تازیانے لیے ہوئے سوار اور پیادے ہوتے''۔(۶۳)

بغداد کے بعد جیسا کہ معلوم ہے، عباسیوں نے اپنا دوسرا دارالخلافہ سرمن راء کو قرار دیا تھا، جسے آج کل لوگ سامرہ کہتے ہیں، اسرائیل کے لیے متوکل نے جب چاہا کہ سرمن راء میں اس کے محل کے لیے کسی زمین کا انتخاب کرے، تو اپنے شاہی اسٹاف کے دو اہم ارکان صقلات اور ابن نجیری کو حکم دیا کہ اسرائیل کے ساتھ سرمن راء کا دورہ کریں اور جو جگہ پسند آجائے خواہ وہ کہیں ہو اسی کو اسرائیل کے لیے مختص کردیں۔ اسرائیل نے جس جگہ کو پسند کیا، فوراً ان دونوں نے اس پر ستون قائم کردیا اور تین لاکھ درم تعمیر مکان کے لیے اسی وقت اسرائیل کے سپرد کردیئے۔(۶۴)

اب میں کیا عرض کروں، کہنے والے کہتے کہ مسلمانوں کی غیر مسلم ذمی رعایا، اسیر اور غلامی کی زندگی بسر کرتی تھی، دیکھ رہے ہیں آپ غلاموں کے ٹھاٹھ باٹھ کو،

Marfat.com

اور اسرائیل کی کیا کوئی استثنائی نظیر ہے۔ اس وقت تک میں نے بعض سباء سے جو حالات بیان کیے ہیں کیا یہ غلاموں کے حالات ہوتے ہیں، اسی کتاب طبقات الاطباء میں چوتھی صدی ہجری کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام ابوالخیر الحسن بن سوار بن بابا بن نبیام تھا، اور عام طور پر ابن الخمار کے نام سے مشہور تھا، ابن ابی اصیبعہ اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ:

"کان هذا ابو الخیر الحسن نصرانیا "(٦٥)

''یہ ابوالخیر الحسن عیسائی تھا''

آگے اس کے علم وفضل کی تعریف کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ سریانی زبان سے اس نے بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں، یہ بیان کیا ہے۔

"فاذا دعاه السلطان رکب الیه فی زی الملوک و العظماء، حتی انه ربما حجبه فی هذا الحال ثلثمائة غلام ترکی بالخیول الجیاد و الهیئة البهیه "(٦٦)

''جب اس کو بادشاہ (محمود شاہ سلجوقی) بلاتا تھا، تو ملوک اور امراء کے لباس میں نکلتا، بسا اوقات دیکھا گیا کہ اس کی سواری میں تین سو ترکی غلام بہترین گھوڑوں پر بہترین لباس میں سوار آگے پیچھے سے اسے گھیرے ہوئے ہیں''۔

یہ ہیں مسلمانوں کی حکومت کے ذمی جن کی غلامی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے، تین تین سو غلاموں کے جھرمٹ میں جن ذمیوں کی سواریاں مسلمانوں کے شہروں میں نکلا کرتی تھیں آج باور کرایا جارہا ہے کہ وہی غلاموں کی زندگی بسر کرتے تھے، بھلا جن کے غلام بھی بہترین ترکی گھوڑوں پر پرتکلف لباس میں باہر نکلتے تھے، ان ہی ذمیوں کے متعلق غلامی کے تصور کی بھی گنجائش ہے۔

اور مسلمانوں کی تاریخ کی کیا یہ کوئی استثنائی مثالیں ہیں جو کچھ آپ سن چکے

Marfat.com

ہیں، استثناء وشذوذ کے دعوی کی تردید کے لیے وہی کافی ہیں، مگر میں تو اس سے بھی آگے بڑھنا چاہتا ہوں، دیکھئے عباسیون کا خلیفہ ہارون الرشید ہے، روئے زمین کا اپنے عہد میں سب سے بڑا طاقتور حکمران اگر اسے نہ مانا جائے تو اتنی بات بہر حال تسلیم کرنی پڑے گی کہ اپنے محروسہ کا وہ مطلق العنان فرمانروا ضرور تھا۔ سنیے تاریخ کی شہادت جبرئیل بن بخت یشوع اس کے دربار کا مشہور عیسائی طبیب ہے، طبقات الاطباء میں ہے کہ رفتہ رفتہ ہاون الرشید نے اسی ذمی کے متعلق یہ اعلان کر رکھا تھا کہ:

"کل من کانت له الیَّ حاجة فلیخاطب بها جبریل لا نی افعل کل ما یسألنی فیه و یطلبه منی"(٦٧)

"جس کسی کو مجھ سے کوئی ضرورت ہو چاہیے کہ اپنی اس ضرورت میں وہ جبرئیل سے خطاب کرے، کیونکہ میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جبرئیل مجھ سے جو کچھ بھی چاہے گا، اور مانگے گا میں وہی کر کے رہوں گا"۔

لیجیے اب تک تو آپ نے مسلمانوں کی ذمی رعایا کو اپنے غلاموں کے درمیان ان کے شہروں میں نکلتے دیکھا تھا، لیکن ہارون الرشید کے اس شاہی فرمان نے جبرئیل کو اقتدار واختیار کے کس مقام تک پہنچا دیا، ابن ابی اصیبعہ کی اسی روایت کے آخر میں ہے کہ:

"فکان القواد یقصدونه فی کل امورهم"(٦٨)

"(ہارونی فوج) کے سپہ سالار جبرئیل ہی کی طرف اپنے سارے معاملات میں رجوع کرتے تھے"۔

بڑے بڑے مسلمان سپہ سالار اور فوجی آفیسر بھی اسی "ذمی جبرئیل" کے دست نگر ہو گئے تھے اور قواد یعنی فوجی افسرون کا ذکر تو مثالاً کیا گیا ہے، ورنہ ہارون نے تو طے ہی کر دیا تھا کہ جبرئیل کے توسط کے بغیر میں کسی کی کچھ سنوں ہی گا نہیں،

Marfat.com

اور جو کچھ جبرئیل کا فیصلہ ہوگا، اسی کو نافذ کروں گا، تو مسلمانوں کے بڑے ہوں یا چھوٹے ایسا کون ان میں باقی رہا ہوگا جسے جبرئیل کی ڈیوڑھی کی حاضری پر مجبور نہ ہونا پڑا ہوگا۔ اور ممالک محروسہ عباسیہ کے مسلمانوں کی یہ دست نگری کیا ہارونی عہد تک محدود ہے۔ سنیے تاریخ کی شہادت اسی کتاب میں ہے کہ مامون الرشید جب امین اپنے بھائی کو شکست دینے کے بعد خلافت عباسی کا وارث ہوا تو ابتدا میں جبرئیل اور مامون کے تعلقات مختلف شبہات کی وجہ سے کچھ اچھے نہ تھے، لیکن غلط فہمیوں کا جب ازالہ ہوگیا تو ابن ابی اصیبعہ کے الفاظ میں:

"اکرمه زیادة علی ما کان ابوه یکرمه"(۶۹)

''جبرئیل کی عزت مامون نے اپنے باپ کے زمانہ سے بھی زیادہ بڑھادی''

لکھا ہے کہ اس کے بعد تو مامونی عہد میں یہ دستور ہی نافذ ہوگیا کہ:

"کل من تقلد عملا لا یخرج الی عمله الا بعد ان یلقی جبرئیل"(۷۰)

''جس کسی کا تقرر بارگاہِ خلافت سے ہوتا تھا، وہ اپنے عہدہ کا جائزہ اس وقت تک نہیں لے سکتا تھا جب تک جبرئیل سے نہ مل لیتا''۔

گویا سارے تقررات جبرئیل ہی کے اشارۂ چشم وابرو کے رہینِ منت تھے۔

جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ عباسیوں کے عروج واقبال کا نقطہ کمال ہارونی و مامونی عہد ہے۔ دوسرے لفظوں میں مذکورہ بالا شہادتوں کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوا کہ عباسیوں کے شاداب ترین عہد میں مسلمانوں کی حکومت کی باگ ان کی حکومت کے ایک ذمی رعیت ہی کے ہاتھ میں تھی۔ سیاہ وسفید کا مالک ایک حیثیت سے گویا وہی تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ دیالمہ کے زیر اقتدار آجانے سے پہلے جبرئیل بن بخت یشوع (ع) کا عباسی خلافت پر غیر معمولی اقتدار

Marfat.com

مسلسل قائم رہا، طبقات کی اسی روایت میں ہے کہ مامون الرشید جبرئیل سے اس حد تک متاثر تھا:

"کان عند المامون مثل ابیه"(۷۱)

''مامون کے پاس جبرئیل کی حیثیت گویا مامون کے باپ کی سی ہوگئی تھی''۔

یہ جبرئیل ہی کی خصوصیت تھی کہ سارے امراء و وزراء کے مقابلہ میں اس کو بجائے نام کے مامون اسکی کنیت ابوعیسیٰ کے ساتھ مخاطب کرتا تھا، عربی دستور اور عباسیوں کے دربار کے رسم و رواج سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کنیت کے ساتھ خلیفہ کی طرف سے خطاب کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شاید سر اور لارڈ کے الفاظ میں بھی وہ زور اور قوت نہیں ہے جو کنیت کے ساتھ خطاب میں پایا جاتا تھا۔

ذمی رعایا کا اعزاز مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صرف خشک نہیں تھا؟ کہ شمس العلماء کا خطاب بھی زیادہ سے زیادہ خطاب پانے والوں کو حکومت کی طرف سے ساڑھے چار آنہ روز کا مستحق بنا دیتا تھا۔

آیئے اور دیکھیے، اسی جبریل کے بیٹے بخت یشوع طبیب کا گھر ہے، متوکل کے زمانہ میں اس نے بھی وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا، جو اس کے آباء و اجداد کو میسر آ چکے تھے، بلکہ ترقی کر کے بخت یشوع اس منزل تک پہنچ گیا تھا کہ:

"کان یضاهی المتوکل فی اللباس والفرش"(۷۲)

''خلیفہ متوکل جس قسم کا لباس پہنتا تھا اور فرش و فروش استعمال کرتا تھا، وہی لباس اور فرش بخت یشوع بھی استعمال کرتا تھا''۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ بخت یشوع کے جس محل سرا کی تکلیف اس وقت آپ کو دے رہا ہوں شاید اس کو دیکھ کر آپ فیصلہ پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے کہ مسلمانوں کے خلیفہ متوکل کو یہ باتیں نصیب تھیں یا نہیں۔

Marfat.com

ابن ابی اصیبعہ نے ابوالاصبع الکاتب کے حوالہ سے اس قصہ کو نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ ابوالاصبع کاتب بیان کرتا تھا کہ میں ایک دن بختیشوع کے دولت خانے پر حاضر ہوا، گرمی شباب پر تھی، میں نے بختیشوع کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس پر خس کی متعدد ٹہنیاں چڑھی ہوئی تھیں اور اسی کمرے کے اندر قبہ میں وہ بیٹھا ہوا تھا جس پر دیبا کے پردے پڑے ہوئے تھے، جن کو عرق گلاب، کافور صندل سے بسایا گیا تھا، خود وہ ایک سعیدی جبہ پہنے ہوئے تھا، جس پر ایک بیش قیمت دوشالہ پڑا ہوا تھا۔

راوی کا بیان ہے کہ جب میں بھی اس قبہ میں داخل ہوا جس میں بختیشوع بیٹھا ہوا تھا تو اچانک میں نے محسوس کیا کہ مجھے سخت سردی نے پکڑ لیا، میرے حال کو دیکھ کر بختیشوع ہنسنے لگا اور غلام کو آواز دی کہ مجھ پر چادر ڈال دی جائے، اور جبہ مجھے پہنا دیا جائے، پھر اس نے غلام سے کہا کہ قبہ کے سامنے جو پردہ پڑا ہوا ہے، اسے اٹھا دو، اٹھا دیا گیا میں نے دیکھا کہ اس ایوان کے چاروں طرف غلام گردش کی عمارت برف سے اٹی ہوئی ہے اور بہت سے غلام برف کے تودے پر مسلسل پنکھے کر رہے ہیں اور ان کے اسی عمل سے سرد ہو ہو کر ہوا اس قبہ میں داخل ہو رہی ہے، جس میں بختیشوع بیٹھا ہوا تھا، پھر بختیشوع نے خاصہ طلب کیا، مائدہ (خوان) چن دیا گیا، مشکل ہی سے کوئی اچھی چیز ہوگی، جو اس خوان پر نہ تھی۔ اس کے ساتھ پلیٹوں پر بھنے ہوئے چوزے بھی لائے گئے جن کے گوشت کا رنگ بالکل سرخ تھا، پھر باورچی آیا اور اس نے ان مسلم چوزوں کو توڑ کر ہملوگون کے سامنے کر دیا۔ وہ کچھ اس طرح پکائے گئے تھے کہ ان کا ہر دھڑ دوسرے دھڑ سے بآسانی الگ ہو گیا، چوزوں کی پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے راوی کہتا ہے کہ بختیشوع نے کہنا شروع کیا کہ:

Marfat.com

''ان چوزوں کو بادام اسپغول کا دانہ کھلایا گیا ہے اور پانی کی جگہ ان کو انار کا افشردہ عرق پلا کر پالا گیا ہے''۔(۷۳)

یہ داستان تو گرمی کے موسم کی تھی، سردیوں کے موسم میں بھی یہی ابوالاصبع کاتب بخت یشوع کے یہاں ایک دفعہ پہنچا، دیکھا کہ محل سرا کے ایک بالا خانہ پر بیٹھا ہوا ہے جس کے سامنے ایک پر رونق تر و تازہ باغ تھا، خود اپنے اوپر وہ سمور کا کوٹ ڈالے ہوئے تھا اور چاروں طرف بھاری بھاری ریشمی پردے اور چرمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ سامنے چاندی کی انگیٹھی دھری تھی، جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا اور ایک غلام مسلسل انگیٹھی میں عود کی لکڑی کے تراشے جھونکتا جاتا تھا۔ جب ابوالاصبع بھی بالا خانے کے اس کمرہ میں داخل ہوا تو خلاف دستور غیر معمولی گرمی اسے محسوس ہوئی، بخت یشوع نے کہا کہ اس سخت سرد موسم میں اس گرمی پر تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا، پھر اس نے پردے کو ایک طرف سے ہٹا دیا میں نے دیکھا کہ لکڑی کے کٹ گھروں کے اندر آہنی جالی دار پنجروں میں انگیٹھیاں سلگ رہی ہیں، جن میں کچے کوئلے پڑے ہوئے ہیں اور بہت سے غلام ہیں جو ان ہی انگیٹھیوں کو بھاتیوں سے ہوا دے رہے ہیں۔ جیسے لوہاروں کی بھٹیوں میں بھاتیوں سے ہوا دی جاتی ہے۔ پھر حسب دستور بخت یشوع نے خاصہ طلب کیا، دوسرے لطیف کھانوں کے ساتھ اس دفعہ بھی پلیٹوں میں مسلم پکے ہوئے چوزے آئے مگر اب دیکھا کہ بجائے سرخی کے ان کے گوشت کا رنگ بالکل سفید ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید پورے طور پر یہ پکائے بھی نہیں گئے ہیں۔ طبیعت میں بے کیفی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اتنے میں باورچی آ گیا اور مسلم چوزوں کو جیسے اس نے پہلے بھی الگ الگ کر دیا تھا اس دفعہ بھی یہی کیا، میں نے دیکھا کہ بآسانی جیسے پہلے سب الگ الگ ہو گئے تھے اب کی بھی یہی ہوا، موسم سرما کی رعایت سے ان چوزوں کی

Marfat.com

پرورش جن خاص چیزوں سے کی گئی تھی، بخت یشوع نے ان الفاظ میں اس کو بیان کیا:

''چھلے ہوئے اخروٹ ان چوزوں کو کھلائے گئے اور بجائے پانی کے دہی ان کو پلایا گیا ہے''۔(۷۴)

یہ ہے نقشہ مسلمانوں کی ذمی رعایا کی زندگی کا جن کے متعلق پھیلا دیا گیا ہے کہ غلامی کی رسوا کن زندگی کے سوا ان کی قسمت میں اور کچھ نہ تھا، میں تو نہیں جانتا کہ غریب متوکل کے دور الخلافہ میں بھی گرمیوں اور سردیوں کے موسم یہ ٹھاٹ ہوتا ہوگا۔

اسی ابو الاصبع کاتب کا بیان ہے کہ بخت یشوع کا دستور تھا کہ امراء کے ہاں بطور تحفہ کے نجور میں جلائی جانے والی چیزیں تقسیم کیا کرتا تھا، مگر کس شان کے ساتھ، ایک صندوق میں تو نجورات ہوتے تھے اور اسی کے ساتھ دوسرے صندوق میں کچے کوئلے بھی بھیجے جاتے تھے، جو درخت ترنج، بید اور انگور کی خشک بیل کی لکڑیوں سے تیار کیے جاتے تھے، کوئلہ بنانے کے لیے خوشبودار درختوں کی خوشبودار لکڑیوں کو جلاتے تھے، تو پرانی شراب کے ساتھ عرق گلاب، مشک، کافور، عرق بید مشک کو شریک کر کے آمیزہ تیار کیا جاتا تھا اور جلنے کے وقت مسلسل اسی آمیزہ کا عرق لکڑیوں پر چھڑکا جاتا تھا۔ بخت یشوع کہا کرتا تھا کہ بغیر ان کوئلوں کے صرف نجور کی تقسیم مجھے پسند نہیں کیونکہ معمولی کوئلہ استعمال کر کے نجور کی قیمت بھی ضائع ہو جاتی ہے۔(۷۵)

بہر حال اسی داستان کو میں کتنا طول دوں، کہنا یہی ہے کہ کوئلے جیسی معمولی چیز کی تیاریوں میں ان غیر معمولی تکلفات اور نزاکت مآبیوں سے کام لیتے تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دولت و ثروت، عیش و عشرت میں ان کا کیا مقام ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی تاریخی شہادتوں کے بعد کوئی وجہ نہیں معلوم

Marfat.com

ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی روایات میں شک کیا جائے، جن میں ان غیر مسلم اطباء کی آمدنیوں کے غیر معمولی اعداد وشمار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فیون ترجمان کے حوالہ سے طبقات الاطباء میں جبرئیل بن بختیشوع کی آمدنی کے سیاہہ کی جو نقل پائی جاتی ہے، لکھا ہے کہ جبرئیل کے گھر سے یہ سیاہہ برآمد ہوا تھا اور اس پر اس کے دستخط ثبت تھے۔

جبرئیل نے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہارون الرشید اور مامون الرشید، عباسیوں کے ان دونوں نامور خلفاء کی خدمت کا شرف اس کو حاصل ہوا ہے۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں جو آمدنی اس کو ہوئی تھی، فقط اسی کی تفصیل اس سیاہہ میں درج تھی، لکھا تھا کہ ۲۳ سال ہارون کی خدمت میں رہنے کا موقع مجھے ملا۔

اس عرصہ میں مختلف مدوں سے جو آمدنی جبرئیل کو ہوئی اس کی تفصیل سیاہہ میں یہ تھی۔

مد	رقم
عام تنخواہ	دو ملین ساٹھ ہزار چھ سو درم
انعام	ایک ملین اسی ہزار تین سو درم
نوروز کا انعام	ایک ملین پچاس ہزار ایک سو درم
لباس کے لیے	ایک ملین پچاس ہزار ایک سو درم
کرسمس کی عیدی	ایک ملین پچاس ہزار درم
شعانین کی عیدی میں خلعت کی قیمت	دو ملین تیس ہزار درم
عید الفطر کی عیدی	ایک ملین پچاس ہزار ایک سو درم
فصد جو سال میں دو دفعہ ہارون لیا کرتا تھا، اس کا انعام	دو ملین تیس ہزار درم

Marfat.com

جلاب بھی دوسال میں دو دفعہ دو ملین تیس ہزار درم

خلیفہ لیتا تھا اس کا انعام

اس کے سوا بھی بارگاہِ خلافت کے دوسرے وابستوں سے جو رقوم ۲۳ سال کی ہارونی حکومت کے دور میں جبرئیل کی جیب میں پہنچی، ان کی تعداد اسی سیاہہ کے رو سے نو (۹) ملین دو لاکھ درم ہے۔ علاوہ اس کے خاندانِ برامکہ سے جو رقمیں اس کو ملیں ان کی تعداد بیس ملین چار لاکھ درم تھی، نیز خود اس کی جائداد اور اراضی جو جندسابور، سوس، بصرہ، سواد وغیرہ میں تھی، ہارون کے زمانے تک ان کی آمدنی کی میزان اٹھارہ ملین چار لاکھ درم ہوتی ہے اور قصہ ان ہی رقوم تک محدود نہ تھا لکھا ہے کہ یہ جو کچھ ہے:

"سوی الصلات بحسام فانها لم تذکر فی هذالمدرج"(۷۶)

''خلافت ووزارت و امارت کے اقتدار رکھنے والوں کی طرف سے بیش قرار انعام واکرام کے رقوم کا ذکر اس سیاہہ میں نہیں کیا گیا ہے''۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس کی شخصی آمدنی کا یہ پیمانہ ہو، میرے لیے جس کا سمجھنا اور روپیہ کی شکل میں لا کر اس کی مجموعی تعداد کا بتانا دشوار ہے، اس کے مصارف کا کیا حال ہوگا۔ جبرئیل نے مرنے کے وقت اپنی ساری دولت اپنے لڑکے بخت یشوع کے نام وصیت کی اور خلیفہ مامون الرشید کو وصی بنایا تھا، لکھا ہے کہ:

"فسلمها الیه و لم یتعرض فی شئ منها"(۷۷)

''مامون نے حسب وصیت ساری دولت جبرئیل کی بخت یشوع تک پہنچا دی اور کسی چیز سے اس نے تعرض نہیں کیا''۔

بخت یشوع کی زندگی کے نقشہ کی ایک جھلک گذر چکی۔ گرمیوں میں سردیوں کی کیفیت اور سردی کے موسم میں موسم گرما کا ماحول اپنے محل سرا میں وہ جس

Marfat.com

طریقہ سے پیدا کرتا تھا، یا اس کے چوزوں کو جو خوراک دی جاتی تھی یہ اسی موروثی دولت کی گرمی کا نتیجہ تھا۔ ایک موقعہ پر اسی کتاب میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ بخت یشوع کو پرندوں کے پالنے کا بہت شوق تھا، اسی شوق کے تحت لکھا ہے کہ:

''کان فی وادہ طیر من الطیطویات و الحصانیات و البیضانیات وما یجری مجراھا''(۷۸)

''اس کے محل میں طوطی اور حصانیات و بیضانیات اور اسی طرح کے بہت سے پرندے تھے''۔

واللہ اعلم حصانیات اور بیضانیات اس زمانہ میں کس قسم کے پرندوں کو کہتے تھے۔

متوکل کے زمانہ میں بخت یشوع کی دولت اور اس کے گھر کے ساز و سامان کا جائزہ لیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ اس کے توشک خانہ سے جو کپڑے برآمد ہوئے تھے ان میں:

''دیبا کی ان شلواروں کی تعداد جو سینیسزی سراویل کہلاتے تھے، چار ہزار تھی، ہر شلوار میں آرمینیہ کے بنے ہوئے ریشمی ازار بند پڑے ہوئے تھے''(۷۹)

اس کے باورچی خانہ سے لکڑیاں اور کوئلے وغیرہ جو نکلے، ان کی قیمت ہزار ہا اشرفیوں سے لگائی گئی، یہ صحیح ہے کہ عیسائی طبیبوں کے اس خاص خاندان کو عباسیوں کے عہد میں جو غیر معمولی منافع پہنچے، ان پر ہم دوسرے غیر مسلم اطباء کی آمدنیوں کو قیاس نہیں کر سکتے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عباسیوں کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں جورجس جو اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا، بلایا گیا، یعنی دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں عباسی خلافت سے جورجس کا تعلق پیدا ہوا، اس کے بعد مسلسل اس خاندان میں ایک کے بعد ایک پانچویں صدی کا نصف ختم ہو رہا تھا، اس وقت تک کسی نہ کسی شخصیت کو ہم مسلمانوں کے ممالک میں

Marfat.com

نمایاں حیثیت کا مالک دیکھتے ہیں۔ آخری طبیب اس عیسائی خاندان کا ابوسعید عبیداللہ تھا۔ وفات اس کی ۴۵۰ھ کے قریب قریب کسی سال میں ہوئی، نام اس کا اگرچہ بظاہر مسلمانوں کا معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی عیسائیت کو اس خاندان نے آخر وقت تک باقی رکھا۔ اسی آخری آدمی ابوسعید عبیداللہ کے متعلق بھی طبقات میں لکھا ہے کہ:

''کان جیدا المعرفة بعلم النصاریٰ و مذاهبهم''(۸۰)

''عیسائیوں کے علم اوران کے مذاہب کے متعلق اس کی واقفیت بہت اچھی ہے''۔

جس سے معلوم ہوا کہ صرف عیسائی نہ تھا بلکہ عیسائی مذہب کا ممتاز عالم بھی یہ ابوسعید عبیداللہ تھا اس کا پورا نسب نامہ یہ درج کیا جاتا ہے، یعنی عبیداللہ بن جبرئیل بن عبیداللہ بن بخت یشوع بن جبرئیل ابن بخت یشوع بن جورجس، گویا ذمیوں کا یہ خاندان اپنے عباسی سرپرستوں کے اقتدار و اختیار کے آخری ایام تک عزت و ثروت کی زندگی مسلسل گذارتا رہا، بلکہ بغداد کی خلافت جب صرف لفظی خلافت سے زیادہ باقی نہ رہی تو دوسرے سربرآوردہ مسلمان خاندانوں نے اس کی کوشش کی کہ ذمیوں کا یہ گھرانا اپنے موروثی وقار کو باقی رکھے جس کی تفصیل کی گنجائش اس مختصر مقالہ میں اب نظر نہیں آتی۔

کچھ بھی ہو، جورجس کے خاندان کی خصوصیتوں کا مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر آپ اب تک جو کچھ پڑھ چکے ہیں کیا وہی معلومات اس کے لیے کافی نہیں ہیں کہ غیر مسلم یا ذمی اقوام کے جن طبیبوں کو مسلمانوں کی حکومت میں عیش و آرام، عزت و احترام کے ساتھ زندگی گذارنے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے وہ یقیناً اسی خاندان کی حد تک محدود نہ تھے۔ اس سلسلے میں قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں، بار بار دل میں ایک خیال جو آرہا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے، ممکن

Marfat.com

ہے کہ دوسروں کو بھی وہی خیال کچھ ستا رہا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مروانی و عباسی دونوں حکومتوں کے عہد میں صرف ان ذمیوں کے ساتھ جو طبابت اور علاج معالجہ کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے ان کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کے برتاؤ کا سرسری تماشا تاریخی شہادتوں کی روشنی میں آپ کر چکے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ اس طرز عمل کی حوصلہ افزائی عہد نبوت اور خلافتِ راشدہ کی ان روایات سے ہو رہی تھی، جو غیر مسلم اطباء کے متعلق مسلمانوں میں منتقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔ اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں پر تنقید کرنے والوں کا ایک طبقہ ہر زمانہ میں پایا گیا ہے۔ محدثین، فقہاء، صوفیاء اور اسی قسم کے مذہبی نمائندوں میں ایسے نڈر افراد مروانیوں کے دور میں اور عباسیوں کے زمانہ میں بھی ہمیں مسلسل اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں جو کسی چیز کی پروا کیے بغیر بڑے سے بڑے باجبروت سلاطین اور خلفاء یا ان کے ولاۃ و امراء کو بے جھجک ڈانٹ دیتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ذمیوں کے متعلق بجائے کسی زجر و توبیخ کے عموماً اسی قسم کی چیزیں ہمیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت و حمایت ہی کا وعظ لوگوں کو سنایا جا رہا ہے۔ یہی ہارون الرشید ہے جس کے دربار کے ذمی طبیب جبرئیل کے متعلق آپ سن چکے کہ اس نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جس کی جو ضرورت ہو وہ جبرئیل کے توسط سے میرے سامنے پیش کرے اور مامون الرشید تو اس کو اپنے پدر مہربان ہی کا رتبہ بخشے ہوئے تھا، لیکن بایں ہمہ قاضی ابو یوسف کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی کتاب الخراج میں ہارون الرشید کو نصیحت کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں۔ ان کے بجنسہٖ الفاظ یہ ہیں:

"یا امیر المؤمنین ایدک اللہ ان تتقدم فی الرفق باھل ذمۃ نبیک و ابن عمک محمد ﷺ والتفقد لھم حتی لا یظلموا ولا یوذوا ولا

Marfat.com

یکلفوا فوق طاقتھم ولا یوخذ شی من اموالھم الا بحق یجب علیھم "(۸۱)

''امیر المومنین ! خدا آپ کی مدد کرے، آپ نے مہربانی کرنے میں ان لوگوں کی طرف پیش قدمی فرمائی جن کی ذمہ داری آپ کے پیغمبر اور آپ کے چچا کے بیٹے محمد رسول ﷺ نے لی ہے۔ چاہیے کہ ان کی خبر گیری میں سر گرمی دکھایئے تا کہ ظلم سے بھی وہ محفوظ رہیں اور کوئی ان کو دکھ بھی نہ پہنچا سکے اور برداشت سے زیادہ ان پر کوئی بار نہ ڈالے اور ان کے مال سے غیر قانونی طور پر لینے کی کوئی جرأت نہ کرے''۔

پھر ہارون کو رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث قاضی ابو یوسف نے یاد دلائی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''جن سے ذمہ داری کا عہد قائم ہو چکا (ان ذمیوں) پر جو ظلم کرے گا، یا برداشت سے زیادہ ان پر بار ڈالے گا، میں قیامت کے دن اس کا فریق مخالف (خصم) بنوں گا''۔(۸۲)

انہوں نے اسی کے ساتھ ہارون کو عمر فاروقؓ کی آخری وصیت وفات کے وقت جو کی تھی، وہ بھی یاد دلائی ہے، یعنی:

''ذمی رعایا کے ساتھ جو معاہدہ کیا جائے اسے پورا کیا جائے اور ان پر کوئی قوم اگر حملہ کرے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کو بچانے کے لیے حملہ کرنے والوں سے جنگ کریں اور برداشت سے زیادہ باران پر نہ ڈالا جائے''۔(۸۳)

اسی آخری وصیت کو ادا کرتے ہوئے عمر فاروقؓ نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان ذمیوں کی ذمہ داری خود رسول اللہ ﷺ نے لی ہے، اس لیے ہر اس شخص کو جو میرے بعد میرا جانشین ہو، میں وصیت کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری کو

Marfat.com

پورا کرے۔

قاضی ابو یوسف نے دوسرے بزرگوں کے اقوال واعمال کا بھی اس موقعہ پر ذکر کیا ہے جن سے ذمیوں کے حقوق کی نزاکت کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے۔

بہر حال اس وقت ان حقوق کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، جو اسلام میں رعایا کے اس طبقہ کو دیئے گئے ہیں، معارف ہی میں ایک مستقل مقالہ اس عنوان پر خاکسار ہی کا لکھا ہوا پہلے شائع بھی ہو چکا ہے، بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہارون الرشید جو ذمی اطباء کے ساتھ وہ سب کچھ کر رہا تھا، جس کی داستان آپ سن چکے، تو اس سے چشم پوشی اختیار کر کے ان ہی ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی طرف ہارون کو وہ کیوں للکار رہے ہیں۔ اور وہی کہا، جہاں تک اسلامیات اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ فقیر نے کیا ہے، باوجود تلاش کے آج تک کوئی چیز ایسی نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حکمرانوں پر تنقید کے سلسلہ میں کبھی اس پر بھی کسی نے اعتراض کیا ہو، جو ان ذمی اطباء کے ساتھ مسلمانوں کی رائے اور رعایا دونوں طبقوں کے لوگ قائم کیے ہوئے تھے۔ اور مسلسل ان تعلقات کو جاری رکھتے ہوئے چلے آرہے تھے، زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں کوئی بات اگر ملی تو دوسری صدی کے امام، امام شافعیؒ کا وہ قول ہے، جس کا ذکر آغاز مضمون میں آیا تھا۔ یعنی مسلمانوں سے امام کو شکایت تھی کہ علم کا ایک تہائی حصہ انہوں نے غیر مسلم اقوام کے سپرد کر رکھا ہے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس تنقید کی نوعیت بھی مذہبی تنقید کی نہیں ہے بلکہ اپنے ایک ملی احساس کا اظہار امام نے فرمایا ہے۔ ایک کمال سے اپنی قوم کو وہ خالی پا رہے تھے، چاہتے تھے کہ اس کمال میں وہ بھی حصہ لیں، حالانکہ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل میں مذہبی مطالبہ سے لاپروائی کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا تو یقیناً امام جیسی صاف گو جری شخصیت اغماض اور چشم پوشی سے قطعاً کام نہ لیتی۔

اوّل سے آخر تک ذمی اطباء کے مذکور تعلقات پر اکابر اسلام کی اس طویل خاموشی یا سکوتی اجماع ، بلکہ برعکس اس کے ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت اور حفاظت پر بزرگوں کا اصرار اور مبالغہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہ کے بعض جزئیات کا خیال آتا ہے جو ہماری کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً لباس، وضع قطع، الغرض ایسی چیزیں جن کی تعبیر اس زمانہ میں قومی کلچر سے لوگ کرتے ہیں، ان کے متعلق فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ہر قوم کو حکم دیا جائے کہ اپنے قومی یا کلچری خصوصیات کو ترک کر کے مسلمانوں کا کلچر یا وضع قطع اختیار نہ کریں۔ ہم اس مسئلہ کو فقہ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ اور تو اور متوکل جیسے خلیفہ کے دربار میں بخت یشوع اسی لباس میں داخل ہوتا تھا جو متوکل کا لباس تھا اور متوکل کی مجلس کی آرائش فرش وفروش کے جن سامانوں سے کی جاتی تھی اسی قسم کی چیزوں سے بخت یشوع کا نگارخانہ بھی سجایا جاتا تھا متوکل کے دینی تصلب یا کم از کم اس پر بجائے عقلیت پسند معتزلہ کے اہل السنّت والجماعۃ کے علماء کا جو اثر تھا، اس سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر قوم کی قومی خصوصیتوں کی بقاء کی کوشش کا فقہ کی کتابوں میں جو تذکرہ کیا جاتا ہے اگر اس میں کچھ بھی دینی اہمیت ہوتی تو بخت یشوع میں اولاً اس کی جرأت ہی پیدا نہ ہوتی کہ اپنے قومی لباس کو ترک کر کے وہ مسلمانوں کے خلیفہ کا لباس اختیار کرتا، نیز متوکل مانتا یا نہ مانتا لیکن اہل السنّت والجماعۃ کے جن علماء کے زیر اثر متوکل تھا کم از کم وہ بخت یشوع کی اس غیر قانونی جسارت پر ضرور توجہ دلاتے۔ میرے علم میں ایسی کوئی شہادت نہیں ہے، حالانکہ متوکل جن بزرگوں کے مشوروں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا، ان میں امام احمد بن حنبل جیسے حق گو علماء بھی تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہ کے جن جزئیات کی طرف میں اشارہ

Marfat.com

کر رہا ہوں نہ قرآن کی کسی آیت سے پیدا ہوئے اور نہ رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کو ہم ان کی بنیاد بنا سکتے ہیں۔ بلکہ اربابِ ذمہ یا ذمی رعایا کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے ان میں برعکس اس کے ذمیوں کے حقوق کی نزاکتوں ہی پر زیادہ اصرار پایا جاتا ہے۔ لباس، وضع و قطع، سواری و راہ روی وغیرہ کے سلسلے کے فقہی جزئیات کی تو بو بھی ان روایتوں میں نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ اگر وہ واقعی اسلامی مطالبات ہوتے تو قرآن نہ سہی پیغمبر تو ان کی طرف کچھ اشارہ فرماتے۔ آپ کے کتنے خطوط آج بھی پائے جاتے ہیں جن میں ان ذمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کسی خط میں مجھے ایک حرف بھی نہیں ملتا، جس سے ان جزئیات کی ہلکی سی بھی تائید نکلتی ہو، نجران، ہجر، بحرین کے عیسائی اور مجوسی رعایا کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ان علاقوں کے حکمرانوں کو لکھا ہے۔ لیکن نہ ان ہی میں اور خیبر کے یہود سے جو معاہدہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نہ اس میں ان باتوں کا ذکر ملتا ہے۔

بہر حال الکتاب والسنۃ جو اسلامی قوانین کے حقیقی سرچشمے ہیں، نہ صراحۃً ان جزئیات کو ہم ان میں پاتے ہیں، اور نہ قیاسی نتائج کے لیے کوئی بنیاد ان میں ملتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عہد نبوت کے بعد فتوحات کا دائرہ مسلمانوں کے ہاں جب بڑھا اور مختلف علاقوں میں مختلف قوموں نے مختلف طریقہ عمل ان کے ساتھ اختیار کیے تو اس وقت خاص خاص علاقوں یا جتھوں سے کچھ معاہدے ضرور ہوئے۔ بعض معاہدوں میں معاہدہ کرنے والوں کے خاص حالات کے لحاظ سے ان پر کچھ ذمہ داریاں ضرور عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ یزید بن المہلب مروانی سپہ سالار نے جب طبرستان کو فتح کیا تو طبرستان والوں نے یزید اور یزید کی فوج کو چونکہ کافی اذیت پہنچائی تھی، عہد و پیمان کر کے موقع پاتے ہی مکر جاتے، اور مسلمانوں کو ستاتے، آخر جب پورے طور پر وہ قابو میں آ گئے اور فاتح و مفتوح کے درمیان معاہدنامہ جو

Marfat.com

مرتب ہوا اس میں منجملہ عام باتوں کے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ:

''ہر سال طبرستان کے چار سو آدمی مسلمانوں کے سامنے آئیں گے کہ ان چار سو طبرستانیوں میں سے ہر ایک کے سر پر ایک ڈھال، چاندی کا ایک جام، اور حریر کے غلاف کا ایک تکیہ ہوگا'' (۸۴)

بتایا جائے کہ معاہدہ کے اسی مسودہ کو پیش نظر رکھ کر کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمان جس قوم پر غالب آئیں، ضرور ہے کہ ہر سال اس قوم کے چار سو آدمی سر پر ڈھال، جام نقرئی اور ریشمیں تکیہ لیے ہوئے سلام کو حاضر ہوں۔

بس عہد نبوت کے بعد فتوحات کے سلسلہ میں کسی خاص علاقہ کے باشندوں پر ان کے خاص حالات کے لحاظ سے فوج کے سرداروں نے ایسی ذمہ داریاں اگر عائد بھی کی ہوں، جن کا ذکر نہ الکتاب قرآن میں ہے اور نہ ان کا پتہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں میں چلتا ہے، تو ان کو مسلمان حکمرانوں نے بجائے عام قاعدے کے ایک مقامی اور وقتی بات خیال کر لیا ہو اور اس عہد کے صادق و مخلص علماء و صلحاء کے سکوتی اجماع کی تہ میں بھی یہی راز پوشیدہ ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد نبوت کے بعض مقامی معاہدوں کے مسودوں کی تاریخی صحت کو اگر مان بھی لیا جائے تو خود مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے خالص دین اسلام کا مطالبہ ان کو کبھی نہیں سمجھا۔ بلکہ ایک وقتی مقامی بات تھی، جو اپنے وقت اور مقام ہی کی حد تک محدود رہی۔

مگر کتنی عجیب بات ہے کہ عہد نبوت سے ذمی اطباء کے ساتھ مسلمانوں کے خواص و عوام کے مذکورہ بالا تعلقات کو لوگ کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی مختلف حیثیتوں سے تحریراً و تقریراً کرتے رہتے ہیں۔

لیکن جب ذمیوں کا تذکرہ کہیں آجاتا ہے تو صدیوں کی ان مسلسل

Marfat.com

روایات کو بھول جاتے ہیں یا بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں اور حافظہ کی سطح پر فقہ کی وہی چند گنی چنی جزئیات بعیدہ تیرنے لگتی ہیں، جن کی بنیاد نہ مسلمانوں کے الکتاب میں پائی جاتی ہے اور نہ السنۃ میں اور یہی فقہی جزئیات جن پر کسی زمانہ مین نہ مسلمانوں کی کسی حکومت نے عمل کیا اور نہ ان پر عمل کرنے کی طرف اسلام کے ائمہ وعلماء نے کبھی توجہ دلائی، نہ خود مسلمانوں کی طرف سے ان پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا گیا، وہی حافظے کی سطح سے زبانوں اور قلم کی نوکوں پر پہنچ کر طوفان کی شکل میں ہوا اور کاغذ پر پھیل جاتی ہیں۔

حواشی

الف۔ ﴿فبهداهم اقتده﴾ (الانعام/۹۰)

﴿يهديكم سنن الذين من قبلكم﴾ (النساء/۲۶)

''ان گذشتہ پیغمبروں کی پیروی کرو، تا کہ تمہاری راہ نمائی ان لوگوں کے طریقوں کی طرف خدا کرے جو تم سے پہلے تھے''

یہ اور اسی قسم کی بے شمار آیتوں میں پیغمبروں کی امتِ مسلمہ کو خطاب کر کے جیسا کہ ظاہر ہے یہی بتایا گیا ہے کہ کسی نئی راہ و رسم کی تعلیم نہیں، بلکہ اصولاً انہی باتوں کی تجدید و تازگی یا جو بھلا دی گئی ہیں ان کی یاد دہانی اسلام کے جدید پیغام سے مقصود ہے، جن سے پیدا کرنے والا نسل انسانی کو ہر زمانہ اور ملک میں مطلع کر رہا ہے اور ان کی پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ حکمرانی کے اسلامی ضابطہ کا بھی یہی حال ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہب کے نام سے نہ سہی قانون و آئین کے عنوان سے آج دنیا کی اکثر حکومتوں کی بنیاد میں وہی چیزیں نظر آتی ہیں جن کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے اسلام نے کیا ہے۔ موروثی طور پر قوموں میں یہ باتیں منتقل چلی آ رہی ہیں۔ انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے احترام کا کون منکر ہے، ظلم و تعدی استحصال، بے جا لوٹ کھسوٹ کو دنیا کی کون سی حکومت جائز رکھتی ہے، گویا غیر شعوری طور پر آج بھی حکومتوں کی اکثریت ان ہی بنیادوں پر قائم ہے جن پر اسلامی یا الٰہی حکومت کو قائم ہونا چاہیے۔ بنیادی کلیات کو مان لینے کے بعد ان کے تفریعی جزئیاتی قوالب تک لوگوں کو پہنچنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اگر تلاش کیا جائے تو اسلام کے جزئیاتی قوالب بھی عموماً معلوم ہوگا کہ نئے نہیں ہیں، چوری کی سزا حد یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں جیسا کہ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھی کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، بلکہ ویاس جی نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ پراچین اتہاس (قدیم تاریخی قصہ) ہے، بیان کیا کہ جو ڈنڈ چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو، اس درخواست پر راجہ نے حکم دیا کہ ''دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو'' (دیکھو مہابھارت شانتی پرب ساتواں ادھیائے) جس سے

معلوم ہوا کہ پراچین عہد کا یہ قدیم قانون تھا۔

ب۔ تفصیل کے لیے منجملہ اور کتابوں کے خاکسار کی کتاب النبی الخاتم دیکھی جا سکتی ہے، جس میں عہد نبوت میں کام آنے والوں کی فہرست بھی شریک ہے۔

ج۔ مثنوی شریف کے مندرجہ اشعار اگرچہ صاف اور سیدھے ہیں، مگر فارسی سے ناواقفیت بہ تدریج اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ شاید بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اس لیے خلاصہ ان کا درج کر دیا جاتا ہے دیکھنے والوں کو خطاب کر مولانا نے فرمایا ہے کہ

''یہ دیکھ کر کہ جیسے بکری کے بچے کا چرواہا نظر نہ آیا ہو تم نے اسی حال میں مجھے پا کر یہ خیال کر لیا ہے کہ میرا کوئی محافظ اور نگہبان نہیں ہے، ہرن کو تم دیکھ رہے ہو کہ اس کا چرواہا تو کوئی نہیں ہے، تم نے یہ سمجھ لیا کہ مفت یہ قیدی ہاتھ آ جائے گا، مگر یاد رکھو! کہ تمہیں نظر آئے یا نہ نظر آئے بہر حال، مینڈھے اور بکری کے بچوں سے ہم کم نہیں ہیں، یعنی جیسے ان جانوروں کے پیچھے پیچھے بہر حال چوہان اور رکھوالا بھی ہوتا ہے ہم بھی ایک رکھوالا اور اپنا پاسبان رکھتے ہیں، یہ پاسبان ہمارا وہی ہے جسے صحیح معنوں میں دنیا کی بادشاہت سزاوار ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے یعنی کہ اس ہوا کو بھی جو ہم پر چل رہی ہے جانتا ہے کہ وہ گرم ہے یا سرد۔ پس یاد رکھو! کہ ہمارا یہ نگہبان نہ غافل ہے اور نہ عائب، ہاں شرک کی جھلی کی وجہ سے تمہاری ایمانی بینائی کو وہ نظر نہیں آ رہا ہے، تم بیمار ہو''۔

د۔ بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس میں امام شافعی تھے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادب ولغت ان ہی تین علوم کو اہمیت دی جاتی تھی، خود امام شافعی نے علم کی ان تینوں قسموں میں کمال پیدا کیا تھا۔ علم الادیان اور علم اللسان میں ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے، لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کی گویا عام شہرت نہیں ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم میں ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بقراط کی کتابیں مصر کے بعض اطباء نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی۔ (دیکھو، توالی التاسیس، ص ۶۶، ابن حجر عسقلانی، تلاش بسیار کے بعد بھی کتاب میسر نہیں آئی) (از محقق)

ھ۔ غیر قوموں کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام جب عرب

Marfat.com

سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانوں کو بھی انہوں نے سیکھا اور ان کے مفید رسم ورواج کو اختیار کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ جو صحابہ میں امام المحدثین سمجھے جاتے ہیں، خطیب بغداد نے تاریخ بغداد میں مشہور محدث ابراہیم حزلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابو ھریرہ یکلم صبیانه و اهله بالنبطیه ابو ہریرہ اپنے بچوں اور اپنے گھر کے لوگوں سے نبطی زبان میں گفتگو کرتے تھے (تاریخ بغداد، ۳۶/۵، خطیب بغدادی، احمد بن علی، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۹۳۱ء) عراق کے سواد یہاتی علاقہ میں جو زبان بولی جاتی تھی، وہ فارسی اور عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ میں صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابوں میں ملتی ہیں، بلکہ تاریخ خمیس کی مندرجہ بالا روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جبرئیل نے فارسی زبان سکھلائی۔ (تاریخ خمیس، ۳۵۳/۱، الدیار بکری، حسین بن محمد، بیروت، دار صادر، س، ن)

و۔ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں پہلے نام کا اور تاریخ الحکما میں قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے۔

ملاحظہ ہو،

۱۔ طبقات الطبا، ۱۰۴/۱، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ

۲۔ اخبار الحکماء، ص ۲۳۳، قفطی، جمال الدین یوسف، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۶ھ

غیر عربی ناموں کے متعلق عربوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جانا محل تعجب نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے نام کو آج یورپ والے کن کن شکلوں میں بگاڑ رہے ہیں اسی پر قیاس کر لیجیے

ز۔ اس بات پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور میں حرمین شریفین میں غیر مسلموں کے داخلے پر سخت پابندی ہے تو اس زمانے میں اس کی اجازت کیسے دی گئی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حرم مکی اور مسجد الحرام میں کفار کے داخل ہونے کے بارے میں ائمہ اربعہ کی آراء مختلف ہیں۔

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک حرم مکی کے اندر کفار کا داخلہ بالکل ممنوع ہے۔ البتہ ان کے ہاں اگر کوئی ضرورت درپیش ہو تو مسجد الحرام کے علاوہ کسی اور مسجد میں کفار داخل ہو سکتے ہیں۔ مالکیہ کا یہ کہنا ہے کہ مسجد الحرام میں تو کفار کا داخلہ ممنوع ہے البتہ حرم مکی کے

Marfat.com

اندر وہ لوگ اجازت یا امان حاصل کر کے کسی ضرورت کے تحت داخل ہو سکتے ہیں۔ (حرم اس علاقہ کو کہتے ہیں جہاں سے حجاج احرام باندھ کر داخل ہوتے ہیں۔ اس جگہ سے آگے بغیر احرام کے داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ یہ کافی وسیع حدود ہے۔ جبکہ مسجد الحرام خاص اس مسجد کو کہتے ہیں جہاں بیت اللہ واقع ہے)۔

حنفیہ اس معاملے میں وسیع النظر ہیں۔ ان کے ہاں کفار تمام مساجد بشمول مسجد الحرام و مسجد النبوی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو مسلمانوں کی اجازت ضروری ہے اور نہ ہی کسی ضرورت کا ہونا شرط ہے۔

اب اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں شاید حکومت کا قانون بھی یہی ہو کہ کفار حرم مکی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مذاہب کی تفصیل اور ان کے دلائل کے لیے ملاحظہ ہو۔

۱۔ مغنی المحتاج، ۴/۲۴۶، شربینی، محمد الخطیب، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی، ۱۹۵۸ء

۲۔ احکام القرآن، ۲/۷۰، ۶۹، ۴۹، ابن عربی، محمد بن عبداللہ، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۸ھ

۳۔ المغنی، ۱۳/ ۴۸۔۲۴۵، ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، ریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۱۹ھ

۴۔ احکام القرآن، ۱/۲۸۱۔۲۷۸ جصاص، احمد بن علی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

۵۔ شرح السیر الکبیر، ۱/۹۶، السرخسی، محمد بن احمد، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ

ح۔ حرام چیزوں سے دواء استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں امام ابو حنیفہؒ کا فتوی اس باب میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطباء صحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کر دیں اس وقت تک ان کا استعمال جائز نہ ہوگا۔ یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہیے لیکن دوسرے ائمہ کا فتوی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے، دواء حرام چیزوں کا استعمال حرام ہی نہیں ہے، تفصیل کے لیے فقہ کی مطولات کا مطالعہ کیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ میں لیا جاتا ہے یعنی دواء حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر الدمیری نے حیات الحیوان میں نقل کیا ہے کہ جس تریاق میں سانپ ڈالا گیا ہو، امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار

Marfat.com

کی حالت نہ پیدا ہو جائے جس میں قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ (حیات الحیوان (مترجم)، ۱/۸۰۱، الدمیری، کمال الدین، مترجم، مولانا محمد عباس فتح پوری، لاہور ادارہ اسلامیات، ۱۴۱۲ھ)

ط۔ میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے۔

ی۔ عہد نبوت و رسالت میں نسلی وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی،

دعوہ فانها کلمة منتنه (اس کو چھوڑو یہ بدبودار بات ہے)

ک۔ آگے جو قصہ ابوالحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ میں عبدالملک کا ولی عہد ولید بھی اسی کمرے میں داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبدالملک نے تاڑ لیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے۔ عبدالملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

''ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے اور چاہ رہا ہے کہ میں مر جاؤں، دوسری طرف کچھ عورتیں (لڑکیاں) مزاج پرسی کر رہی ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں''۔ (طبقات الاطباء، ۱/۱۱۹)

ل۔ صرف قیاس سے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، طبقات الاطباء ہی میں ابوسہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابوسہل پیش ہوا تو نام پوچھنے پر اس نے اپنا اصل ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام خرخشاہ ذماہ طیما ذاہ، ماذریاد، خسرو، ابھمشاذ ہے اس طویل نام کو سن کر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمہارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہے اب یہی صورت ہے کہ ان تمام الفاظ میں سے طیما ذاہ کے لفظ کو میں چن لیتا ہوں، اسی نام سے تم کو موسوم کیا جائے گا اور جی چاہے تو اپنی کنیت ابوسہل رکھ لو۔ ابوسہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا اور بعد کو ابوسہل کے نام سے مشہور ہوا جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی۔ (اخبار الحکماء، ص ۶۷-۲۶۶)۔

م۔ اگر یہ واقعہ ہے جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ بعضوں نے

Marfat.com

حجاج کو دستر خوان پر کھاتے ہوئے پایا، جتنے لقمے اٹھاتا تھا، انہیں وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی میں ایک کفِ دست مکھن بھرتا اور نگلتا جاتا تھا، اس طرح (۸۴) لقمے میں نے اس کے گنے۔ غالباً تیاذوق کی دواؤں نے اس کے معدے میں ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو تاریخ دمشق، ۷۲/۵، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبعہ روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ) طبقات الاطباء میں ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بھنے ہوئے پستے سامنے رکھ لیجیے اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے۔ حجاج نے درباریوں سے کہا کہ بھنے ہوئے پستوں کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مختلف درباریوں کے گھر سے بھنے ہوئے پستوں کے خوان کے خوان نازل ہونے لگے۔ حجاج نے بھی مٹھیوں میں بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا اور اتنا کھا گیا کہ بدہضمی ہوگئی۔ تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! میں نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کر کے اسے چکھئے آپ نے تو پھانکنا شروع کیا۔ حجاج شرمندہ ہوگیا۔ پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہوگئی۔ (طبقات الاطباء، ۱۲۲/۱)

ن۔ عام تاریخوں میں یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا

انا ابن کسری و ابی مروان و قیصر جدی و جدی خاقان

(مروج الذہب، ۱۷۳/۳، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع الخلی، ۱۳۰۳ھ)

اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے کہ یزید بن الولید کی ماں جس کا نام سار یہ بنت فیروز تھا، کہتے ہیں کہ اس میں واقعی ایران کے کسریٰ روم کے قیصر ترکوں کے خاقان کا خون شریک تھا۔

س۔ قرص کا لفظ اصل عبارت میں ہے غالباً گلاب کی پتیوں کو دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر قرص بنایا جاتا تھا۔

ع۔ جندسابور کا صدر بیمارستان جورجس جو ابوجعفر کے زمانہ میں بغداد جیسا کہ گذر چکا بلایا گیا تھا اسی کا بیٹا بخت یشوع تھا لکھا ہے کہ بخت یشوع کے معنی عبدالمسیح ہیں۔

Marfat.com

بخت کا ترجمہ عبد اور یشوع عیسی علیہ السلام کے نام کا ایک تلفظ ہے، مسلسل نسلاً بعد نسل اس خاندان نے عباسی حکومت میں جاہ وجلال کی زندگی بسر کی۔

حوالہ جات

۱۔ اسد الغابہ، ۲۹۷/۴، ابن اثیر، مبارک بن محمد، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س، ن

۲۔ ایضاً، ۲۳۳/۴

۳۔ تاریخ فیروز شاہی، ۲۱۷/۱، برنی، ضیاء الدین، کلکتہ، ۱۸۶۲ء

۴۔ محولہ بالا

۵۔ یوسف/۳۹

۶۔ یوسف/۳۸

۷۔ النجم/۳۹

۸۔ النساء/۷

۹۔ النحل/۱۱۸

۱۰۔ احیاء العلوم، ۳۲/۱، الغزالی، ابو حامد، محمد، بیروت، دار الخیر، ۱۴۱۷ھ

۱۱۔ توالی التاسیس، ص ۶۶ (یہ کتاب میسر نہیں آئی) (از محقق)

۱۲۔ تاریخ خمیس، ۳۵۳/۱، الدیار بکری، حسین بن محمد، بیروت، دار صادر، س ن

۱۳۔ حاشیہ الجامع الصحیح، ۳۰۱/۱، بخاری، محمد بن اسماعیل، محشی احمد علی محدث سہارنپوری، کراچی قدیمی کتب خانہ، س ن

۱۴۔ محولہ بالا

۱۵۔ محولہ بالا

۱۶۔ الاصابہ، ۲۸۸/۱، ابن حجر، احمد بن علی، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۸ھ

۱۷۔ طبقات الاطباء، ۱۱۰/۱، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ

۱۸۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی تمرۃ العجوۃ: ۳۸۷۵، ابو داؤد، سلیمان بن اشعث بیروت، دار الجیل، ۱۹۹۲ء

۱۹۔ الاصابہ، ۲۸۸/۱

۲۰۔ طبقات الاطباء، ۱۰۴/۱

۲۱۔ طبقات الاطباء، ۲۳۲/۱

۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ طبقات الاطباء، ۱۱۹/۱

Marfat.com

۲۵۔ الطبقات الکبریٰ، ۳۶۵/۵، ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء

۲۶۔ محولہ بالا ۲۷۔ محولہ بالا

۲۸۔ طبقات الاطباء، ۱۳۰/۱ ۲۹۔ محولہ بالا

۳۰۔ محولہ بالا ۳۱۔ طبقات الاطباء، ۱۶۳/۱

۳۲۔ الطبقات الکبریٰ، ۲۹۲/۵ ۳۳۔ طبقات الاطباء، ۱۱۹/۱

۳۴۔ ایضاً، ۱۲۱/۱ ۳۵۔ ایضاً، ۱۲۳/۱

۳۶۔ ایضاً، ۱۲۲/۱ ۳۷۔ ایضاً، ۱۲۳/۱

۳۸۔ ایضاً، ۱۶۱/۱ ۳۹۔ ایضاً، ۱۶۳/۱

۴۰۔ ایضاً، ۱۶۳/۱ ۴۱۔ طبقات الاطباء، ۳۲/۲

۴۲۔ طبقات الاطباء، ۱۶۸/۱ ۴۳۔ محولہ بالا

۴۴۔ محولہ بالا ۴۵۔ طبقات الاطباء، ۱۹۳/۱

۴۶۔ ایضاً، ۱۲۴/۱ ۴۷۔ طبقات الاطباء، ۱۲۵/۱

۴۸۔ محولہ بالا ۴۹۔ محولہ بالا

۵۰۔ محولہ بالا ۵۱۔ محولہ بالا

۵۲۔ محولہ بالا ۵۳۔ طبقات الاطباء، ۱۷۷/۱

۵۴۔ محولہ بالا ۵۵۔ طبقات الاطباء، ۱۷۶/۱

۵۶۔ ایضاً، ۱۷۵/۱ ۵۷۔ ایضاً، ۱۷۶/۱

۵۸۔ ایضاً، ۱۷۸/۱ ۵۹۔ ایضاً، ۱۷۵/۱

۶۰۔ ایضاً، ۱۵۸/۱ ۶۱۔ ایضاً، ۱۵۷/۱

۶۲۔ طبقات الاطباء، ۱۵۸/۱ ۶۳۔ محولہ بالا

۶۴۔ محولہ بالا ۶۵۔ طبقات الاطباء، ۳۲۲/۱

۶۶۔ محولہ بالا ۶۷۔ طبقات الاطباء، ۱۲۸/۱

۶۸۔ محولہ بالا ۶۹۔ طبقات الاطباء، ۱۲۹/۱

۷۰۔ محولہ بالا ۷۱۔ محولہ بالا

Marfat.com

۷۲۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۴

۷۳۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۵

۷۴۔ محولہ بالا

۷۵۔ محولہ بالا

۷۶۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۳۷

۷۷۔ محولہ بالا

۷۸۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۳

۷۹۔ ایضاً، ۱/۱۴۱

۸۰۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۷

۸۱۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۵، ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، مصر، مطبعہ میریہ، ۱۳۱۲ھ

۸۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب فی تعشیر اھل الذمہ: ۳۰۵۲، ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، بیروت، مکتبہ دارالجیل، ۱۹۹۲ء

۸۳۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۵

۸۴۔ کتاب البلدان، ص ۳۰۸، الھمدانی، ابن الفقیہ، احمد بن محمد، لیدن، مطبع بریل، ۱۳۰۲ھ

Marfat.com

مسلمانوں کا اندلس
خود مسلمانوں کی نگاہ میں

مشہور اندلسی کہیے، یا یورپین صوفی شیخ محی الدین بن عربی پڑھے لکھے مسلمانوں میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ کافی سرگردانیوں کے باوجود ان کے مخالفین بھی شیخ کی علمی وسعت نظر کی وقت کے بہرحال معترف ہیں۔

ہمارے مخدوم ومحترم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم علمی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) ومدیر معارف کا اصرار ہے کہ شیخ ابن عربی کے متعلق معارف میں مقالات کا سلسلہ خاکسار شروع کرے، اپنے اصرار کو تیز سے تیز تر کرتے ہوئے آخر میں تو شاہ صاحب نے یہاں تک ارقام فرما دیا کہ تو نے لکھا تو لکھا ورنہ پھر کوئی دوسرا اس موضوع پر لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ ایک حوصلہ افزا حسن ظن کے سوا ظاہر ہے کہ اس کو اور کیا قرار دیا جا سکتا ہے، فوق کل ذی علم علیم کی قرانی حقیقت کا اقتضا بھی یہی ہے اور سچی بات بھی یہی ہے کہ لکھنا چاہیں تو اب بھی اس فقیر سے کہیں بہتر طریقہ سے اس مضمون کو مرتب کر کے پیش کرنے والے پیش کر سکتے ہیں۔

مگر ایک "صابری چشتی فقیر" کے لیے یہ بھی تو آسان نہ تھا کہ اپنے مخدوم (۱) ہی نہیں بلکہ جو جانتے ہیں کہ ہندوستان کے طریقہ چشتیہ صابریہ کے ایک رکن رکین صاحب رودولی شریف سیدنا شیخ احمد عبدالحق قدس اللہ سرہ العزیز بھی ہیں اور ہمارے شاہ معین الدین صاحب کو اسی آستانہ رودولی شریف کی صاحبزادگی کا بجا فخر حاصل ہے۔ اس لحاظ سے مخدوم ہونے کے ساتھ ہی وہ ہماری مخدوم زادے بھی تو ہیں۔ اپنے مخدوم اور اپنے مخدوم زادے کے حکم سے سرتابی کی کوئی شکل نظر نہ آئی۔ اللہ کے نام سے قلم کو ہاتھ میں لیتا ہوں۔ شاید بزرگوں کی روحانیت سے تائید کی راہ میری یہی نیت مجھ پر کھول دے۔ وللہ الامر والتوفیق۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں نومبر و دسمبر ۱۹۵۳ء کو تین اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

عرض کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوا کہ ان کے مولد و منشاء اندلس کی تاریخ کا وہ رخ پیش کر دیا جائے جس سے میرا خیال بھی ہے کہ شیخ اور شیخ کی خصوصیات کے سمجھنے میں کافی مدد پڑھنے والوں کو ان شاء اللہ ملے گی، اسی لیے پہلا مقالہ ''اندلس'' پر لکھ کر حاضر کیا جاتا ہے۔

والا مر بیدہ سبحانہ تعالیٰ

مناظر احسن گیلانی

واقعہ یہ ہے کہ ایک اندلس اور ہسپانیہ تو وہ ہے جس سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ شاید عشق کی کیفیت مسلمانوں کے قلوب میں انیسویں صدی سے یورپ کے مؤرخوں، اخباروں، صحافیوں اور ان کے قصاصوں افسانہ نگاروں تک نے اس زمانے کے بعد پیدا کرنا شروع کیا، جب مشرق پر اپنے تسلط کے چنگلوں کو مغرب پوری قوت کے ساتھ جما چکا تھا۔ گویا یہ ایک دستور بنا لیا گیا ہے کہ پہلے اندلس میں مسلمانوں کے جبروت و جلال، عروج و اقبال کی قصیدہ خوانی اتنے دل آویز میٹھے سروں میں کرنے والے کرتے ہیں اور ان قصوں کو اس بلند آہنگیوں کے ساتھ سناتے ہیں کہ سننے والوں پر ایک قسم کی محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ان ہی ذرائع سے مسلمانوں کے دلوں میں اندلس کے عشق کی ایسی آگ بھڑکا دی گئی ہے کہ شاید گلبرگہ، بیجاپور، احمد نگر، گول گنڈہ، جونپور، احمد آباد، برہان پور، شادی آباد، مانڈو وغیرہ ہندوستان کے مقامی عاصمات (کیپیٹل) ہی نہیں بلکہ اندلس کے قرطبہ و غرناطہ کے مقابلہ میں، دمشق و بغداد، فسطاط، شیراز، رے اور نیشاپور، غزنی، دلی، آگرہ، قاہرہ، مراکش، فارس، تیونس، اصفہان، و اسلامبول تک کے تاریخی التسامات تک اندلس کی اس آگ میں ڈر ہے کہ کہیں جل کر بھسم نہ ہو جائیں۔ اسپین کے قصر الحمراء اور الزہراء کی یاد ہمارے دلوں میں جو ہوک یا ٹیس پیدا کرتی ہے، شاید لال قلعہ اور تاج محل کے

Marfat.com

الفاظ میں بھی یہ اثر ہم اپنے اندر نہیں پاتے۔ خصوصاً مسلمانوں کا طبقہ منورہ جو سب کچھ یورپ ہی کی آنکھوں سے دیکھنے اور ان ہی کے کانوں سے سننے کا عادی بنایا جا چکا ہے۔ اس کا حال تو اس باب میں قابل رحم حد تک پہنچ چکا ہے۔ خلش تبش، قلق اور سوز کی جو کیفیتیں اندلس کے ذکر سے ان کے اندر پیدا ہوتی ہیں ان کا اندازہ کچھ مشاہدہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ میرے ایک مرحوم کرم فرما بزرگ (ب) نے تو اپنی ساری عمر ہی اس علمی مہم کے سر کرنے میں صرف فرما دی کہ اندلس کا صحیح جغرافیہ کیا ہے۔ اس ملک کے شہروں، قصبوں، بلکہ دیہاتوں، دریاؤں، ندیوں، نالوں، پہاڑوں کے نام مسلمانوں کے عہد میں کیا تھے۔ ان ناموں کو کس طرح بگاڑا گیا ہے، یا بدلا گیا ہے وہ صبح و شام اسی گورکھ دھندے میں بسر فرماتے تھے۔ ان کا خیال شاید یہ تھا کہ اسلام کا نہ سہی لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا ایک قومی اور ملی فرض ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں۔

پہلے ایک طرف عشق کا الاؤ جوڑا جاتا ہے اس کے بعد پھر یورپ کے یہی اخباریئے اور صحافیے، کہانیاں سنانے والے مختلف بھیسوں میں آتے ہیں اور جب مسلمانوں کو اندلس سے نکالا گیا اور اس ملک کو ان کے وجود سے جب خالی کیا گیا اس وقت وہی رو رو کر بین اور نوحہ کرتے تھے اور نکالنے والوں کو برا بھلا کہتے ہوئے داستانوں کا ایک سلسلہ مرثیہ کے رنگ میں سناتے ہیں۔ کاٹے گئے، مارے گئے، زندہ جلا دیئے گئے، سمندر میں ڈبوئے گئے اور ان مسلمانوں کی لاکھوں لاکھ کی تعداد بتائی جاتی ہے جن کیساتھ ان ہی مرثیہ خوانوں کے بھائی بندوں نے ان ہی کے قول کے مطابق وہ سب کچھ کیا جس کی توقع شاید جنگل کے خون خوار درندوں سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ خوفناک حزن انگیز اور بھیانک لہجوں میں مسلمانوں کی بربادیوں کا افسانہ بھی سنایا جاتا ہے۔ پھر ان کے محل سراؤں پر، مسجدوں پر، کتب خانوں پر جو کچھ

Marfat.com

گذری، اعداد وشمار کے طویل طویل ہندسوں کے ساتھ ان کی روداد بھی پیش کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سارے معلومات اپنے پوری ہندسی تفصیلات کے ساتھ کن ماخذوں سے حاصل کیے گئے ہیں اور ان مسلمانوں کو اور انکی کتابوں کو کون کن رہا تھا جب ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ مغربی ذرائع سے پھیلائے ہوئے ان معلومات کو کتابوں میں جب کبھی میں نے پڑھا، یا سنانے والوں سے سنا تو بے ساختہ حافظ کا یہ شعر یاد آ گیا کہ

آفرین بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنے اعمال و کردار کے بدترین پہلوؤں پر غلاف دوزی کی شاطرانہ مہارت رکھتے ہوئے بھی یہی یورپ کے مؤرخین اپنی قوم کا سارا کچا چٹھا مسلمانوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی عام روش اور عادت کے برعکس کیوں سناتے رہتے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اندلس کے معاملہ میں اتنی صاف گوئی اور اتنے کھلے لفظوں میں اپنے جرم کا اعتراف جو کیا جاتا ہے، اس کے واقعی اسباب و وجوہ کیا ہیں اور سنانے والوں کی اندرونی نیت کیا ہے، دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھنے میں آتا ہے، اس کا اثر اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر ہر مسلمان جو آسمان کے نیچے زمین کے کسی حصہ پر کھڑا ہے اس کے لیے ''اندلس'' کا لفظ انیسویں صدی سے ایک مستقل ''ہول ذل'' یا ''ہوا'' بن کر رہ گیا ہے۔ گویا اندلس کا لفظ، لفظ نہیں ایک مضراب ہے جس کی چوٹ پڑتے ہی مسلمانوں کے اعصابی نظام میں لرزہ برپا ہو جاتا ہے۔ ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں، سارے دماغی مخزونات اسی ایک ضرب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حافظوں سے نکل نکل کر بہے چلے جاتے ہیں ان کو کچھ یاد نہیں آتا کہ آخر انہی کی تاریخ میں تو بدر کے ساتھ ''احد''، فتح مکہ کے ساتھ ''یوم حنین'' اور اوطاس ''یرموک'' کے ساتھ عمواس (ج) ''میدان قادسیہ''

Marfat.com

کے قریب ''وادی کربلا'' وغیرہ کے حوادث مسلسل یکے بعد دیگرے گذرتے رہے ہیں۔ خود ان کے پیغمبر ﷺ دنیا میں تشریف فرما ہی اس شان کے ساتھ ہوئے تھے کہ آپ کے پاس کچھ نہ تھا، پدری شفقتوں کا سایہ پیدا ہونے سے پہلے ہی سر مبارک سے اٹھ چکا تھا، ماں کی مامتا سے بھی استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہیے، میسر نہ آیا، دادا کی سرپرستی کا قصہ بھی شروع ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، آٹھ سال کی عمر سے پچیس سال کی عمر تک کا زمانہ جو سیکھنے سکھانے کا ہوتا ہے، بکریوں، بھیڑوں اونٹوں کی رفاقت میں گذرا۔ نبوت کے ۲۳ سال کا بھی بڑا حصہ تقریباً تیرہ سال اسی مکہ میں بسر ہوئے، جہاں مسلمانوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے بدترین دشمنوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا اور باقی دس سال مدینہ منورہ کے سو وہ بھی اس حال میں گذرے کہ مٹھی بھر مسلمانوں کو سارا جاہلی عرب ایک کمان بن کر اپنا ہدف بنائے ہوئے تھا۔ یہ کمان ابھی پورے طور پر اتری نہ تھی کہ مدینہ کے یہ دس سال بھی اس طور پر ختم ہو گئے کہ اس زمانہ کی روئے زمین کی سب سے بڑی مرکزی قوتیں رومن امپائر اور پرشین امپائر چاروں طرف سے مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لے کر دھمکا رہی تھیں اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ عرب ہی کے صحراء میں ان مسلمانوں کا سر کچل کر رکھ دیا جائے۔ یہ وہ تاریخی واقعات ہیں جن کا ظہور قرآنی دعووں کے عملی تجربے کے لیے ہوا تھا اور ہوتا رہتا ہے۔ مگر اندلس کے لفظ کا جادو یہ سوچنے کی گنجائش بھی مسلمانون کے دل و دماغ میں باقی نہیں چھوڑتا کہ آخر ان قرآنی حقائق کا اقتضاء کیا ہے، کچھ نہیں، تو قرآن کی آیات له الملک، له ملک السموات والارض، بیده ملکوت کل شـــی، وغیرہ میں بیسیوں پیرایہ میں اسی حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے کہ آسمان ہو یا زمین کا کوئی حصہ یا خطہ کسی میں خدا کے راج کے سوا نہ پہلے کبھی کسی کی حکومت قائم ہوئی۔ اور نہ آئندہ کسی زمانہ میں قائم ہو سکتی تھی۔ قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں اس دینی

Marfat.com

عقیدے پر مسلمانوں کو اصرار کرنے پر حکم دیا گیا کہ:

﴿لم یکن له شریک فی الملک﴾(۱)

''خدا کے راج میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے''۔

مگر واہ رے ''اندلس'' کا انچھر کہ جیسے ڈائنامیٹ چیزوں کو اڑا دیتا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کے نام سے مسلمانوں کے دماغ سے بہت کچھ اڑ جاتا ہے۔ خواہ وہ قرآن کے بینات و محکمات ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا کے حقیقی صفات سات یا آٹھ ہیں جو ذات حق کے عین ہیں یا غیر یا نہ عین ہیں یا نہ غیر۔ ان مسائل کے کسی ایک پہلو کو متعین کر کے اپنے دینی عقیدوں پر جمنے والی یہ قوم ''اندلس'' کے لفظ کو سن کر قرآن کی ایسی آیتوں کو بھی بھول جاتی ہے جن کے متعلق نہ سلف ہی میں کسی قسم کا اختلاف پیدا ہوا اور نہ خلف میں ایک پہلو کے سوا آج تک کسی دوسرے پہلو میں ان آیتوں کی تفسیر و تشریح میں کوئی گنجائش ہی پیدا نہ ہوئی۔ حالانکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم قرآن کے ان ''بینات'' کی روشنی میں حقیقت اور واقعہ کی جو نوعیت متعین ہوتی ہے، اس کی لاج تو رکھنی چاہیے تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کی ایسی روشن حقیقتوں سے بے اعتنائی کے بعد ہم مسلمان بھی باقی رہتے ہیں یا نہیں۔ یہ نہ تو فقہ کا کوئی قیاسی مسئلہ تھا، نہ کسی ایسی حدیث کا یہ مفاد ہے جس کی سند کے راویوں پر تنقید کا امکان ہے۔

بہر حال ''اندلس'' سے مسلمانوں کا ناپید ہو جانا تو ایک واقعہ ہے لیکن یہ واقعہ کس طرح پیش آیا، جن حوادث و فاجعات اور ان کے طلسمی اعداد و شمار کے بھالوں، برچھوں، تیروں اور تلواروں سے سج سجا کر پیش کرنے والے اس واقعہ کو مسلمانوں کے آگے پیش کرتے رہتے ہیں کہ آج ان کی بدولت ''اندلس'' کا لفظ ہم مسلمانوں کے لیے ہوا بنا ہوا ہے اور سننے کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تمام

وسعتوں کے باوجود خدا کی زمین ہم پر تنگ ہوگئی۔ ہم اس کے متعلق غالب کی زبان میں اگرچہ یہ پوچھنے کا بجا حق رکھتے ہیں کہ

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

لیکن سوال و جواب کے اس قصہ کو مختصر کرتے ہوئے اس وقت ہم آپ کے علم میں صرف مسلمانوں کے ان معلومات اور احساسات کو لانا چاہتے ہیں جو خود ان ہی کی کتابوں میں اس اندلس کے متعلق پائے جاتے ہیں جس میں وہ کچھ دن رہے اور اب جہاں اسلام کا کوئی نام لیوا نہیں پایا جاتا، ان کی روشنی میں آپ صحیح طور پر شیخ ابن عربی کے اندلس کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کسی ملک میں آباد ہونے کے بعد وہاں سے کلیتہً اس طرح مسلمانوں کا ناپید ہو جانا جو صورت حال اندلس میں پیش آئی، مسلمانوں کی ملی تاریخ کے لحاظ سے بجائے خود ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ کیونکہ ایشیا و افریقہ کی وسیع سرزمین کا شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت حصہ ہوگا جہاں مسلمان آباد نہ ہوئے ہوں اور آج تک کسی حال میں موجود نہ ہوں۔ وہ اپنے ان ہی آبائی اوطان میں اچھے برے ہر حال میں جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے، پڑے رہے اور آج تک پڑے ہوئے ہیں، وطن بنا لینے کے بعد ان ملکوں میں ان کو بھی وقتاً فوقتاً کبھی خشک سالیوں سے بھی دوچار ہونا اور آئینی زندگی کے ساتھ ساتھ مزاج اور بے آئینی کے حالات کا بھی شکار ہونا پڑا۔ جہاں حاکمیت کے لطف اٹھانے کا موقع ملا، وہاں حاکم بنکر بھی رہے اور محکوم بن کر بھی رہے اور محکوم بننے پر جہاں مجبور ہونا پڑا، وہاں محکومیت کی زندگی پر بھی صبر کیے بیٹھے رہے۔ ایسے ممالک بھی ہیں، جہاں حکومت کی باگ مسلمانوں کے ہاتھوں میں کبھی نہیں آئی۔ مگر آج تک وہاں وہ آباد ہیں اور اسی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اور شاید کبھی ہلکا سا خطرہ بھی ان علاقوں سے نکل جانے کا ان کے دلوں میں

Marfat.com

پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ایک یہی بد بخت اندلس اور اسی کے ملحقہ چند بد نصیب یورپین جزائر ہیں، جہاں سے وہ آباد ہونے کے بعد ناپید ہو گئے۔ یہ عجیب وغریب اتفاقی اور استثنائی صورت جو مسلمانوں کے ملی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، کیوں اور کیسے پیش آئی؟

مغربی مؤرخین اس سوال کے جواب میں جو کچھ بھی فرماتے ہوں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ سے مجھ پر جو کچھ واضح ہوا ہے وہ یہی ہے کہ فتح کرنے کی حد تک تو پہلی صدی ہجری ہی میں اندلس کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ یہ ولید بن عبدالملک مروانی حکومت کے دوسرے حکمران کا عہد تھا۔ اتفاق کی بات کہ ولید بھی فتح اندلس کے بعد مر گیا اور ولید کی جگہ سلیمان بن عبدالملک گدی پر بیٹھا اور سات سال بھی گذرے نہ تھے کہ مرکزی حکومت کے دو فرمانرواؤں کی مسلسل موت کی وجہ سے افراتفری کی حالت قدرۃً کچھ ایسی پیدا ہوئی اور ایسا انتشار حکومت میں رونما ہوا کہ اندلس جیسے دور دست علاقہ کے تفصیلی حالات سے واقفیت کا موقعہ جیسا کہ چاہیے تھا نہ مل سکا۔ فوجی حکام کسی نہ کسی طرح اس ملک پر قبضہ جمائے بیٹھے رہے۔ سلیمان کے بعد جب بقیۃ الخلفاء الراشدین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سریر آرائے حکومت ہوئے تو یہ پہلا موقع تھا کہ ''اندلس'' کے خصوصیات و حالات سے آگاہ ہونے کے لیے اطمینانی وقت ملا۔ تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ اس نئے مفتوحہ علاقے سے صحیح واقفیت کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو فیصلہ کیا تھا وہ کامل ابن اثیر میں بایں الفاظ میں منقول ہے:

''کان رأیه اقفال اهلها منها''(۲)

''عمر بن عبدالعزیزؒ کی رائے تھی کہ اندلس سے مسلمانوں کو واپس بلا لیا جائے''۔

یہ رائے صرف رائے ہی کی حد تک محدود ہو کر نہ رہ گئی تھی بلکہ آگے اسی

Marfat.com

کتاب میں یہ بھی ہے:

"وکان قد بدء العمر فی نقل اهلها عنها"(۳)

''عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اندلس سے واپسی کا سلسلہ شروع بھی ہوگیا تھا''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سات سو سال بعد اندلس میں جو صورت پیش آئی، خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے روشن ضمیر پر اس کا انکشاف فتح اندلس کے سات سال بعد ہی ہو چکا تھا۔ اور یہ کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو اتفاقاً پیش آ گیا تھا، بلکہ عمری بصیرت جس کا اندازہ شروع ہی میں لگا چکی تھی، توقع کے مطابق وہی واقعہ بن کر سامنے آیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک اندلس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے اور جو کچھ کہا جاتا ہے، قطعاً بے بنیاد بھی نہیں ہے، جسے ہم آئندہ بیان کریں گے۔ لیکن علاوہ دوسرے اسباب و وجوہ کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انتہائی اقبال و عروج کے زمانہ میں ''اندلس'' کی خراجی آمدنی خود اسی ملک کے مؤرخ ابن خلدون کے بیان کے مطابق اسی قدر تھی، جس قدر آمدنی عباسیوں کو بن کھیتی والے بیابان یعنی حجاز سے ہوتی تھی۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مشہور مقدمہ میں عباسیوں کے زرخیز و سیر حاصل صوبوں کی آمدنیوں کو سرکاری کاغذات کے حوالہ سے درج کرتے ہوئے حجاز کی آمدنی کے بارے میں لکھا ہے:

"الحجاز ثلاثمائة الف دينار"(۴)

''حجاز کی آمدنی تین کروڑ دینار تھی''۔

آگے بیان کیا ہے کہ اس آمدنی کا ایک ثلث یا تہائی حصہ تو فوج پر صرف ہوتا تھا، ایک ثلث حکومت کے مصارف کے لیے مختص تھا، تیسرے ثلث کو اتفاقی حوادث و نوائب کے لیے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔

Marfat.com

مجھے خرچ سے بحث نہیں بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خود اندلس میں مستقل حکومت قائم کر لینے کے بعد جیسا کہ کتابوں سے معلوم بھی ہوتا ہے، اس ملک کو آباد اور زرخیز بنانے کے لیے حکومت نے بھی اور عام آبادکار مسلمانوں نے بھی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، مگر ان بلیغ کوششوں اور غیر معمولی محنت وسعی کے باوجود اندلس کی خراجی آمدنی حجاز جیسے خشک کوہستانی علاقہ کی آمدنی سے بھی آگے نہ بڑھ سکی (د) تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جس زمانہ میں مسلمانوں کی اس ملک سے واپسی کا فیصلہ کیا تھا، اس وقت اس کی آمدنی اس سے بھی بہت کم رہی ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اندلس کے جو حالات ہمیں سنائے گئے اور وہاں کے حجازی امیروں کے جن درباروں کا افسانہ آج زبان زد عام ہے۔ بلکہ اب بھی اس ملک میں اندلس کے مسلمانوں کے بچے کھچے جو آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندلس کی آمدنی کا یہ حجازی بجٹ (ثلثمایۃ الف دینار) کچھ عجیب وغریب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جنہوں نے صحیح معنوں میں اندلس کے جغرافیہ کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ زیادہ حصہ اس ملک کا کوہستانوں اور سنگلاخ پتھریلی زمینوں سے بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں زراعت اور باغبانی وغیرہ کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت اسی لیے ہوئی تھی کہ قدرتی طور پر اس ملک کی اراضی میں پیداوار کی بہت کم صلاحیت تھی، اگر مصنوعی ذرائع سے کام نہ لیا جاتا تو مسلمانوں کے لیے اس ملک میں زندگی گذارنی مشکل ہو جاتی۔

موسم کے لحاظ سے اندلس کی حالت اگرچہ وہی ہے، جو اس کے آس پاس کے دوسرے یورپین ممالک کی ہے، تاہم ہوا کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن آب کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمارے مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ پایہ تخت قرطبہ میں بھی آب شیریں میسر نہ آتا تھا اور فتح اندلس پر ایک صدی سے زیادہ مدت گذرنے کے

Marfat.com

بعد بنی امیہ کے حکمرانوں میں سے عبدالرحمٰن اوسط نے اپنے دور میں:

"اجلب الماء العذب الی قرطبۃ و ادخلہ الیھا"(۵)

"قرطبہ تک شیریں پانی کھینچ کر لایا"۔

اور جب دارالسلطنت تک میں پانی کی یہ کیفیت تھی، تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا کہ دوسرے شہروں کا اس باب میں کیا حال ہوگا۔

کچھ اسی قسم کے اسباب تھے جن کا نتیجہ تھا کہ رہنے کی حد تک تو مسلمان اندلس میں مقیم ضرور ہو گئے تھے لیکن ان کا دل اس ملک میں شاید کبھی نہ لگا۔ اور تو اور بنی امیہ کے پہلے اندلسی حکمران عبدالرحمٰن الداخل تک کے متعلق جو خدا ہی جانتا ہے مصائب و آلام کی کتنی کڑیوں کو جھیلتے ہوئے اندلس پہنچ کر اس ملک کا فرمان روا بن چکا تھا۔ تاریخوں میں یہ لطیفہ نقل کیا جاتا کہ زمین کے کسی خاص حصہ کو گھیر کر الرصافہ کے نام سے موسوم کیا تھا، خلاف توقع اس احاطہ میں اتفاقاً کھجور کا ایک پودا دیکھا گیا، عبدالرحمٰن اس پودے کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔

ایک نظم ہی عبدالرحمٰن کی طرف منسوب کر کے کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ کھجور کے اس اکیلے پودے کو دیکھ کر اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ یہ تھے۔

"اے کھجور کے پودے تو بھی اپنے نخلستانی وطن سے اسی طرح جلاوطن ہوا جیسے اندلس کی سرزمین میں جلاوطن ہو کر میں پہنچا ہوں۔ جلاوطنی اور بال بچوں سے جدائی میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق و شبیہہ ہیں (۶)"۔(۶)

اور عبدالرحمٰن بے چارے کے لیے تو واقعی اندلس اجنبی ملک تھا، مصر کی بادشاہی کے تخت پر بھی یوسف کو کنعان کے گدائی کے دن یاد آتے ہوں تو اس پر چنداں حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری

کے مشہور اندلسی محدث و متکلم علامہ ابن حزم جن کی خدا جانے کتنی پشتیں اندلس میں گذر چکی تھیں اور جن کا خاندانِ وزارت سے تعلق تھا اور جنہوں نے مشرق یا مشرق کے کسی شہر یا مقام کو کبھی نہیں دیکھا تھا اپنی ایک نظم میں جن خیالات کا اظہار اندلس کے متعلق کیا ہے، اس کا پتہ ان کے اس شعر سے چلتا ہے کہ:

انا الشمس فی جو العلوم منیرة ولکن عیبی ان مطلعی الغرب(۷)

''یعنی علمی حلقہ کا اگر چہ میں آفتاب ہوں لیکن عیب میرا یہ ہے کہ (بجائے مشرق کے) مغرب کے افق میں سے طلوع ہوا''

گویا اندلس میں پیدا ہونے ہی کو اپنی بدقسمتی خیال کرتے تھے، اس نظم میں تمنا بھی کی ہے:

"ولو انني من جانب الشرق طالع "(۷ الف)

''یعنی کاش! مشرق کے افق سے میں طلوع ہوتا''

ان کی پوری نظم معجب میں مراکشی نے نقل کی ہے۔(۷ب)

اندلس میں مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدا اور انتہا کی ان دونوں شہادتوں کی روشنی میں اس کے سوا اور کیا سمجھ میں آتا ہے کہ اندلس سے دلی لگاؤ کسی زمانہ میں بھی مسلمانوں کو پیدا نہ ہوا۔ حالانکہ اندلس کی قبضہ گیر فوج جو عموماً شام کی فوجی چھاؤنیوں سے یہاں آتی ہے اس کو مانوس بنانے کے لیے لکھا ہے:

''دمشق کے فوجیوں کو بیرہ نامی مقام میں جگہ دی گئی اور نام بیرہ کا دمشق رکھا گیا تھا، اسی طرح حمص کے فوجیوں کو اشبیلیہ میں رہنے کا حکم دیا گیا، اور اسبیلیہ کا نام حمص ہی رکھا گیا تھا، جیان میں قنسرین کی چھاؤنی کے لوگ چونکہ تھے اس لیے اس کا نام قنسرین اور اردن والے جہاں رکھے گئے اس کا نام اردن فلسطین والوں کی جگہ جس کا نام شذونہ تھا، فلسطین ہی رکھ دیا گیا تھا۔(۸)

Marfat.com

لیکن باوجود ان تدبیروں کے پانچویں صدی تک کے اندلسی مسلمان اسی آرزو میں تڑپتا رہا کہ کاش! میں مشرق کے افق سے طلوع ہوتا۔

آخر یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ عباسیوں نے اپنے کو بنی امیہ کے سارے مقبوضات کا جائز وارث کو قرار دیتے ہوئے، صرف ایک اندلس کو کیوں چھوڑ دیا۔ اگر کشش کے اسباب اس ملک میں ہوتے تو عباسیوں کی قوت قاہرہ کا مقابلہ اندلس کے بنی امیہ بھلا کیا کر سکتے تھے۔ جب دمشق کی حکومت ان کی ضرب کی تاب نہ لا سکی۔ بنی امیہ کا جو خانوادہ اندلس میں آ کر پناہ گزیں ہو گیا تھا، خود اس کا خیال بھی اندلس کے متعلق بس اس قدر تھا، جس کا اندازہ اسی خاندان کے ایک رکن عبدالملک بن عمرو کے اس قول سے ہوتا ہے جو اس نے کہا تھا:

"طردن من المشرق الی اقصی هذا الصقع و نحسد علی لقمه تبتغی الرمق"(۹)

''ہم مشرق سے کھدیڑے گئے اور اس دور دراز علاقہ میں آ کر ہم نے دم لیا ہے مگر لوگ اس لقمہ پر بھی ہم سے حسد کرتے ہیں جس سے صرف سد رمق کا کام لیا جا سکتا ہے''۔

لیکن یہ تو اندلس کا ایک رخ تھا۔ قطع نظر ان امور کے جن کے چرچوں سے کانوں کو بھر دیا گیا ہے۔ خود ہمارے مؤرخین کی کتابوں میں بھی تو یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے اور تو اور وہی ابن خلدون جس نے اندلس کے خراج کی آمدنی اسی قدر بتائی ہے جو حجاز کے صوبہ سے عباسیوں کو وصول ہوتی تھی، یعنی وہی ثلاثمائة الف دینار. ابن خلدون ہی نے تاریخ کے مقدمہ میں اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ ثقات مؤرخین کی کتابوں میں میں نے یہ پڑھا ہے، بیان کیا ہے کہ بنی امیہ کے اندلسی حکمران عبدالرحمٰن الناصر کا جب انتقال ہوا تو:

"خلف فی بیوته امواله خمسة الآف الف الف دینا ر مکررة ثلاث مرات یکون جملتها بالقناطیر خمسائة الف قنطار"(۱۰)

''تو خزانہ عامرہ میں عبدالرحمٰن نے اپنے بعد پانچ ہزار ملین کی تین گنی مقدار دینار کی چھوڑی تھی، قنطار کے حساب سے جو پانچ ہزار قنطار کے قریب رقم ہوئی ہے''

جس کا حاصل یہ ہے کہ پندرہ ہزار ملین دینار یا پونڈ عبدالرحمٰن دولت چھوڑ کر مرا تھا(و)، حالانکہ اسی عبدالرحمٰن الناصر کے مصارف کی تفصیل کرتے ہوئے مؤرخین لکھتے ہیں:

"اخترع قصورا و متنزهات کثیرة وبنی الطرق وزاد فی الجامع بقرطبه رواقین .....و بنی جوامع کثیرة بالاندلس"(۱۱)

''بہت سے محلات اور سیر گاہیں، سڑکیں اس نے بنوائیں اور قرطبہ کی جامع مسجد میں دو رواقوں کا اضافہ کیا اور ان کے سوا بھی اندلس کے علاقہ میں اس نے جامع مسجدیں تعمیر کرائیں''

ابن خلدون نے بھی اسی الناصر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

''جیسے الناصر کے باپ اور دادا وغیرہ نے اندلس میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں قصور تعمیر کیے، جن میں ''المجلس الزھر''، ''البہو الکامل''، ''القصر المنیف''، خاص طور پر مشہور ہیں اسی طرح الناصر نے المجلس الزہر کے بازو میں ایک عالیشان ایوان جس کا نام ''دار الروضۃ'' رکھا تھا، تعمیر کیا، ان محل سراؤں تک پہاڑوں سے پانی پہنچانے کا بندوبست کیا اس نے بڑے بڑے انجینئر دنیا سے طلب کیے اور بغداد سے اور قسطنطنیہ سے بھی لوگ آئے۔ اس نے بہترین سیر گاہیں بنوائیں۔ اسی نے ''الزھرا'' نامی شہر بھی بسایا اور اسی کو

Marfat.com

اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ جس میں بڑے بڑے ایوان، قصور، باغات جو گذشتہ حکمرانوں کے تعمیرات سے بڑھ چڑھ کر تھے، تیار کرائے، ان میں اس نے جنگلی جانوروں کے پالنے کے لیے بڑے بڑے وسیع علاقوں کا احاطہ کیا، طرح طرح کے پرندوں کے لیے جالی دار پرند خانے بھی بنوائے گئے" (۱۲)

اس سلسلہ میں اگر کوئی لکھنا چاہے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے، لکھنے والوں نے اس باب میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، ان ہی بیانات اور ملک کی ان حیرت انگیز رودادوں ہی کی وجہ سے اندلس کا سودا مسلمانوں کے سر پر سوار ہے۔

ان حالات میں سوال ہوتا ہے کہ عروج و اقبال کے آخری دنوں میں جس ملک کی خراجی آمدنی حجاز کی آمدنی کے برابر تھی، اس ملک میں ان شاہ خرچیوں کے بعد بھی حکومت کے خزانہ کو اتنی بڑی بڑی رقموں سے معمور ہونے کا موقعہ کیسے ملا اور اس آمدنی میں اتنے محیر العقول اور مہیب کارنامے کیسے انجام پائے۔ سلاطین و خلفاء کی حد تک نہیں، بلکہ اندلس کے عام مسلمان امراء کے جو حالت کتابوں میں درج ہیں ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ سب کچھ ان کے یہاں کس راستہ سے آرہا تھا۔

اس سوال کے جواب میں ممکن ہے، اختلاف کیا جائے، لیکن سالہا سال کے مطالعہ اور فکر و نظر نے جس نتیجہ تک مجھے پہنچا دیا ہے، اسے عرض کرتا ہوں۔

نسل انسانی کی زندگی کا قدرتی آئین جس کا نام دین اور مذہب ہے۔ جب اپنی آخری مکمل ترین شکل میں اس لیے پیش ہوا کہ بنی آدم کے بکھرے ہوئے گھرانے اور بچھڑی ہوئی آبادیاں ایک ہی دین اور ایک ہی آئین پر سمٹ کر متحد ہو جائیں، تو رحمۃ اللعالمین ﷺ کا انتخاب قدرت نے اس کام کے لیے کیا اور ایک ایسے مرکزی مقام سے پکارنے کے لیے آپ کو کھڑا کیا گیا، جہاں سے مشرق اور مغرب مساوی طور پر متاثر ہو سکتے تھے۔ اور ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ

Marfat.com

مشرق بھی اس پیغام سے متاثر ہوا اور مغرب میں بھی وحدت انسانی کی یہ آواز دور دور تک گونجتی چلی گئی۔ چونکہ اس آخری پیغام کے بعد بندوں کے پاس ان کے پیدا کرنے والے خالق کا کوئی پیغام آنے والا نہ تھا، اسی لیے اس آخری پیغام کی بقاء و حفاظت کے لیے جہاں بہت سے قدرتی اسباب پہلے مہیا ہوتے رہے اور آئندہ بھی برابر ہوتے رہیں گے، وہیں اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ سیاسی قوت جس کی پشت پناہی عموماً دنیا کے عام ادیان و مذہب کو شروع میں میسر نہ آئی، وہ اس دینی دعوت کے ساتھ ساتھ نشو ونما پانے لگی، جو اس کی خصوصیت ہے۔ دعوت کا آغاز بھی عرب ہی کی سرزمین سے ہوا تھا اور اس کی سیاسی قوت کا سرچشمہ بھی عرب ہی کا خطہ تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ بیس پچیس سال کے اندر اندر عہد فاروقی ہی میں مشرق کی سب سے بڑی سیاسی قوت (پرشین امپائر) اور مغرب کا سب سے بڑا سیاسی مرکز (رومن امپائر) دونوں کے دونوں اس کے سامنے پست ہو گئے، اس طرح ساری دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت کا قالب جس حکومت نے اختیار کر لیا تھا اس کی پشت پناہیوں سے استفادہ کا موقع قدرت ہی کی طرف سے دین کی اس آخری دعوت کے لیے فراہم ہو گیا، اس لیے شروع ہی میں اس دینی دعوت کی جو ہری بنیادوں میں استواری و استحکام کی لازوال قوت بھر گئی، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آئندہ کچھ بھی ہوتا رہے لیکن اس دین کے بنیادی حقائق پر اشتباہ و ارتیاب کی ساری راہیں بند ہیں، آج دنیا کے جس حصہ میں بھی اس دینی دعوت کو اس کے حقیقی خدوخال کے ساتھ تروتازہ حالت میں جو بھی پاتا ہے بغیر کسی شک وشبہ کے اسی طرح پا سکتا ہے جیسے براہِ راست اس دین کے حاصل کرنیوالے پا رہے تھے۔ تواریخ کے مختلف ادوار میں بے شمار طوفانوں سے دین کی اس آخری دعوت کو دوچار ہونا پڑا۔ خود اس دین کے نمایندوں میں بھی دنیا کے مختلف حصوں میں انحرافی طغیانیاں پیدا ہوئیں لیکن

Marfat.com

اس دینی دعوت کی جوہری بنیاد اس کی آسمانی کتاب القراٰن الحکیم اور اس کتاب کے پیش کرنے والے النبی الروف الرحیم ﷺ کی سیرت وکردار کا ہر ہر پہلو آج بھی اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ نمایاں ودرخشاں ہے۔ ہر توجہ کرنیوالے کی ہلکی سی توجہ اس حقیقت کو ثابت اور واضح کرتی چلی جائے گی کہ

گوہر مخزن اصرار ہماں ست کہ بود　　حقہ مہر بداں مہر ونشاں ست کہ بود

بہر حال یہ نئی حکومت جس نے اچانک دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت کا قالب اختیار کرلیا تھا۔ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ پہلے سے جانی پہچانی بات اور خدا کا وعدہ تھا، قرآن میں ''استخلاف'' یعنی مسلمانوں کو زمین کی حکومت عطا کی جائے گی کا وعدہ کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا:

﴿لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم﴾(۱۳).

''تاکہ جگہ بنائے اس دین کے لیے جسے خدا نے ان کے لیے پسند فرمالیا ہے''

اسی دینی دعوت کے لیے جگہ بنانا، اور ممکنہ حد تک اس کے لیے انسانی برادری میں گنجائش پیدا کرتے چلے جانا بھی اس موعودہ حکومت و خلافت کا نصب العین قرآن نے قرار دیا تھا۔

خلافت راشدہ کو خلافت راشدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ اس عہد حکومت کا یہ قرآنی نصب العین پوری قوت کے ساتھ قائم رکھا گیا، اور مسلمانوں کی حکومت اس زمانہ میں ٹھیک اپنے نصب العین تک پہنچی ہوئی تھی اور ہر طرف سے یکسو ہوکر اسی راہ پر جارہی تھی، جس مقصد کے لیے وہ عطا ہوئی تھی۔ باوجودیکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا، قرآن کے پیغمبر ﷺ خود عربی تھے، جن لوگوں کا انتخاب اس آخری دینی دعوت کو عالمگیر بنانے کے لیے کیا گیا تھا، سب سے پہلے اس گروہ میں وہی لوگ داخل ہوئے تھے، جن کا وطن عرب تھا۔

Marfat.com

اسی دینی دعوت کی عرب میں تو دھوم مچی ہی ہوئی تھی ۔عرب سے باہر روم وایران، حبشہ اور اس کے سوا بھی بیرونی عرب کے دوسرے حصوں میں قاصدوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا اور مدینہ جیسی دوردست آبادی میں جب ایران سے آنے والا آتا تھا تو سلمان من اہل البیت (سلمان ہمارے گھرانے کے آدمی ہیں) کی پیغمبرانہ آواز سے مدینہ کی فضا گونج اٹھتی ہے، حبشی بھی آتے ہیں اور پیغمبر ﷺ کے سارے کاروبار کا چارج ان ہی بلال حبشیؓ کو مل جاتا ہے۔اس طرح عرب وعجم کے قصے ختم ہورہے تھے، خود عرب بھی احرار ومولیٰ یعنی آزاد و شرفاء اور غلام خاندان کے رذیل کمینے، دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔مگر ان ہی موالی میں سے ایک مولیٰ زید پیغمبر کے فرزند دلبند کے نام سے پکارے گئے، شرافت مآب قریش کے خانوادہ گرامی کی خاتون سے ان کا عقد جس وقت ہوتا ہے تو سارا عرب کانپ اٹھتا ہے اور وہی زید بن حارثہ افسر بن کر اپنی ماتحتی میں اس فوج کو لے کر عرب کے شمال وجنوب، مشرق ومغرب میں جاتے ہیں جس فوج کے زیادہ ارکان عرب کے شریف آزاد خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلہ کی جس آخری مہم کو رومیوں کے مقابلہ میں روانہ کر کے پیغمبر وفات کے بستر پر آرام فرما ہوئے تھے اس فوج کے سپہ سالار بھی ان ہی مولیٰ زید کے صاحبزادے اسامہ تھے۔

ان واقعات کی کہاں تک تفصیل کی جائے، یہ واقعہ ہے کہ قومی عصبیت خواہ کسی راہ سے پیدا کی جائے نسل کی راہ سے، زبان کی راہ سے، ملک کی راہ سے، وطن کی راہ سے سب ہی کی حیثیت وہی ہوگئی تھی جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کی تھی (ز)۔

نبوت کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں بھی ''سیدنا بلال'' کہتے کہتے حضرت عمر فاروقؓ کی زبان خشک ہورہی تھی۔سالم مولیٰ حذیفہ کی وفات پر فرمایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی خلافت کا حقدار میرے بعد یہی مولیٰ سالم تھا۔وفات ہورہی ہے،

Marfat.com

سانس اکھڑ رہی ہے لیکن اس وقت بھی عمر فاروق کہے جاتے ہیں جب تک خلیفہ کا انتخاب نہ ہو لے، رومی صہیبؓ میری جگہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے رہیں، چنانچہ وہی پڑھاتے رہے اور سارے مہاجرین وانصار اور عرب کے اشراف واحراران ہی کی امامت میں نماز ادا کرتے رہے۔

مسلمانوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اگر ایک طرف خود پیغمبر ﷺ عیسائیوں کو اپنی پاک مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت عطا فرماتے ہیں تو دوسری طرف بیت المقدس کے گرجے کا پادری حضرت عمرؓ سے عرض کر رہا ہے کہ کچھ حرج نہیں، آپ گرجے کے اندر نماز ادا فرما سکتے ہیں۔ مگر حضرت عمرؓ یہ فرماتے ہوئے کہ:

"لو صلیت داخل الکنیسة اخذها المسلمون بعدی و قالوا هنا صلی عمر"(۱۴)

''اگر گرجے کے اندر آج میں نماز پڑھ لوں گا تو میرے بعد مسلمان اس گرجے کو یہ دعویٰ پیش کر کے کہ عمرؓ نے اس میں نماز پڑھی، تم سے چھین لیں گے''

پھر جس نماز کا وقت آ گیا تھا، اس کو گرجے سے باہر سیڑھیوں پر ادا کر کے ایک تحریری وثیقہ لکھ کر پادری کے حوالہ کرتے ہیں، جس میں لکھا تھا:

''اس سیڑھی پر کوئی نہ نماز ہی ادا کرے اور نہ اذان دے''(۱۵)

اپنے نصرانی غلام اُسق کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان کے جیتے جی اسق اس کے قبول کرنے سے انکار کرتا رہا۔ وفات جب ہو رہی تھی تو اسی کا بیان ہے کہ عمر نے مجھ کو آزاد کر دیا۔(۱۶)

نصرانی غلام کے ساتھ اس سلوک نے اسق کے دل میں حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اسلام کے لیے جگہ بنالی۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے، روم وایران کے مقبوضات عہدِ فاروقی ہی میں اسلامی مفتوحات میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن خلافتِ

راشدہ کا پورا دور گذر گیا، لیکن کسی کے دل میں خیال تک نہ آیا کہ دفاتر کی زبان ایرانی علاقوں میں فارسی اور رومی علاقوں میں رومی کیوں ہے؟ البلاذری نے لکھا ہے:

"کان دیوان خراج السواد وسائر العراق بالفارسیة. (۱۷)

"سواد اور سارے عراق (ایرانی مقبوضات) کی مال گذاری کا دفتر فارسی میں

ولم یزل دیوان الشام بالرومیة" (۱۸)

اور شام کی مال گذاری کا دفتر رومی میں تھا"۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ دین یا انسانی زندگی کا قدرتی آئین جو دنیا کی ساری قوموں کا مشترک موروثی سرمایہ تھا۔ اس کو آخری مکمل ترین شکل میں ممکنہ حد تک تمام قوموں تک پہنچانے اور بنی آدم کے گھرانوں میں اس کی گنجائش پیدا کرنے کی ہی کوششوں پر اس استخلافی حکومت کی توجہ مرتکز تھی، جو مسلمانوں کے سپرد ہوئی تھی۔ اس تمکین فی الارض کے نصب العین کی تکمیل کے لیے کسی خاص زبان یا کسی خاص قوم کے کلچر یا تہذیب وتمدن کے لیے زمین میں جگہ اور گنجائش پیدا کرنا اس حکومت کا مقصود ہی نہ تھا۔

اس بلند نصب العین کے مقابلہ میں قوموں پر زبردستی کسی زبان، یا کلچر، یا تہذیب وتمدن کو تھوپنے اور اس کو خواہ مخواہ ان کے سروں پر منڈھنے کی تنگ نظری کی خلافت راشدہ میں گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسی خلافت کا ایک خلیفہ (ح) مسلمان کو قصاص کے لیے بٹھاتا ہے اور غیر مسلم کے ہاتھ میں تلوار دے کر حکم دیتا ہے کہ:

"اپنے مقتول رشتہ دار کے بدلہ میں مسلمان کی گردن اڑا دو" (۱۹)

اس حکم کے بعد مسلمانوں کی طرف مخاطب ہو کر سمجھاتا ہے کہ:

"یہ میں نے اس لیے کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری حکومت کے

Marfat.com

غیر مسلم باشندوں کا خون بھی مسلمانوں کے خون کے برابر ہے۔ اور دونوں کا معاوضہ بھی مساوی ہے''۔

خود پیغمبر ﷺ غیر مسلم مقتول کے معاوضہ میں مسلمان قاتل کو قتل کراتے ہوئے فرماتے جاتے ہیں:

"انا احق من وفی بذمته "(۲۰)

''اپنی ذمہ داری پوری کرنے کا میں سب سے زیادہ حق دار ہوں''۔

مگر اس استخلافی حکومت کے مذکورۂ بالا قرآنی نصب العین یعنی دین کے لیے تمکین فی الارض کا رشد اور اس کی سوجھ بوجھ کا جوش دھیما پڑتے پڑتے بالآخر انحطاط کے اس نقطہ تک پہنچ گیا کہ ایک حال جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے یہ تھا:

"کان سالم مولیٰ ابی حذیفه یوم المهاجرین والانصار فی مسجدقباء فیهم ابو بکر و عمر "(۲۱)

''ابو حذیفہ کے مولیٰ (غلام) سالم قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، مہاجرین اور انصار کی جن میں ابوبکر وعمر بھی ہوتے تھے''۔

مگر پھر ان ہی بے چارے موالی کے ساتھ اسی عرب میں یہ معاملہ بھی کیا جا رہا تھا کہ اتفاقاً ان ہی موالی میں سے کسی مولی کے پیچھے کوئی شریف عرب نماز پڑھ لیتا تو پوچھنے والے حیرت سے پوچھتے کہ تم نے اس کے پیچھے نماز پڑھی؟

"انما اردت ان اتواضع لله بالصلوة خلفه"(۲۲)

''اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کی غرض یہ ہے کہ خدا کے سامنے اپنی فروتنی اور تواضع کا اظہار کروں''۔

گویا مولیٰ کے پیچھے نماز ایک قسم کا مجاہدہ تھا اور یہاں تک تو پھر بھی غنیمت ہے اسی العقد الفرید میں موالی اور غیر عربی مسلمانوں کے متعلق بدلے ہوئے نقطہ نظر

Marfat.com

کے جن نتائج کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کو پڑھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ شرفائے عرب کے مقابلہ میں ان کے ساتھ جو امتیازی برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کی فہرست صاحب عقد الفرید نے نقل کی ہے

۱۔ ان موالی کو نہ کنیت سے پکارا جاتا تھا، اور نہ نام کے سوا اور کسی دوسرے لفظ سے خطاب کا استحقاق ان کو حاصل تھا۔

۲۔ صف میں شرفائے عرب کے برابر چلنے کا حق موالی کو نہ تھا۔

۳۔ اور نہ کسی جلسہ جلوس میں موالی آگے رہ سکتے تھے۔

۴۔ دعوت میں قاعدہ مقرر تھا کہ جب تک شرفائے عرب کھانا کھاتے رہیں، موالی اور غیر عربی مسلمان کھڑے رہیں۔

۵۔ کسی وجہ سے عرب کے شرفا اپنی دعوتوں میں علم یا فضل کی عام شہرت کی وجہ سے کسی مولیٰ (یعنی غیر عرب مسلمان) کو مدعو بھی کرتے تو ان کو ایسی جگہ بٹھا کر کھانا کھلایا جاتا، جو شرفا کے دسترخوان سے الگ ہوتی، تاکہ ہر شخص پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ عربی نہیں ہے۔

۶۔ جس جنازہ میں کوئی عربی شریک ہوتا تو اس میں موالی کو نماز پڑھنے کے لیے نہیں بلایا جاتا تھا۔ یہ اور اس سے بھی زیادہ عرب اور غیر عربی مسلمانوں میں ترجیحی سلوک کی ابتدا خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ ایک قریشی صاحب کا یہ لطیفہ العقد الفرید ہی میں نقل کیا گیا ہے کہ ان کا دستور تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی جنازہ گذرتا تو پوچھتے کہ کس کا جنازہ ہے اگر کہا جاتا کہ قریش کا ہے تو واقوماہ (ہائے میری قوم) کہتے ہوئے چیخ اٹھتے اور اگر سنتے کہ کسی غیر عربی کا جنازہ ہے تو کہتے وابلدتاہ (ہائے رے میرا ملک) اور اگر معلوم ہوتا کہ کسی غیر عربی مسلمان کا ہے تو کہتے:

''اللہ کا مال تھا، جس مال کو چاہے لے لے اور جسے چاہے، چھوڑ دے''(۲۳)

کچھ دن تک تو افراد میں مذکورۂ بالا انحرافی میلانات کی پرورش ہوتی رہی، تا آنکہ جب حکومت کی باگ مروانی خاندان والوں کے ہاتھ میں آئی تو اس کے پہلے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے جو جذبات اس باب میں تھے اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ سیدنا امام زین العابدین نے کسی غیر عربی خاتون کو جو مولاۃ (لونڈی) تھیں، آزاد کر کے بیوی کا مرتبہ عطا کیا، عبدالملک کو خبر ہوئی تو آپے سے باہر ہوگیا اور غصہ میں ایک خط حضرت والا کے نام لکھ کر مدینہ روانہ کیا جس کا حاصل تھا کہ قریش کے دامن شرافت کو اپنی اس حرکت سے تم نے داغدار کر دیا۔ اہل بیت نبوت کے چشم و چراغ سے جس جواب کی توقع تھی، وہی جواب عبدالملک کو ملا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاک نمونہ کی میں نے پیروی کی اور نبوت کا جو منشاء تھا اسی کی تعمیل کی سعادت میں نے حاصل کی ہے۔

بہر حال عوام کے ہاتھ میں تو اختیار تھا نہیں اس لیے حکومت کا اقتدار جب عبدالملک کے ہاتھ میں آیا تو پہلا انقلابی قدم اس نے یہ اٹھایا کہ فارسی اور رومی زبانوں میں (خراج) مالگذاری کے جو دفاتر خلافتِ راشدہ میں بھی اپنے حال میں چھوڑ دیئے گئے تھے، لاکھوں لاکھ روپے کے صرف سے ان کی زبان عربی کر دی گئی، رومی دفتر کے انچارج آفیسر سرجون نامی عیسائی کو جب عبدالملک نے یہ فرمان سنایا تو اس کا خون خشک ہوگیا، اور اس نے دفتر کے کام کرنے والے عملہ کو جن کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، بلا کر یہ الفاظ کہے:

''دفتری نوشت و خواند تمہاری روزی کا جو ذریعہ تھا، اس سے تم محروم کر دیئے گئے''۔(۲۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی آخری دعوت کے لیے جگہ بنانے یا تمکین

Marfat.com

فی الارض کے لیے جن امور کی ضرورت تھی، حکومت کی نگاہوں میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ دفاتر کی زبان کی اس تبدیلی سے اسلامی مقبوضات میں رہنے والے باشندوں کی کتنی بڑی تعداد روزی کے ذرائع سے محروم ہوگئی ہوگی۔ اگر ان غریبوں کی معاش کے نئے ذرائع حکومت کھول دیتی تو جو جی میں آتا کرسکتی تھی۔ مگر اس سے پہلے عبدالملک کے اس اقدام سے خدا ہی جانتا ہے کہ ملک کے کتنے باشندے متاثر ہوئے ہوں گے اور ان کے قلوب میں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جس قسم کے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے، ان کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ اس سے عربی زبان کی تمکین اور اس کے لیے نئی جگہ ضرور پیدا کی گئی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس خلافت کا وعدہ قرآن میں مسلمانوں سے کیا گیا اس کا نصب العین خود قرآن ہی نے کیا متعین کیا تھا۔ اسی سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ خلافت جب تک اپنے نصب العین کے لحاظ سے کامل رشد اور سوجھ بوجھ کی حالت میں رہی اس وقت تک دفاتر کی زبان بدلنے کی طرف توجہ نہ کی گئی۔

اور اس قصہ میں تو حکومت کی غیر مسلم رعایا ہی کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا، لیکن مروانیوں کی اسی حکومت میں غیر عربی مسلمانوں تک کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔ یعنی ابتداء حکومت سے آخر تک حکومت میں ملازمت کا سوال تو الگ رہا، امام ابوحنیفہؒ کی شہادت ہے کہ غیر عربی مسلمان علماء سے جن میں خود امام صاحبؒ بھی تھے، کبھی کوئی قانونی اور فقہی سوال تک نہ پوچھا جاتا تھا، کوفہ کا آخری مروانی گورنر ابن ھبیرہ پہلا شخص ہے، جس نے مجبور ہوکر امام ابوحنیفہؒ سے بعض مسائل میں مشورہ لیا تھا۔ غیر عربی مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا تو یہ برتاؤ تھا، لیکن یہی طرز عمل غیر عربی مسلمانوں کے ایمان و اخلاص کے امتحان کا ذریعہ بن گیا اور ان ساری بے اعتنائیوں کے باوجود سارے اسلامی ممالک کے مرکزی مقامات

میں دین اور دینی علوم کی خدمت ونشر و اشاعت میں زیادہ تر غیرعربی مسلمان مصروف تھے۔

عام مسلمانوں کے قلوب ان غیرعربی مسلمانوں کے اخلاص وصداقت سے قدرۃ متاثر ہوتے تھے مگر مروانیوں پر یہ بھی شاق تھا۔ چنانچہ عبدالملک کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شہاب زہری سے ہر ہر شہر اور قابل ذکر آبادیوں کے نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ وہاں کا دینی مقتدا کون ہے، زہری ہر سوال کے جواب میں مسلسل غیرعربی النسل مسلمانوں ہی کے نام بتلائے چلے جاتے تھے۔ اور عبدالملک کا چہرہ سیاہ پڑتا جاتا تھا۔

آخر میں جب کوفہ کے متعلق زہری نے بیان کیا کہ آج کل وہاں کے دینی پیشوا ابراہیم نخعی ہیں، جو نسلاً عربی ہیں۔ اس وقت اس کے دل کی دھڑکن کچھ کم ہوئی اور بے ساختہ بول اٹھا:

"ویلک یا زھری فرجت عنی" (۲۵)

''برا ہو تمہارا زہری، اب جا کر تم نے مجھے شگفتہ ہونے کا موقع دیا''۔

ظاہر ہے کہ خلافت کا جو ''خطہ راشدہ'' تھا اس سے جب انحراف شروع ہوا تو کسی حد پر اس کے ٹھہرنے کی صورت ہی کیا تھی۔ مسلمانوں کو کہیے یا محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو عربی وغیرعربی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے مروانی حکومت آخر میں انحراف کے اس نقطہ پر پہنچ گئی کہ آج بھی ہم جب اس کا تصور کرتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، علامہ ابوبکر جصاصؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے:

"قد کان آل مروان یاخذون الجزیۃ ممن اسلم من اھل الذمۃ" (۲۶)

''مروان کے خاندان والے حکمران ان مسلمانوں سے بھی جزیہ وصول کرتے تھے، جو پہلے غیر مسلم ذمی تھے، اور بعد کو اسلام قبول کر لیا تھا''۔

Marfat.com

اور یہ سزا ان مسلمانوں کو صرف اس لیے بھگتنی پڑی کہ بجائے عرب کے وہ بے چارے اس ارضِ بسیط کے ان حصوں میں پیدا ہو گئے تھے جن پر عرب کے لفظ کا اطلاق نہیں کیا جاتا تھا، اس کے سوا ان میں اور عربی نژاد مسلمان میں کوئی فرق نہ تھا۔

مروانی حکومت کی اسی حیرت انگیز ایمان آزما، دین گداز، جاہلی جسارت کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر نے کامل میں لکھا ہے کہ ان مسلمانوں کو کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیوں سے صرف اس قصور میں جس وقت نکالا جا رہا تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو زمین کے اس خطہ میں کیوں نہ پیدا کیا جس کا نام عرب ہے تو وہ بے چارے روتے جاتے تھے اور:

یا محمداہ یا محمداہ (۲۷)

کے الفاظ بے ساختہ ان کی زبانوں پر جاری تھے، وہ اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور حیران تھے کہ اپنے پرانے غیر اسلامی قبائل سے وہ منقطع ہو چکے تھے اور عربی مسلمان بھی ان کو عربی چھاؤنیوں سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا:

"این یذھبون" (۲۸) ''آخر وہ کہاں جائیں''

اس وقت بصرہ اور کوفہ کے جو علماء تھے، وہ بھی ان نکالے جانے والے علماء کے ساتھ ساتھ روتے جاتے تھے۔

اس طرح اس مسئلہ میں علماء فقہاء کے متفقہ فیصلہ کو مسترد کر کے مسلمانوں کی کافی خون ریزی کی گئی (ط)۔ اس اصرار کی انتہا یہ تھی کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کلنک کے اس ٹیکہ کو مروانی حکومت کی پیشانی سے حالانکہ مٹا دیا تھا لیکن بقول جصاص:

"لما ولی ھشام بن عبدالملک اعادھا علی المسلمین"

Marfat.com

''جب عبدالملک کا بیٹا تخت نشین ہوا تو مسلمانوں پر پھر جزیہ کے ٹیکس کو اس نے لگا دیا''(۲۹)

گویا عربی اور غیر عربی تقسیم پر ہشام کی حکومت نے مہر لگا دی۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ حکومت مسلمانوں کی حکومت نہیں، بلکہ عربی مسلمانوں کی ہے اور عربوں کی راہ کے سارے کانٹے ہٹا دیئے گئے لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات پر بیس سال سے زیادہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ مروانیوں نے عربی مسلمانوں کی جو حکومت قائم کر لی تھی، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی تقسیم کے بعد جیسا کہ چاہیے تھا یہ تقسیم عربی و غیر عربی دو ہی قسموں میں منحصر نہیں رہی، بلکہ مروانی حکومت کے آخری زمانہ میں عربی مسلمان بھی نزاریہ اور یمانیہ (ی) دو حصوں میں بٹ گئے، اور حکومت کا اقتدار چونکہ نزاری نسل کے ہاتھ میں تھا اس لیے مروانی حکومت کا آخری خلیفہ مروان بن محمد جیسا کہ المسعودی نے لکھا ہے کھلے بندوں

''تعصب لقومه من نزار علی الیمن ''(۳۰)

''یمنی عربی مسلمانوں کے مقابلہ میں نزاری عربی مسلمانوں کی پاسداری کرنے لگا''۔

اور اس طرح بجائے عربی کے مروانیوں کی حکومت ''نزاری حکومت'' بن کر ختم ہوئی۔ عربی مسلمانوں کی تقسیم کا یہ فتنہ جو مروانیوں کے آخری دور میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، صدیوں تک اس کا اثر باقی رہا، اور خدا ہی جانتا ہے کہ فتنے کی اس آگ میں کتنی لاکھ جانیں ضائع ہوئیں اور کتنے شدید نقصانات پہنچے۔ ہماری تاریخیں ان خونی داستانوں کے ذکر سے لالہ زار بنی ہوئی ہیں۔ الغرض ایک طرف تو خود عرب تقسیم کے اس عمل جراحی کا تختہ مشق بنا ہوا تھا اور دوسری طرف عربی زبان کے ساتھ نادانوں کی اس دوستی کا آخری انجام اسی مروانی حکومت کے آخری دور میں جو کچھ

Marfat.com

ہوا اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہوسکتا کہ خراسان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلا گشتی فرمان جو خراسان میں عباسیوں کی طرف سے بانٹا جارہا تھا وہ یہ تھا:

"لا یدع بخراسان متکلما بالعربیة الاقتله "(۳۱)

''خراسان میں عربی زبان بولنے والا جو بھی ملے، اسے قتل کردیا جائے''۔

حالانکہ اگر مروانی حکومت اسلام کی تمکین اور اس کے لیے جگہ بنانے کے قرآنی نصب العین کو اپنے سامنے رکھتی تو عربی مسلمانوں میں جراحی کے عمل کی بھی گنجائش نہ پیدا ہوتی، اور اسلام کے طفیل میں عربی زبان بھی قدرتی طور پر آگے بڑھتی چلی جاتی، لیکن قرآن کے بینات سے چشم پوشی اختیار کی گئی، قرآنی دعوت کے پیش کرنے والے پیغمبر ﷺ کے نمونوں سے اعراض کیا گیا اور الٹے انہی لوگوں کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو ساری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، شعوبیہ (ک) کے نام سے رسوا اور بدنام کیا گیا اور ان کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنالیا گیا۔

کچھ بھی ہو، اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں مروانیوں کی یہ حکومت خود ہی جل بھن کر ختم ہوگئی، بچے کھچے لوگوں میں ہشام بن عبدالملک کا پوتا گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اندلس تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا، مروانیوں کی قبضہ گیر فوج اندلس پر اپنے اقتدار کو اب تک قائم کیے ہوئے تھی، کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اندلس سے واپسی کا جو حکم مسلمانوں کو دیا تھا اور واپسی کا کام شروع بھی ہوگیا تھا لیکن ان ہی فوجیوں کے عرض ومعروض پر اپنے حکم کو آپ نے ملتوی فرمادیا اور یوں ان فوجیوں کو یہاں ٹھہر جانے کا موقعہ مل گیا تھا، یہ قبضہ گیر فوج شام کی چھاؤنیوں سے اندلس بھیجی گئی تھی۔ اس لیے اس کو سرزمین اندلس سے مانوس کرنے کے لیے وہی نام ان آبادیوں کے ان کی رعایت سے اندلس میں رکھ دیئے تھے، جو شامی چھاؤنیوں کے تھے۔ مروانی حکومت کے سارے زہریلے جراثیم ان

فوجیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور مروانیوں کے آخری دور میں عربیت بھی نزاریت، اور یمنیت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اندلس کی قبضہ گیر فوج اس تقسیم کے اثر سے بھی متاثر ہوئی اور بری طور پر متاثر ہوئی۔ کامل ابن اثیر میں لکھا ہے کہ نزاری اور یمنی عربوں میں جھگڑے اندلس میں آئے دن ہوتے رہتے تھے بعض دفعہ ان کی کشمکش اس نوبت کو پہنچ جاتی تھی:

"اقتتلوا بالرماح حتی تقطعت و بالسیوف حتی تکسرت ثم تجاذبوا بالشعور" (۳۲)

"(نزاری عرب اور یمنی عرب) پہلے تو نیزوں سے لڑے تا آنکہ سب ٹوٹ پھوٹ گئے، تلواریں چلیں اور وہ ٹوٹ کر ختم ہوگئیں، آخر میں ایک دوسرے کے بالوں کو پکڑ کر کھینچتے تھے"۔

خانہ جنگی کی اتنی بدترین شکل کے باوجود بھی اندلس کی کوہستانی اور پتھریلی زمین کو چھوڑنے پر یہ فوج آمادہ نہ ہوئی، وہ جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن اس جزیرہ نما سے نکلنا نہ چاہیے۔ ان جھگڑوں کے چکانے کی آخر میں یہ عجیب وغریب صورت ان فوجیوں نے یہ اختیار کی:

"ایک سال نزاری عرب کی پارٹی کا آدمی اندلس کی مسلمان فوجوں کا امیر رہا اور دوسرے سال امارت کا یہ عہدہ یمنی عربوں کے کسی آدمی کے سپرد بخوشی ورضامندی کر دیا جائے" (۳۳)

گویا اندلس میں قیام کی خواہش اور حد سے گذرے ہوئے شوق نے ایک خاص قسم کی جمہوریت پر ان کو راضی کر دیا تھا۔

ان فوجیوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس عرصہ میں مروانی حکومت کا ایک شاہزادہ یعنی ھشام کا پوتا عبد الرحمٰن اندلس پہنچا۔ سالانہ امارت کے ایر پھیر کے

Marfat.com

قصوں سے لوگوں کو یہ زیادہ آسان نظر آیا کہ عبدالرحمٰن ہی کو اپنا امیر بنالیا جائے، اس میں کچھ اختلاف بھی ہوئے، لیکن فوجیوں کی اکثریت عبدالرحمٰن کے ساتھ تھی۔ اس لیے اختلاف ختم ہوگئے، اور عبدالرحمٰن جو بعد کو الداخل کے لقب سے تاریخ میں مشہور ہوا اندلس کا باضابطہ حکمران بن گیا، ظاہر ہے کہ اس بے چارے کی پرورش ہی مروانی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے اپنے خاندانی روایات اور موروثی خیالات وجذبات سے الگ ہونے کی اس کے لیے شکل ہی کیا تھی۔ قرطبہ میں داخل ہوتے ہوئے جو شعر اس نے پڑھا تھا، اب بھی تاریخوں میں نقل کیا جاتا ہے (ل) جس کا حاصل یہ ہے کہ عباسیہ جو عجمی نہیں عربی تھے ان کی حکومت بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ گویا تنگ ہوتے ہوتے اس غریب کا حوصلہ اتنا مختصر ہوکر رہ گیا تھا کہ مروانیوں کے سوا کسی دوسرے عربی خاندان کی حکومت کی بھی گنجائش اس کے اندر باقی نہ رہی تھی، اور انسانیت سے ہٹ کر جو تعمیر بھی کی جائے گی اس کا آخری انجام بہرحال یہی ہوکر رہے گا۔

عبدالرحمٰن کو مرکز بنا کر جزیرہ نما کے منتشر مسلمانوں کو منظم ہونے کا موقعہ جب ملا تو اندلس ان لوگوں کی پناہ گاہ بن گیا، جو عباسیوں کی حکومت کے زیر اثر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ یہ نئے پناہ گزیں جن کی ٹولیاں وقتاً فوقتاً عبدالرحمٰن کے پاس پناہ لینے کے لیے اندلس آتی رہتی تھیں، ان کے نفسیات، جذبات وعواطف کا اندازہ اس مشہور اندلسی پناہ گزین سے ہوتا ہے، جو نسلاً مروانی خاندان کا تھا، نام اس کا عبدالملک بن عمر تھا۔ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے شروع میں امیر ہوجانے کے بعد بھی رسمی طور پر خطبہ میں عباسیوں کے خلیفہ کے نام کو باقی رکھا تھا، لیکن عبدالملک جب اندلس پہنچا تو اس نے اصرار شروع کیا کہ خطبہ سے عباسی خلیفہ کا نام نکال دیا جائے:

"والاقتلت نفسی" (۳۴) ''ورنہ میں اپنے آپ کو قتل کردوں گا''

Marfat.com

عبدالملک، عبدالرحمٰن کے خاص عزیزوں میں تھا، اس لیے عبدالرحمٰن اس قتل کی دھمکی سے متاثر ہوگیا اور رسمی نام بھی خطبہ سے عباسیوں کا نکال دیا گیا، دنیا طلبی کا جو بھوت اس عبدالملک پر سوار تھا، اس کی گندگی اور سیاہی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک موقعہ پر جب اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا اس کی راہ کا کانٹا نہ بن جائے تو بغیر کسی وجہ کے:

''بیٹے کی گردن بھی اڑادی، اس کی بھی اس کے سارے گھر کے لوگوں کی بھی اور اس کے تمام خانگی ملازموں کی بھی'' (۳۵)

الغرض عبدالرحمٰن الداخل سے پہلے اندلس میں جو قبضہ گیر فوج تھی، اس کا اور خود عبدالرحمٰن کا اور عبدالرحمٰن کی امارت قائم ہونے کے بعد ادھر ادھر سے اس کے پاس جو مسلمان عباسیوں کی حکومت سے نکل نکل کر پناہ گزیں ہو رہے تھے، ان سب کی نفسیاتی کیفیت کے اندازے کے لیے غالباً تاریخ کی مذکورہ بالا شہادتیں کافی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اندلس کے اس جزیرہ نما میں مسلمانوں نے اچھے اور برے حالات کے ساتھ تقریباً آٹھ صدیاں گزاریں۔ یعنی ۹۲ھ میں اندلس فتح ہوا اور کامل تخلیہ اس ملک کا مسلمانوں نے ۸۹۷ھ میں کیا ان آٹھ صدیوں میں مروانیوں کی یہ حکومت جو عبدالرحمٰن الداخل کے زمانہ میں قائم ہوئی، مرکزی حیثیت سے سارے اندلس پر اس کا اقتدار کم وبیش دوسو سال سے زیادہ صحیح معنوں میں قائم نہیں رہا، اس خانوادہ کا آخری واقعی حکمران حکم بن ہشام تھا۔ جس کا انتقال ۳۶۳ھ میں ہوا۔ اسی کے بعد حکم کا بیٹا ہشام المؤید باللہ کے نام سے تخت نشین تو ضرور ہوا لیکن اس بیچارے کی ساری عمر حرم سرا کے اندر بطور ایک اسیر یا قیدی کے گذری، تفصیلات کے لیے تاریخ کی مبسوط کتابوں کا مطالعہ کیجیے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اندلس کی اس مروانی حکومت کے

Marfat.com

حکمرانوں کے جو حالات ہماری کتابوں میں لکھے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی چال ڈھال سیرت و کردار میں ان کی کیفیت بھی تقریباً وہی تھی، جو دمشق کے مروانی حکمرانوں کی تھی، یعنی سیاسی اغراض کے سامنے اسلامی مطالبات کی پروا جیسے دمشق کے مروانی خلفاء نہیں کرتے تھے، اور مسلمانوں سے جزیہ کے ٹیکس کے وصول کرنے پر ان کا اصرار اس حد تک بڑھا ہوا تھا، کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی ممانعت کے باوجود پھر اسی مردہ جاہلی رسم کو زندہ کیا گیا، کچھ یہی نقطہ نظر انہوں بھی محض سیاسی مصالح کی بنیاد پر حج جیسے اسلامی رکن کے ادا کرنے سے اندلس کے مسلمانوں کو محروم کر رکھا تھا، خصوصاً جن بے چاروں کا حکومت سے کوئی تعلق ہوتا، ابن خلدون کے الفاظ ہیں:

"کان بنوامیة بالاندلس یمنعون اهل دولتهم من السفر لفریضة الحج "(۳۶)

''بنی امیہ کے اندلسی حکمران اپنی حکومت کے لوگوں کو فریضہ حج کے ادا کرنے سے روکتے تھے''۔

یہ بھی لکھا ہے:

"فلم یحج لسائر ایا مهم احد من اهل دولتهم "(۳۷)

''جب مروانیوں کی حکومت اندلس میں رہی ان کی حکومت سے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی نے حج نہیں کیا''۔

مگر اسی کے ساتھ جوامع اور مساجد کے بنانے کا شوق و ذوق بھی ان پر اسی طرح غالب تھا، جیسا کہ دمشق کے مروانی خلفاء کا تھا۔ جامع اموی اس وقت تک دمشق میں ان کی یادگار باقی ہے، جسے لوگ دنیا کے چند خاص عجائبات میں شمار کرتے ہیں، لیکن اس تعمیری ذوق کی تہ میں جو جذبہ کارفرما تھا، اس کا اندازہ اس قسم

Marfat.com

کے واقعات سے ہوتا ہے۔

دمشق کے مروانی خلفاء میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک بڑے کلے جبڑے کا حکمران گذرا ہے، ابن عساکر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، کوفہ اور بصرہ کے لوگ اس کے پاس آئے تھے، اس نے حکم دیا کہ دمشق کے باہر قصور و محلات اور جو عمارتیں بنوائی ہوئی ہیں اور نہروں کو پہنچا کر جو باغات ان عمارتوں میں تیار کیے گئے ہیں ان کو آراستہ پیراستہ کیا جائے پھر اپنے ساتھ مذکورہ بالا مقامات پر مسلمانوں کو لے کر پہنچا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ اے مکہ والو! کیا تمہارے یہاں ایسی عمارتیں ایسی سیر گاہیں، ایسے سرسبز اور شاداب باغات ہیں، جب وہ بے چارے کہتے کہ نہیں امیر المومنین ہمارے یہاں یہ چیزیں کہاں ہیں، تو دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ (۳۸)

بجنسہ یہی رنگ اندلس کے مروانی حکمرانوں کا بھی نظر آتا ہے۔ مشہور ہے کہ اندلس کا تاریخی قصر الزہرا جو عبدالرحمٰن الناصر کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنے حوالی موالی کے ساتھ اس قصر میں داخل ہوا تو لوگوں سے خطاب کر کے پوچھا:

"هل بلغكم ان احدابنى مثل هذا البناء "(۳۹)

''کیا تم جانتے ہو کہ کسی نے ایسا محل کبھی بنایا تھا''

درباریوں نے عرض کیا:

'نہیں سرکار! نہ ایسی عمارت دیکھنے ہی میں آئی اور نہ سننے میں'' (۴۰)

عبدالرحمٰن اس جواب کو سن کر بہت مسرور ہوا (م)۔ (۴۱)

اور یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اندلس کی ساری علمی سرگرمیاں جن کی بدولت دینی علوم میں ابن حزم و ابن عبدالبر جیسے اربابِ تحقیق پیدا ہوئے اور ابن باجہ، ابن رشد، ابن طفیل، ابن زہر وغیرہ جیسی غیر معمولی ہستیاں عقلی

Marfat.com

علوم میں پیدا ہوئیں۔ ان بزرگوں کے حالات اور سنین ولادت و وفات کو اٹھا کر دیکھیے تو واضح ہوگا کہ عموماً اس قسم کے افراد اندلس میں مروانیوں کی مرکزی حکومت کے ختم ہونے کے بعد ہی پیدا ہوئے۔ مروانی حکمرانوں کے زمانہ میں دین کی حد تک بجز معدودے چند حضرات کے جو لوگ پیدا ہوئے تھے اندلس میں لیکن ان کی تعلیم وتربیت بالکلیہ اسلام کے مشرقی شہروں میں ہوئی تھی۔ مثلاً بقی بن مخلد وغیرہ ورنہ ان کے سوا زیادہ تر وہی الواضحہ اور العتبیہ مالکی فقہ کے متون کے مصنفین ہمیں مروانی عہد میں نظر آتے ہیں، کیونکہ حکومت کی عدالت کا محکمہ مالکی مذہب کے مولویوں کے ہاتھ میں تھا اور علاج معالجہ کے سلسلہ میں کچھ ایسے اطباء بھی ملتے ہیں جو عقلی علوم وفنون سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ لیکن قدر ومنزلت ان کی صرف طبیب ہی ہونے کی وجہ سے تھی۔ الغرض فقہ مالکی اور قدرے طبی علوم کے سوا سارا زور وہی عرب کے جاہلی دور کے قصوں کہانیوں پر مرکوز تھا۔

ہماری تاریخوں میں بھی اور غیروں نے بھی اندلس کے اس کتب خانے کا بڑے شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے جو حکم ثانی نے قائم کیا تھا۔ یورپ کے مؤرخین تو حسب عادت طلسمی اعداد وشمار کے ساتھ اس کتب خانے کا ذکر کرتے ہیں، ہمارے مؤرخین بھی یہ خبر دیتے ہوئے:

''کان محبا للعلم مشغوفاً بجمع الکتب والنظر فیها''(۴۲)

''حکم علم کا رسیا تھا اور اس کو کتابوں کے جمع کرنے اور ان کو مطالعہ کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا''۔

ان الفاظ میں اس کے اس مشہور کتب خانے کا ذکر کرتے ہیں:

''انه جمع منها مالم یجمعه احد قبله ولا جمعه احد بعده حتی ضاقت، خزانه''(۴۳)

Marfat.com

''اس نے اتنی کتابیں جمع کی تھیں کہ نہ اس سے پہلے کسی نے اتنی کتابیں اکٹھی کی تھیں، نہ اس کے بعد، کتابوں کی اتنی بڑی مقدار اس کے پاس جمع ہوگئی کہ کتب خانے اس کے لیے کافی نہ تھے''

ابن اثیر نے تو ''جماعِ للکتب'' کے لقب ہی سے اس کو ملقب کیا ہے۔

لیکن ان ہی مؤرخین کی زبانی ہم جب یہ سنتے ہیں:

'' کان بصیرا بالادب، و الشعر و ایام الناس وانساب العرب''(۴۴)

''الحکم ادب عربی کا ماہر تھا، عربی شعر اور ایام جاہلیت کی تاریخ عرب کے قبائلی رشتوں کا بڑا واقف کار تھا''۔

تو اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے کتب خانہ میں کن علوم وفنون کی کتابیں زیادہ جمع ہوئی ہوں گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عقد الفرید ابن عبد ربہ کی کتاب کے معلومات اس زمانہ کے مروجہ علوم وفنون کی فہرست میں ہیں۔ یعنی اپنے دمشقی مورثوں سے جو چیزیں اندلس کے مروانی حکمرانوں تک پہنچی تھیں، ان ہی کو آگے بڑھانے اور چمکانے میں وہ زیادہ مشغول رہے۔ ان عربی مسلمانوں کو اپنی عربیت پر ناز تھا، اور اسی کو انہوں نے دمشق میں بھی نمایاں کیا تھا۔ اس لیے اندلس پر جب تک ان کا اقتدار قائم رہا تو عربیت ہی کے لیے جگہ پیدا کرنے اور اسی کی تمکین فی الارض میں وہ کوشش کرتے رہے تھے۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اندلس کے عربی النسل مسلمان تو خیر عربی النسل ہی تھے۔ بعض لوگ جو خالص عربی النسل نہیں تھے، بلکہ اندلس کی یورپین نسلوں سے جن کا تعلق تھا، انہوں نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد بجائے اسلام کے دینی علوم کے ان ہی علوم میں کمال اور امتیاز مروانی عہد میں پیدا کیا جن کا تعلق خالص عربیت

سے تھا۔ابن القوطیہ اندلس کے مشہور ادیب اور عربی لغت کے محققین میں شمار ہوتے ہیں۔شذور میں ان کے امتیازی کمالات کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''کان راساً فی اللغة والنحو حافظاً للاخبار و ایام الناس ''(۴۵)

''لغت ونحو کے امام،عرب جاہلی کے حالات اور ایام عرب کے حافظ تھے''

بہر حال ابن القوطیہ ادبِ عربی کے اندلسی ائمہ میں شمار ہوتے ہیں،ان کے نسب نامہ کو بیان کرتے ہوئے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کے خاندان کا تعلق:

''من ملوک القوط بالاندلس ''(۴۶)

''اندلس کے اس شاہی خانوادہ سے تھا جو قوط کے نام سے موسوم تھے''(ن)

تھا اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ نسلاً بھی یہ شخص یورپین ہی تھا۔ایک طرف وہ عربیت کے امام تھے اور دوسری طرف لکھا ہے:

''ولم یکن بالضابط لروایته فی الحدیث والفقه ''(۴۷)

''مگر حدیث وفقہ کی روایت میں وہ محتاط نہ تھے''۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ درازی عمر کی وجہ سے صرف سند کے عالی کرنے کے لیے فقہ وحدیث کی روایات بھی ابن قوطیہ سے لوگ سن لیا کرتے تھے۔(۴۸)

کچھ بھی ہو اس سے اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اندلس میں جو لوگ آباد تھے اور رہن سہن اور خورش وپوشش کے طریقوں میں مسلمانوں سے کافی متاثر ہوئے تھے۔لیکن جس دین کی تمکین کے لیے مسلمانوں کو حکومت ملی تھی کیا اس کو بھی اپنے دائرہ کے وسیع کرنے کا موقعہ اندلس یا اندلس کے سوا آس پاس کے دوسرے سرحدی یورپین علاقوں میں ملا تھا؟ واقعات ومشاہدات کے سوا تاریخی شہادتوں کی زبانیں بھی اس سوال کے جواب میں خاموش ہیں۔لے دے کر کچھ ابن قوطیہ وغیرہ ناموں سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اسلام ضرور قبول کرلیا

تھا لیکن ان میں بھی اسلام سے زیادہ عربی کلچر ہی کا ذوق غالب تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسروں کا خیال اس باب میں کیا ہے؟ لیکن میرے نزدیک مسلمان دنیا میں خاص وضع قطع کے لباسوں، نشست و برخاست کے طریقوں، تعمیری خصوصیتوں گانے بجانے اور رقص وسرود کی خاص خاص ڈھنگوں، شادی وغمی کی مخصوص رسوم، وغیرہ کی تبلیغ کے لیے قطعاً اٹھائے نہ گئے تھے۔ قدرت نے ان کو ان لازوال ابدی صداقتوں پر انسانیت کو اکٹھا کرنے کے لیے کھڑا کیا تھا، جو قوموں میں پہلے سے جانی پہچانی جاتی تھیں۔ قرآن کی اصطلاح میں جن کی تعبیر ''المعروف'' اور ''المنکر'' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور جن میں حالات و واقعات نے اشتباہ پیدا کر دیا تھا اور جن پر شک اور ریب کے بادل چھا گئے تھے، ان ہی اشتباہی کیفیتوں کا ازالہ کر کے ''ایمان راسخ'' پر بنی آدم کو کھڑا کر دینا، یہی کام مسلمانوں کا پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

میں ذکر کر رہا تھا اندلس کے مروانی حکمرانوں کے رجحانات و میلانات کا، یعنی عربی النسل مسلمانوں پر عربیت ہی کا مذاق اندلس میں بھی غالب رہا، اسی سے اندازہ کیجیے کہ الحکم الثانی کا وہ مشہور کتب خانہ جس کی کتابوں کی نہ حد تھی نہ شمار، ابن خلدون نے مستند ذریعہ سے نقل کیا ہے:

''۲۴ جلدوں میں صرف عربی کے شعراء کے دیوانوں کی فہرست تھی'' (۴۹)

ان دیوانوں میں شعرائے عرب کے چند محدود خیالات کی شاعرانہ تعبیروں کے سوا ظاہر ہے اور کسی دوسری چیز کی بھلا کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ الحکم کے علمی مذاق کو دیکھتے ہوئے غالب خیال یہی ہوتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت ہی کی یادگاروں سے زیادہ تر حکم کا یہ کتب خانہ معمور ہوگا۔ اندلس کے اس مروانی حکمران الحکم پر یہ ذوق کس حد تک غالب تھا، اس کا پتہ اس مشہور واقعہ سے

Marfat.com

بھی چلتا ہے کہ جب ابوالفرج اصفہانی اپنی مشہور اور ضخیم کتاب ''الاغانی'' مرتب کر رہا تھا، تو ابھی کتاب مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اندلس سے الحکم کا قاصد اصفہانی کے پاس خطیر رقم کے ساتھ پہنچ گیا اور عباسیوں کے دار السلطنت بغداد سے پہلے ''الاغانی'' قرطبہ کے کتب خانہ میں داخل ہوگئی۔ یہ ''الاغانی'' کیا چیز ہے، ابن خلدون کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے:

"فیه اخبار العرب و اشعارهم و انسابهم و ایامهم و دولهم" (۵۰)

''عرب کے ایام جاہلیت کے حالات و اشعار اور ان کے باہمی رشتے ان کے تاریخی ایام، ان کی حکومتوں کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے''۔

الاغانی کی ضخامت کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ تیس اونٹوں پر جن معلومات کے لیے صاحب بن عباد اپنے ساتھ سفر میں کتابیں لے جایا کرتے تھے۔ الاغانی کی تصنیف کے بعد تیس اونٹوں کی ضرورت ختم ہوگئی کیونکہ الاغانی میں وہ سب کچھ موجود تھا جو تیس اونٹوں پر لدی ہوئی کتابوں میں تھا۔

ان مروانی حکمرانوں کے علمی مذاق سے اندلس کے عام مسلمان کس حد تک متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ قرآن و حدیث کے حفاظ تو خیر ہر اسلامی علاقہ میں اس زمانہ میں پائے جاتے تھے لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ''الاغانی'' کے مجلدات ضخیمہ کے حفاظ بھی اندلس میں پائے جاتے تھے۔ المراکشی نے معجب میں ''الاغانی'' کے ایک حافظ کا ذکر جن لفظوں میں کیا ہے عام حالات میں مشکل ہی سے اس کو صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے (۵۱) اور ایک الاغانی کیا اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس میں ''سیبویہ'' کی مشہور نحو کی اساسی کتاب کے حفاظ بھی تھے۔ دواوینِ عرب کے حافظوں کی تو نہ حد تھی، نہ حساب، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ اسی کتاب میں یہ نقل کیا ہے کہ عربی زبان میں شعر کہنے والوں کو صلہ

Marfat.com

اور انعام دینے کے لیے اندلس کے بعض امیروں نے اپنی زمین وقف کر رکھی تھی۔ مساجد و مدارس و شفاخانے وغیرہ جیسے نیکی کے کاموں کے متعلق اوقاف تو خیر مسلمانوں کے یہاں ایک عام طریقہ تھا۔لیکن شعراء کے لیے وقف یہ صرف اندلس ہی کی سرزمین کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔(۵۲) میرے سامنے تفصیل نہیں ہے، بلکہ مروانی حکمرانوں کی بدولت اندلس کے مسلمانوں پر جو ذہنیت غالب تھی، تاریخ اندلس کی چند عام چلتی پھرتی مثالوں سے اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔خود اسی اندلس سے وطنی تعلق رکھنے والے مؤرخ ابن خلدون نے بھی اقرار کیا ہے:

''و اما اهل الاندلس فا فادهم التفنن فی التعلیم و کثرة روایة الشعر و الترسل و مدارسة العربیة من اول العمر حصول ملکة، صاروابها اعرف فی اللسان العربی و قصروا فی سائر العلوم لبعد هم عن مدارسة القرآن و الحدیث الذی هو اصل العلوم و اساسها''۔(۵۳)

''رہے اندلس والے سو تعلیم میں چونکہ وہ تنوع پسند واقع ہوئے ہیں، شعر اور انشا پردازی، عربیت (یعنی ادب عربی) میں ابتداءِ عمر سے اپنے اوقات صرف کرتے ہیں، اسی لیے عربی زبان کا تو ان کو کافی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔مگر ان کے سوا دوسرے علوم میں کوتاہی رہ جاتی ہے کہ قرآن و حدیث جو سارے علوم وفنون کی بنیاد ہے ان کے درس و تدریس سے وہ بے تعلق رہتے ہیں''۔

اور عربیت کا یہ رنگ گہرا ہوتے ہوتے اندلس کے ان ہی مروانی حکمرانوں میں یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ان کے بعض حالات و واقعات کو پڑھ کر آدمی بھونچکا ہو کر رہ جاتا ہے۔اور سوچنے لگتا ہے کہ کیا اسلام کے بعد بھی جاہلیت کی باتیں

اندلس میں زندہ ہوگئی تھیں۔ المزاکشی نے المغرب میں الحکم کے ذکر میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ اپنے دشمنوں کے درمیان جب وہ گھرا ہوا تھا اور اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ لوگ اس کو قتل کردیں گے، تو اپنے ایک غلام کو اس نے شاہی عطر پیش کرنے کا حکم دیا، غلام کچھ پس وپیش کرنے لگا کہ ایسی حالت میں عطر کی بھلا کیا ضرورت ہے، تو ڈانٹتے ہوئے غلام سے کہا:

''دیکھ! جب میرا سر کاٹا جائے گا، تب شاہی عطر ہی سے لوگ پہچان سکیں گے کہ یہ کسی عام کا نہیں بلکہ بادشاہ کا سر ہے'' (۵۴)

ایام اسلام کے اس الحکم کے اس قول کو پڑھ کر ایامِ جاہلیت کے ابوجہل یا (ابوالحکم) کی وہ فرمائش یاد آجاتی ہے جو اپنے سر کاٹنے والے سے اس نے ان الفاظ میں کی تھی:

''دیکھ سردار کا بر ہے، ذرا نیچے سے اس کو تراشنا، تاکہ مقتولوں کے درمیان جب میرا سر رکھا جائے تو عامیوں کے سروں سے وہ کچھ اونچا نظر آئے''

اور سچ تو یہ ہے کہ دنیاوی منافع کے لیے اپنے بیٹے اور بیٹے کے بال بچوں کو بھی قتل کرنے سے نہ جھجکنا جس ملک میں اس کے نمونے پیش ہو رہے ہوں، وہاں عربیت جس رنگ میں پہنچی تھی، اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

بہرحال بات بہت طویل ہوگئی، میری غرض صرف یہ ہے کہ مروانی حکومت اندلس میں جن خصوصیتوں کے ساتھ قائم رہی اور اس حکومت کے زیرِ اثر مسلمانوں میں جن جذبات وعواطف کا نشوونما ہوتا رہا، پڑھنے والوں کو اس کا کچھ اندازہ ہوسکے اور ان معلومات سے جو نتائج بھی پیدا ہوسکتے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اب میں اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ اندلس جیسے کوہستانی ملک اور سنگستانی خطہ میں دولت کا یہ طوفان جس کا تماشا اندلس کے مروانی حکمرانوں کے زمانہ میں کیا گیا تھا،

کہاں سے امنڈ رہا تھا، خود اس ملک کی خراجی آمدنی ابن خلدون کے بیان سے آپ سن چکے ہیں کہ وہ اسی قدر تھی جتنی آمدنی عباسیوں کو بن کھیتی والے بیابان حجاز سے وصول ہوتی تھی، مگر یہی مؤرخ اس کی خبر بھی دیتا ہے کہ الزہرا کا بانی عبدالرحمٰن الناصر اپنی شاہ خرچیوں کے باوجود خزانہ میں پندرہ ہزار ملین پونڈ (دینار) چھوڑ کر مرا تھا، بلکہ المقری نے اسی قصر الزہرا کے تعمیری منتظمین کے حوالہ سے اس کی تعمیر کے مصارف کا تخمینہ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''قدر النفقة فيها في كل يوم بثلثمائة الف دينار مدة خمسة و عشرين عاما''۔(۵۵)

''یعنی پچیس سال تک تین کروڑ پونڈ (دینار) روزانہ اس قصر کی تعمیر میں صرف ہوتے رہے''۔

واللہ اعلم بالصواب، یہ روایت کہاں تک درست ہے لیکن اگر کچھ بھی اس میں واقعیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اندلس کے خراج کی جس قدر سالانہ آمدنی تھی، یعنی ''ثلاثمائة الف دينار'' اسی قدر رقم یومیہ قصر الزاہراء کی تعمیر میں پچیس سال تک صرف ہوتی رہی۔

ممکن ہے کہ ان اعداد و شمار میں مبالغہ اور اغراق کے عناصر بھی شریک ہوں لیکن یہ تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس مبالغہ میں حقیقت کا بھی کچھ حصہ کسی نہ کسی حد تک ضرور شریک ہوتا ہے اور اندلس کے مروانی امیروں اور دولت مندوں کے جو آثار آج بھی کسی نہ کسی حد تک اس سرزمین میں موجود ہیں وہ اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ ان اولوالعزمیوں کی مصارف اندلس جیسے ملک کی خراجی آمدنی سے کسی طرح پورے نہیں ہو سکتے تھے۔

پھر آمدنی کے ان لامحدود ذرائع کا سرچشمہ آخر کیا تھا اور کہاں تھا؟

Marfat.com

اس سوال کا تاریخ کی روشنی میں جو جواب مجھے ملا ہے، اس نے اندلس کے متعلق میرے نقطہ نظر ہی کو بدل دیا۔ یعنی اس زمانہ میں اندلس کے لفظ کو خوف و ہراس، دہشت و وحشت کے بھیانک خطرات کا جو مجمہ مسلمانانِ عالم کے لیے بنا دیا گیا ہے بالکل اس کے برعکس اندلس کا یہی لفظ مجھے تو رجائیت اور امید کا مطلع نظر آتا ہے اور اندلس کی تاریخ کے اس رخ کو مسلمانوں میں مردنی اور افسردگی پیدا کرنے کے بجائے امید و شگفتگی اور زندگی پیدا کرنا چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ اندلس پہنچنے کے ساتھ ہی مسلمانوں کے قدم جزیرہ نما تک محدود نہ رہے، بلکہ فاتح اندلس طارق کا آقا موسیٰ بن نصیر، طارق کی فتح اندلس کے بعد اندلس کے راستہ سے پائیرینز کے دروں تک پہنچ چکا تھا۔ جس کے بعد یورپ کا سرسبز و شاداب وسیع علاقہ تھا جس میں فرانس اور اس کے ملحقہ تمام ممالک شامل تھے۔ اس لیے پائیرینز کے اس پار کے ملکوں سے مسلمان ابتدا ہی میں واقف ہو چکے تھے۔

آج یورپ جس حال میں بھی ہو، لیکن ان عربی مسلمانوں کے گھوڑوں کے پاؤں جس وقت پائیرینز کے دروں تک پہنچے ہیں اس وقت یورپ کا یہ وسیع علاقہ بجز معدودے چند سلطنتوں کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور کلیسا اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ریاستوں اور امارتوں کے اس انتشار اور اس کی باہمی رقابت کو باقی رکھنا چاہتا تھا، اسی توازنِ قوت میں کلیسا کی بھلائی کا راز مضمر تھا۔

ان منتشر، پراگندہ اور ایک دوسرے سے ٹکرا دینے والی یورپین ریاستوں کی حکومت کا دارومدار لوٹ کھسوٹ پر تھا۔ غریب رعایا جو کچھ بھی اپنی محنت سے پیدا کرتی اور کماتی تھی اس کو محصولات اور ٹیکسوں وغیرہ کے حیلوں اور بہانوں سے حکومت اور اس کے چند مخصوص کارندے سمیٹ کر اکٹھا کر لیتے تھے۔ الغرض باشندے تو اس ملک کے بکھرے ہوئے تھے، مگر اس کی آمدنی چند خاص مرکزوں میں

سمٹ کر ہر سال جمع ہو جاتی تھی۔ یورپ کی تاریخ کا یہی دور ''قرون مظلمہ'' یا عہد تاریک کے نام سے موسوم ہے۔اور یورپ کی تاریخ کے انہی تیرہ وتار دنوں میں پائیرینز کے دروں تک اندلس کے عرب مسلمان پہنچے۔ چنانچہ اندلس اور اس کے اطراف و جوانب کی ریاستوں سے بھی ان مسلمانوں کی کشمکش شروع ہی سے جاری تھی۔اور پائیرینز کے درون سے گذر کر ان فراخ میدانوں کی امارتوں سے بھی دست وگر بیان رہتے تھے۔ ۹۲ھ/۷۱۱ء سے جو فتحِ اندلس کا سال ہے، ۸۹۷ھ/۱۴۹۱ء تک جب فرڈی نینڈ کے محاصرہ کے بعد غرناطہ کا سقوط یعنی کم وبیش آٹھ صدیوں تک اندلس کے مسلمانوں اور یورپ والوں سے مسلسل معرکوں کے بعد معرکے ہوتے رہے۔اگر ان سب کی فہرست بنائی جائے تو شاید کئی ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جائے گی۔

اس کا اجمالی اندازہ کرنے کے لیے یہ تاریخی مثال کافی ہوسکتی ہے کہ مروانیوں کی مرکزی حکومت کے آخری دور اور نام نہاد مروانی خلیفہ المویدیا بعد کے عہد میں قاضی ابن عامر کے ہاتھوں حکومت کی باگ تھی۔اس ابن عامرؔ کے متعلق ہمارے مؤرخین نے لکھا ہے:

''اپنے ۲۶ سال کے دور حکومت میں صرف ابن عامر کو ۵۲ معرکے یورپین قوموں سے سر کرنے پڑے''۔ (۵۶)

یعنی سال میں دو حملے کے اوسط سے قاضی ابن عامر اور ان کی فوج یورپین علاقوں کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئی تھی۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں مروانیوں کی مرکزی حکومت عروج وشباب کے آخری نقطوں تک قوت ودولت کے اعتبار سے پہنچی ہوئی تھی اس زمانہ میں عرب فاتحوں کی تاخت وتاراج کا کیا حال ہوگا۔ ۲۶ سال کی حکومت میں ایک آدمی جب ۵۲ چھاپے مار سکتا تھا، تو اندلس کے

Marfat.com

ان متعدد اولو العزم مروانی فرمانرواؤں اور کشور کشاؤں کے زمانہ میں جو کچھ بھی ہوا ہوگا آج ہم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

تاہم اندلس کی مبسوط اور مفصل تاریخوں سے کوئی چاہے تو ان جنگی مہموں کی فہرست بنا سکتا ہے کہ کئی صدیوں کی بے شمار لڑائیوں میں ''الحرب سجال'' کے قاعدے سے ہمیشہ میدان مسلمانوں ہی کے ہاتھ نہیں رہتا تھا لیکن اندلس کی تفصیلی تاریخ کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مروانیوں کی مرکزی حکومت جب تک قائم رہی اور اس کے کچھ دن بعد تک بھی ننانوے فیصد مہموں میں میدان عموماً مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہا۔

اسی یورپ پر جس کا حال آج جو کچھ ہے اسے ہم سب دیکھ رہے ہیں وہ زمانہ بھی گذرا ہے جب مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے مقتولوں کی تعداد تین تین لاکھ تک پہنچ جاتی تھی اس کی کثرت کو بتاتے ہوئے ہمارے مؤرخین کبھی لکھتے ہیں کہ:

''جمع الرؤس اکدا ساحتی کأن الفارس لا یری من یقابله''(۵۷)

''مقتولوں کے سروں کو بطور ڈھیر کے جمع کر دیا گیا تھا کہ اتنی اونچی دیوار ان سے تیار ہوگئی کہ گھوڑے کا سوار بھی ڈھیر کے اس پار والے سوار کو نہیں دیکھ سکتا تھا''۔

اور لاشوں کے پشتوں پر اذان دینے کے واقعہ کا اعادہ تو ان تاریخوں میں اتنی دفعہ کیا گیا ہے کہ گویا اندلس کے مسلمانوں کی یہ ایک عام عادت ہوگئی تھی۔

مقتولوں کے ساتھ قیدیوں کی تعداد بھی ہزاروں سے کم نہیں بتائی جاتی، قاضی ابن عامر ہی کے زمانہ میں جو بڑا معرکہ فرانسیسیوں سے پیش آیا تھا لکھا ہے:

''اجتمع من السبی ثلاثون الفاً'' (۵۸)

''تیس ہزار قیدی اکٹھے ہوگئے''

Marfat.com

یہی یورپ جو آج ساری دنیا کو اپنے جال میں پھنسائے ہوئے ہے، اس کا ایک زمانہ تو یہ تھا، اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی یہ حالت تھی:

''مروانی حکمران ہشام بن عبدالرحمٰن کی حکومت کے زمانہ میں ایک صاحب نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میرے متروکہ مال کے ایک حصہ سے فدیہ دے کر مسلمان قیدیوں کو چھڑایا جائے۔ اس کی موت کے بعد قاضی نے وصیت کے مطابق حکومت سے درخواست کی کہ دشمنوں کے پاس اگر کوئی مسلمان قیدی ہو، تو اس کا پتہ چلایا جائے، تاکہ فدیہ کا روپیہ مال متروکہ سے الگ کر کے داخل کیا جائے''۔(۵۹)

حکومت نے اس سلسلہء ممکنہ کی کاروائی جو وہ کر سکتی تھی کرتی رہی، لیکن تحقیق سے ثابت ہوا:

"لم یوجد فی دار الکفار اسیر یشتری و یفک لضعف العدوّ قوۃ المسلمین"(۶۰)

''غیر اسلامی حکومتوں میں کوئی ایسا مسلمان قیدی نہ ملا جسے فدیہ دے کر چھڑایا جائے یہ دشمن کی کمزوری اور مسلمانوں کی قوت کا حال تھا''

میرا مقصود مؤرخ کے آخری الفاظ یعنی ''لضعف العدوّ قوۃ المسلمین'' کا ایک اجمالی نقشہ ان سرسری معلومات کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔

ذرا خیال کیجیے ایک ایک جنگ میں مسلمانوں نے تیس تیس ہزار یورپین قید کیے ہیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ حکومت اپنے سارے ذرائع سے کام لینے کے بعد بھی کسی ایسے مسلمان کا پتہ نہ چلا سکی جو یورپ کی لڑنے والی قوموں کی قید میں ہو۔

اختتام جنگ کے بعد بسا اوقات یورپ کی شکست خوردہ حکومتیں اپنے قیدیوں کو بڑی سے بڑی رقمیں پیش کر کے قید سے چھڑایا کرتی تھیں، ابن اثیر نے

Marfat.com

ایک موقع پر لکھا ہے کہ ایک یورپین امیر جو مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو گیا تھا:

" افتدی نفسه منهم بتسعین الف دینار" (۶۱)

''نوے ہزار اشرفیاں دے کر اپنی گلوخلاصی اس نے کرائی''

یہ واضح رہے کہ طلائی سکہ یعنی نوے ہزار دینار کی رقم روپیہ کی شکل میں کئی لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ایک قیدی کے زرِ فدیہ میں کبھی کبھی ایسی خطیر رقمیں بھی وصول ہوتی رہتی تھیں۔ اور یہ رقم غنیمت کے ان اموال کے سوا تھی جن کا ذکر کرتے ہوئے عموماً مؤرخین:

''لا یعلمه الا الله''

''نہیں جانتا ہے ان کی مقدار اور تعداد کو مگر صرف اللہ تعالیٰ''، لکھا کرتے ہیں جس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یورپ کے ان سپاہیوں کے ضعف، جبن، بزدلی اور کم ہمتی کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ شمالی افریقہ کے صحرائی بربری مسلمانون کی ایک ٹولی وہاں کی مقامی حکومت سے خفا ہو کر اندلس چلی گئی، قاضی ابن عامر نائب السلطنتِ مروانیہ کا زمانہ تھا، اس کی صحیح تعداد تو معلوم نہ ہو سکی لیکن ایک ٹولی سے زیادہ حیثیت ان بربری مسلمانوں کی نہ تھی۔ قاضی ابن عامر نے لوگوں کو اپنے یہاں ٹھہرالیا کچھ دن گذرنے کے بعد ان لوگوں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ ہم لوگ اندلس میں بے کار بیٹھے بیٹھے کب تک دن گذاریں اور اندلسی مسلمانوں کی اس چراگاہ کی طرف اشارہ کیا، جو یرنیز کے دروں سے گذرنے کے بعد ملتی تھی۔ قاضی نے ان کی مرضی کے مطابق اندلس کی حکومت کے فوجیوں کو بھی ان لوگوں کے ساتھ کر دینا چاہا لیکن ان بربری مسلمانوں نے انکار کیا اور عرض کیا کہ ہم جتنے کچھ بھی ہوں، دشمنوں کے لیے کافی ہیں، البتہ کچھ ساز و سامان سے مدد کر دیجیے، چنانچہ گھوڑے اور اسلحہ کا انتظام ان

Marfat.com

کے لیے کر دیا گیا اور یہ لوگ دروں سے گذرتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں گال قوموں کا دار السلطنت تھا۔ رات کو ایک باغ پر حملہ کیا لوگ شہر سے نکل پڑے بربری کسی ٹیلے کی آڑ میں چھپ گئے اور جب شہر والے اس ٹیلے کے آگے نکل گئے تو پیچھے سے تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ان پر جا پڑے، دشمن کے آدمیوں نے خیال کیا کہ کوئی بڑی فوج ان کے ساتھ ہے، اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور بربریوں کی یہ ٹولی مظفر و منصور مالِ غنیمت کے ساتھ قاضی ابن عامر کی خدمت میں پہنچ کر شاباشی کی مستحق قرار پائی۔ (۶۲)

بعض واقعات ان ہی قاضی ابن عامر ہی کے سلسلہ میں ایسے بیان کیے جاتے ہیں کہ بے ساختہ آدمی کو ہنسی آ جاتی ہے اور خدا کی شان نظر آتی ہے، یہی یورپ ایک زمانہ میں کیا تھا اور آج وہ کیا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ خود قاضی ابن عامر جو پرنیز کے دروں سے اپنی فوج لے کر فرانس میں داخل ہوئے اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے اندرونِ ملک میں دور تک گھستے ہی چلے گئے، فرانسیسیوں نے ان قبائلی ریاستوں کے آدمیوں کو ملا لیا جو برنیز کے ان دروں کے آس پاس آباد تھے اور ان ہی کے ذریعہ جو پرنیز کے پہاڑی درے اس طریقہ سے بند کر دیئے گئے کہ مسلمانوں کے لیے واپسی ناممکن ہو گئی۔ قاضی صاحب کو وقت پر خوب سوجھی اپنی فوج کے آدمیوں کو حکم دیا کہ جس کو جہاں موقع ملے مکانات کی تعمیر اور کھیتی شروع کر دے اور دوکانیں قائم کر دے۔

غرض ایسے حالات پیدا کیے گئے، جن سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں نے دروں سے باہر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیا اور یہاں مستقل طور پر توطن پذیر ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فرانسیسیوں نے یہ رنگ دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے وہ مسلمان جو دروں سے گذرنے کے بعد ان کے ملک پر ہر سال مصیبتیں توڑا کرتے

Marfat.com

تھے اگر ان کے ملک ہی میں آباد ہو جائیں گے تو کیا قیامت ڈھائیں گے یہی سوچ کر اسی وقت ان کے سفراء قاضی صاحب کے پاس پہنچے کہ درے کھول دیئے جاتے ہیں آپ لوگ واپس تشریف لے جائیں۔ لیکن ہمارے ملک کی کوئی چیز آپ کے ساتھ نہ جا سکے گی۔ یعنی غنیمت کے اموال واپس کر دیئے جائیں۔ قاضی صاحب نے یہ سن کر کہا کہ خواہ درے کھولے جائیں یا نہ کھولے جائیں ہم لوگوں نے تو اب اسی پار مستقل وطن کا ارادہ کر لیا ہے۔ تب سفراء نے کہا کہ اچھا مالِ غنیمت بھی ساتھ لے جائیں اور کسی طرح ہمارے علاقہ سے نکل کر آپ دروں کے پار چلے جائیں۔ قاضی نے پھر بھی قیام پر اصرار کیا۔ بالآخر یورپین سفیروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''اموالِ غنیمت بھی اپنے ساتھ لے جائیں، اس کے سوا ہم لوگ اور بھی اتنی رقم پیش کریں گے، آپ کے اموالِ غنیمت کی بار برداری کے لیے سواریاں بھی مہیا کرتے ہیں''۔(۶۳)

اس وقت قاضی صاحب نے قیام کے مصنوعی ارادہ کے فسخ کا اعلان کیا اور حسب شرائط جو یرنیز کے دروں سے سب کچھ لیے ہوئے اندلس صحیح وسالم وغانم واپس پہنچ گئے۔(۶۴)

بہرحال مسلمانانِ اندلس کی ضخیم وطویل تاریخ سے چند جستہ جستہ شہادتوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اس لیے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اندلس کی مزدانی حکومت کی دولت وثروت جس کے بل پر وہ آخری زمانہ میں عباسی خلفاء کے ساتھ ہم چشمی اور ہمسری کی مدعی بن بیٹھی تھی اور اس کی ساری اولوالعزمیوں کا سرچشمہ اندلس کی سرزمین نہ تھی، جسے مسلمانوں نے چھوڑ دیا۔ بلکہ اندلس کی حیثیت تو گویا ایک اڈے کی تھی اور دولت وثروت کا طوفان جو اس ملک میں امنڈ آیا تھا اس کا دہانہ اندلس سے باہر آس پاس کی ریاستیں اور جو یرنیز

Marfat.com

کے دروں کے پار والے وسیع میدانوں والی یورپین حکومتیں تھیں ، یورپ کی یہ حکومتیں ان کے امراء، اہل کار اور کلیسا کے پادری، یورپ کے عوام کو لوٹ لوٹ کر اپنے گھر بھرتے تھے اور ان بھرے ہوئے گھروں سے اندلس کے مسلمان جو کچھ جب جی چاہتا تھا لے آتے تھے وہ ان کے لیے تو ایک نوالہ اور نہ ختم ہونے والا دفینہ تھا جو اندلس کی راہ سے ان پر منکشف ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ جو کچھ کیا جاتا تھا وہ اسلام اور کفر ہی کے نام سے کیا جاتا تھا لیکن کیا واقعی اسلام ہی کے لیے یہ جدو جہد تھی اور اس کا انجام اندلس کے مسلمانوں کے سامنے کیا اسی شکل میں آ سکتا تھا جیسا کہ بعد کو آیا۔ اس مسئلہ کے اس پہلو پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ سردست صرف دو ہی نتیجوں کی طرف پڑھنے والوں کا ذہن منتقل کرنا چاہتے ہیں ایک تو وہی کہ جزیرہ نمائے اندلس کی جو اہمیت وہاں کے مروانی حکمرانوں کی دولت وثروت و وقار و عظمت کی داستانوں کو سنا کر پیدا کر دی گئی ہے ان کے بچے کھچے آثار کے دیکھنے والے اندلس کے متعلق جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں ان کا ازالہ ہو جائے کہ یہ جو کچھ تھا اندلس کی بدولت نہ تھا اس لیے اندلس کو ہم نے اگر کھویا تو کوئی ایسی چیز نہیں کھوئی ہے جس پر اتنا ماتم کیا جائے اور خواہ مخواہ اس کے عشق کا آزار دلوں میں پیدا کیا جائے بلکہ سچ تو یہ ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے شاید وہی اندلس زیادہ مفید ثابت ہوتا جس میں یہ سب نہ ہوتا، نہ الحمراء ہوتا، نہ الزہراء، نہ ہمارا قرطبہ، اور غرناطہ، مگر جو فرض آخر الامم ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں پر عائد کیا گیا ہے اگر اس کو پیش نظر رکھ کر کام کیا جاتا تو آج سیاسی مصائب و آفات کے جن گردابوں میں ہم تہ و بالا ہو رہے ہیں شاید یہ صورتِ حال پیش نہ آتی۔

یورپین اقوام کے ساتھ اندلسی مسلمانوں کی کش مکش کے سلسلے میں جن

Marfat.com

واقعات کا تذکرہ میں نے کیا ہے سلطانی کو اپنے پدری حقوق سمجھنے والوں کے لیے خواہ ان کی نوعیت جو کچھ بھی ہو لیکن دین ہی کے سامنے نہیں بلکہ عقل اور انسانیت کے سامنے بھی کم از کم میری گردن تو جھک جاتی ہے درد کی اس داستان کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ اس کے سوا دوسری بات جس کی طرف توجہ دلانا ہے وہ یہ ہے کہ وہی یورپ جسے اندلسی مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ دیکھ چکے، ایک زمانہ میں کیا بنا ہوا تھا اگر وہ جدوجہد، سعی وکوشش کی سرگرمیوں کی بدولت عزت واقتدار کی ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے تو مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالیوں کو دیکھ کر یہ کتنا غلط اور حد سے زیادہ قنوطی بلکہ شاید ابلیسی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ پستیاں بلندیوں سے نہیں بدل سکتی ہیں۔

سچ پوچھیے تو اندلس کی تاریخ کا یہی وہ پہلو ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خوف اور دہشت کی جگہ جو اندلس کے لفظ کے سننے کے ساتھ ہی ہم میں پیدا ہو جاتی ہے، یا ان کیفیات کے پانے کے ہم عادی بنا دیئے گئے ہیں۔ قطعاً ان کے برعکس ہم تو اپنے اندر امید اور رجا ہی کی روشنی پاتے ہیں، یقیناً اس گئی گذری حالت میں بھی دنیا کے مسلمان قرونِ مظلمہ کے یورپین باشندوں سے بہر حال بہتر ہیں، ان بدترین حالات سے نکل کر جب موجودہ بہترین حالات تک یورپ والے پہنچ سکتے ہیں تو مسلمانوں کو روح اللہ سے اپنے آپ کو بلاوجہ مایوس بنا لینے کی کوئی وجہ نہیں۔

Marfat.com

حواشی

الف۔ حضرت مولانا نے اس فقیر کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ محض ان کی خوردنوازی اوران کے خلق وشرافت کا نتیجہ ہے جس کا یہ ننگ اسلاف مستحق نہیں، مگران کی تحریر میں تصرف کی جرأت بھی نہیں تھی، اس لیے ایک برگزیدہ عالم دین وآلِ رسول کے ان کلماتِ خیر کواس کے ایک خادم کے حق میں دعااور باعثِ خیروبرکت سمجھ کر بجنسہ شائع کر دیا گیا۔

ب۔ یہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم سابق ناظم دارالترجمۃ حیدرآباد اوران کی کتاب جغرافیہ اندلس کی طرف اشارہ ہے۔

ج۔ عمواس شام کی ایک وادی کا نام ہے جہاں پچیس ہزار مسلمان جن میں صحابہ کرام کی بھی کافی تعداد تھی، طاعون میں شہید ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ نصف دنیا کی فتح کرنے کے لیے یہ پچیس ہزار مسلمان فوجی کافی تھے باقی ناموں سے لوگ عام طور پر واقف ہیں، یا کتابوں میں ان واقعات کی تفصیل پڑھنی چاہیے۔

د۔ حجاز کی خراجی آمدنی میں غالب قرینہ ہے کہ عرب کے دوسرے علاقے مثلاً یمن، بحرین، عمان کی آمدنی بھی اسی قسم میں شریک ہوگی۔

ھ۔ کامل میں ابن اثیر نے پوری نظم نقل کی ہے جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

فقلت شبیھی فی التغرب و النوی وطول التنالی عن بنی وعن اھلی

(الکامل، ۶/۳۸، ابن اثیر، مبارک بن محمد، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ)

و۔ نقرئی سکہ سے طلائی سکے کے اس ذخیرہ کو بدل دینے کے بعد حساب کر کے بعضوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کئی ارب روپے تک عبدالرحمٰن کا متروکہ پہنچ جاتا ہے۔

ز۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ ضرار بن الخطاب ایک قریشی عربی تھے انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے قبیلہ مضر کے کسی آدمی کو کبھی قتل نہ کروں گا، احد کی جنگ میں قریش کی طرف سے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ بھی آئے تھے۔ گھمسان کا رن جب پڑا تو عبداللہ بن جحش صحابی جو قبیلہ مضر ہی کے تھے ضرار کی تلوار کے سامنے آگئے، یہ دیکھ کر چلانے لگے۔ ابن جحش میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تم مضری ہو، اس لیے میں تم کو مار نہیں سکتا، عبداللہ بن

Marfat.com

جحش نے یہ سن کر کہا کہ اے خدا کے دشمن کفر کے ساتھ تیری اس عصبیت (نیشنلٹی) نے تو تیرے قتل کو میرے لیے زیادہ محبوب بنا دیا ہے۔ گویا کفر اور عصبیت دونوں کی حیثیت ان کی نظر میں برابر تھی۔ (تاریخ دمشق، ۲۴/۷، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ)

ح۔ یہ فیصلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں دیا تھا۔

ط۔ تفصیل کے لیے: الکامل، ۱۷۹/۴

ی۔ حجاز کے عربوں کی اکثریت نزار بن معد بن عدنان کی نسل سے تھی، اسی لیے ان کو نزاری بھی کہتے تھے اور یمن کے باشندے قحطانی عرب تھے، اسی فتنہ کی تعبیر کبھی مضروبہ قیسیہ سے بھی کی جاتی تھی، تفصیل کے لیے بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

ک۔ قرآن کی مشہور آیت ﴿یا ایھا الناس انا جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا﴾ (الحجرات/۱۳) میں ''شعوب'' کا لفظ جو آیا ہے، جس میں اقوام و قبائل کی تقسیم کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ باہمی تعارف کے لیے اس کا استعمال اس تقسیم کا قدرتی استعمال ہے۔ لیکن اس کو قومی نخوت، قبائلی برتری اور دوسروں کی پستی اور ہیچ مبرزی کا ذریعہ بنالینا اس کا غیر فطری استعمال ہے۔

اقوام وامم کی باہمی خونریزیوں کے اسباب میں بڑا تاریخی سبب یہی غلط استعمال بن گیا ہے آگے قران مجید میں یہ فرما کر کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات/۱۳) (خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے) حاصل جس کا وہی ہے کہ برتری وفضیلت کا معیار ذات نہیں، بلکہ صفات ہیں۔ ذات کچھ بھی ہو، عربی ہو، یا عجمی لیکن خدا کے یہاں وہی شریف ٹھہرایا جائے گا جو اپنی سیرت وکردار میں خدا کے نشان زدہ حدود پر ٹھہرا ہوا ہے اور تقویٰ کی زندگی گذارتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے استدلال کرنے والوں کا نام ''شعوب'' کے لفظ کی وجہ سے شعوبیہ رکھ دیا گیا تھا، اگر یہی واقعہ ہے تو ان مسلمانوں کی یہ بڑی دیدہ دلیری تھی۔ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شعوبیہ کے مقابلہ میں عربوں کی نسلی برتری ثابت کرنے کے لیے کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں، العقد الفرید میں ابن قتیبہ مشہور مصنف کی ایک کتاب کا اسی سلسلہ میں تذکرہ کرتے ہوئے یہ عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ نقض فی اخرہ کل ما بنی فی اولہ (العقد الفرید، ۶۳/۲، ابن عبدربہ، احمد بن محمد، مصر، مطبع الجمالیہ، ۱۳۳۱ھ) یعنی سارے انسانوں کے مقابلہ میں عربی نسل کی برتری کو جن دلائل سے ابن قتیبہ نے اپنی کتاب

Marfat.com

میں ثابت کیا تھا، آخر میں خود ہی سب کی تردید کر دی اور یہ نہ کرتے تو اور کرتے کیا؟۔

ل۔ اصل شعر یہ ہے:

كنا نسوس الناس والا أمر أمرنا إذ نحن فيهم سوقة ننتصف

یعنی ہم ہی لوگوں پر حکومت کرتے تھے، اور حکم صرف ہمارا حکم تھا، اچانک ہم ان لوگوں میں شریک ہو گئے جن پر دوسرے حکومت کرتے ہیں اور دوسروں سے اپنا انصاف کراتے ہیں۔ (الکامل، ۱۸۵/۵)۔

م۔ مشہور ہے کہ درباریوں میں صرف ایک قاضی منذر البلوطی تھے، جنہوں نے اس چھچھورے پن اور کوتاہ نظری پر عبدالرحمٰن کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ شیطان بازی گری کر رہا ہے۔ پھر قرآن کی مشہور آیت یاد دلائی جس کا حاصل یہی ہے کہ ''ناعاقبت اندیشی کی عام کمزوری جو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے، قدرت صرف اس کی رعایت کر رہی ہے ورنہ اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے دنیا اور دنیا کی زندگی اتنی بے قیمت ہے کہ اللہ اور رسول کے منکروں کے مکانات، ان کی چھتیں، ان کے زینے، سب ہی چاندی سونے کے بنا دیئے جاتے، دیکھیے قرآن کی سورۂ زخرف کی آیت ۳۳ ﴿لو لا ان یکون الناس امة واحدة﴾۔ اس موقعہ پر اس دلچسپ لطیفہ کا خیال آتا ہے کہ یہی عبدالرحمٰن ناصر قصر الزہراء کا بانی و معمار جس میں بقول مقری پندرہ ہزار سے زیادہ بڑے اور چھوٹے کیواڑ استعمال کیے گئے تھے، ستونوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی، کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن کی ایک ڈائری مرنے کے بعد ملی تھی، جس میں لکھا تھا کہ اپنی حکمرانی کی پوری مدت (پچاس سال) میں صرف چودہ دن مجھ پر ایسے گذرے ہیں جن میں کہہ سکتا ہوں کہ غم و الم فکر و تردد کے کانٹوں سے پاک تھے۔ (شذرات الذہب، ۵/۳، ابن العماد الحنبلی، عبدالحی بن العماد، بیروت، دار المسیرۃ، ۱۳۹۹ھ) یہی خود اعترافی شہادت قاضی البلوطی کی تنبیہ کے لیے کافی ہے۔

ن۔ قوط دراصل گاتھ کے لفظ کی معرب شکل ہے مسلمانوں سے پہلے گاتھ قوم ہی کے لوگ اندلس پر مسلط تھے، الدیباج الذہب میں ابن فرحون نے بیان کیا ہے کہ قوطیہ درحقیقت اندلس کے گاتھ بادشاہ رازدق کے نواسے کی لڑکی تھی۔ اسلام قبول کر کے اندلس سے فریادی بن کر ہشام بن عبدالملک وقت کے حکمران کے پاس پہنچی، اس شاہزادی سے عیسیٰ بن مزاحم نے نکاح کر

Marfat.com

لیا۔ (الدیباج المذہب، ص۲۶۲، ابن فرحون، ابراہیم ابن علی بن محمد، مصر، مطبعۃ السعادہ، ۱۳۲۹ھ)

حوالہ جات

۱۔ الکہف/۱۱۱

۲۔ الکامل، ۱۸۲/۵، ابن اثیر، مبارک بن محمد، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

۳۔ محولہ بالا

۴۔ مقدمہ، ص۱۵۱، ابن خلدون، عبدالرحمٰن، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۵۔ الکامل، ۲۲/۷

۶۔ ایضا، ۳۸/۶

۷۔ المعجب، ص۳۱، مراکشی، ابومحمد، عبدالواحد بن علی، مصر، مطبع السعادۃ، س، ن

۷۔(ب) محولہ بالا

۷۔(ج) المعجب، ص۳۲، ۳۱

۸۔ الکامل، ۱۸۳/۵

۹۔ الکامل، ۳/۵

۱۰۔ مقدمہ ابن خلدون، ص۱۵۱

۱۱۔ الکامل، ۲۲/۷

۱۲۔ تاریخ ابن خلدون، ۱۴۴/۴، ابن خلدون، عبدالرحمٰن، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۱۳۔ النور/۵۵

۱۴۔ تاریخ ابن خلدون، ۲۲۵/۲

۱۵۔ محولہ بالا

۱۶۔ الطبقات الکبریٰ، ۴۴۲/۶، ابن سعد، محمد ابن سعد، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء

۱۷۔ فتوح البلدان، ص۳۰۰، البلاذری، احمد بن یحییٰ، برل، ۱۸۶۶ء

۱۸۔ ایضا، ص۱۹۳

۱۹۔ احکام القرآن، ۱۷۵/۱۔۱۷۴، الجصاص، ابوبکر، احمد بن علی، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

۲۰۔ ایضاً، ۲۷۵/۱

۲۱۔ الجامع الصحیح، کتاب الاحکام، باب استقضاء الموالی واستعمالھم: ۶۷۵۴، بخاری۔

Marfat.com

محمد بن اسماعیل، دمشق، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ

۲۲۔ العقد الفرید، ۲/۲۶۰؛ ابن عبدربہ، احمد بن محمد، مصر، مطبع الجمالیہ، ۱۳۳۱ھ

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ فتوح البلدان، ص ۲۰۱

۲۵۔ معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۹۹، حاکم، ابوعبداللہ، محمد بن عبداللہ، المدینۃ المنورہ، المکتبۃ العلمیۃ، ۱۳۹۷ھ

۲۶۔ احکام القرآن، ۴/۲۹۶

۲۷۔ الکامل، ۴/۱۷۹

۲۸۔ محولہ بالا

۲۹۔ احکام القرآن، ۴/۲۹۷

۳۰۔ مروج الذہب، ۷/۱۸۲، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع احمد الحلمی، ۱۳۰۳ھ

۳۱۔ الکامل، ۵/۱۳۷

۳۲۔ الکامل، ۵/۱۸۳

۳۳۔ محولہ بالا

۳۴۔ الکامل، ۶/۴

۳۵۔ ایضاً، ۶/۳

۳۶۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۳۸۔ تاریخ دمشق، ۵/۵۶، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ

۳۹۔ الکامل، ۸/۲۲۳

۴۰۔ محولہ بالا

۴۱۔ محولہ بالا

۴۲۔ محولہ بالا

۴۳۔ شذرات الذہب، ۳/۵۶، ابن العماد الحنبلی، عبدالحی بن العماد، بیروت، دار المسیرۃ، ۱۳۹۹ھ

۴۴۔ الکامل، ۳/۵۶

۴۵۔ شذرات الذہب، ۳/۶۲

۴۶۔ محولہ بالا

۴۷۔ محولہ بالا

۴۸۔ وفیات الاعیان، ۴/۳۶۸، ابن خلکان، شمس الدین، احمد بن محمد، ایران، منشورات الرضی، ۱۹۷۱ء

۴۹۔ تاریخ ابن خلدون، ۴/۱۴۶

۵۰۔ مقدمہ ابن خلدون، ۱/۱۸۶

۵۱۔ المعجب، ص ۵۴

۵۲۔ ایضاً، ۵۵۔۵۳

۵۳۔ مقدمہ ابن خلدون، ۱/۴۷۴

Marfat.com

۵۴۔ المعجب، ص ۱۳

۵۵۔ شذرات الذہب، ۳/۴

۵۶۔ الکامل، ۶/۲۲۵

۵۷۔ ایضاً، ۶/۱۷۲

۵۸۔ ایضاً، ۹/۱۲

۵۹۔ ایضاً، ۶/۱۹

۶۰۔ الکامل، ۶/۱۹

۶۱۔ ایضاً، ۷/۲۱۸

۶۲۔ الکامل، ۹/۱۱

۶۳۔ ایضاً، ۸/۲۲۵

۶۴۔ محولہ بالا

Marfat.com

شیخ اکبر محی الدینؒ ابن عربی کا نظریہ علم (الف)

نظریہ علم (Theory of knowledge)

مشہور اسلامی عارف حضرت شیخ محی الدین ابن عربی جو عموماً مسلمانوں میں شیخ اکبر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ خاکسار نے مجلس دائرۃ المعارف کی ایک علمی بزم میں جو غالباً ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد ہی میں منعقد ہوئی تھی۔ شیخ ہی کے متعلق ایک مقالہ عربی زبان میں سنایا تھا۔ اس مقالہ میں حضرت شیخ کے علمی نقاطِ نظر پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا تھا، جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ منجملہ اور باتوں کے ان کے متعلق میں نے یہ بھی لکھا تھا:

''منجملہ ان امور کے جن کی طرف شیخ نے خاص توجہ مبذول کی ہے، جہاں تک میرا خیال ہے وہ انسانی فکر و نظر کی حد پرواز کا مسئلہ ہے''

میں نے اس سلسلہ میں اس پر بھی تنبیہ کی تھی کہ:

''جس چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ یورپ والے اور جوان یورپ والوں کے طفیلی یا ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں ان سبھوں نے اس مسئلہ کی ایجاد و تنقیح کا سہرا جرمنی کے حکیم کانٹ کے سر باندھا ہے۔ اپنی اور اپنی قوم کے لیے اس چیز کو یہ مایہ فخر و فضل بنائے ہوئے ہیں''۔(۱)

پھر عرض کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں شیخ اکبر کے نظریات اور افکار پر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ حکیم کانٹ المانی سے وہ کم اہمیت نہیں رکھتے۔

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ، دہلی (فروری و مارچ، ۱۹۴۵ء) کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

مجھ سے خواہش کی گئی کہ آج کی مجلس مستشرقین کے شعبہ اسلامیات میں شیخ اکبر کے اسی نظریہ کے متعلق بعض چیزیں آپ کے سامنے پیش کروں ۔ امتثالاً للامر اپنی محدود فہم کے مشورہ سے اس مجلس میں شیخ اکبر کے کلام سے جن اجزاء کا انتخاب میں نے کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے ۔ علماء قدیم کے حلقوں مین اگر چہ شیخ اکبر کی ذات والا صفات کسی تعریف سے یقیناً مستغنی ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ کی مجلس میں قدیم عناصر کے ساتھ جدید اسطقسات بھی ملے جلے ہیں ، ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض حضرات کے لیے ان کا نام نیا ہو ، اس لیے کام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام کا تعارف کرالیا جائے اور اب تو جدید کے ساتھ علماء کا قدیم طبقہ بھی جہاں تک میں جانتا ہوں شیخ اور ان کے کارناموں سے تقریباً نامانوس ہو چکا ہے ، اس تعارف کی ضرورت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے ۔

شیخ اکبر کا اجمالی تعارف

مرسیہ جو اندلس کے مشرقی علاقہ کا ایک مشہور شہر ہے ۔ حضرت شیخ کی ولادت اس شہر میں ۵۶۰ھ میں ہوئی ۔ اندلس کا یہ وہ زمانہ ہے جب اسلامی دولت اس سرزمین میں اپنے بچے کھچے وقار و اقتدار کو بھی ختم کر رہی تھی ۔ ملک میں عام طور سے طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا ۔ تھوڑے تھوڑے دن کے بعد مختلف علاقوں میں مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہو ہو کر ختم ہوتی رہتی تھیں ۔ بدامنی فتنہ و فساد کا ہر طرف بازار گرم تھا ۔ چاہیے تو یہی کہ بے اطمینانی کے ایسے دور میں علم و کمال کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے ۔ لیکن قدرت کا شاید یہ بھی قانون ہے کہ سحر کا چراغ دم توڑنے کے لیے جب آخری دفعہ بھڑکتا ہے تو اس کی اسی روشنی میں بسا اوقات بعض عجیب و غریب ہستیاں نمایاں ہوئی ہیں ۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ ، مغرب میں ابن خلدون اس نظریہ کی بہترین

Marfat.com

مثالیں ہیں۔

شیخ اکبرؒ کو بھی ملی موت کے اسی افاقہ کا ایک عجیب وغریب مظہر سمجھتا ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس جامعیت کو ہم شیخ اکبر میں پاتے ہیں، اسلامی علماء وصوفیا کی طویل الذیل تاریخ میں اس کی نظیر صرف مشکل ہی نہیں بلکہ غالباً ناممکن ہے۔ اس زمانہ کے مروجہ علوم خواہ عقلی ہوں یا نقلی، ادبی ہوں یا دینی، شیخ کی کتابیں بتا سکتی ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی ایسا علم یا فن اس زمانہ میں پایا جاتا ہوگا جس سے صرف معمولی لگاؤ نہیں بلکہ تحقیقی رشتہ قائم نہ تھا۔

شیخ کی تصنیفات کی تعداد

یوں تو ان کی کتابیں حدوشمار سے باہر ہیں لیکن حروب صلیبیہ کے بطل اعظم سلطان صلاح الدین انار اللہ برہانہ کے صاحبزادے جن کا ذکر شیخ نے خود اپنی کتاب ''فتوحات مکیہ'' میں بایں الفاظ کیا ہے:

''بعض بادشاہوں کے پاس میری بات سنی جاتی تھی اور حلب کے بادشاہ ملک ظاہر غازی ہیں، خدا کی ان پر رحمت ہو، الناصر الدین اللہ سلطان صلاح الدین ابن ایوب کے یہ صاحبزادے ہیں''۔ (۲)

شیخ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں نے سلطان سے ایک سو اٹھارہ سفارشیں مختلف معاملات میں کیں۔ فقضاها کلها (۳) یعنی ہر بات منظور کی، آگے ایک طویل قصہ ہے، جس کے ذکر کی حاجت نہیں، مجھے کہنا یہ ہے کہ اسی سلطان غازی کو شیخ نے ایک علمی سند دی تھی، جسے مشہور لغوی عالم مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس نے خود دیکھا تھا، صاحب قاموس کا بیان ہے کہ اپنی تصنیفات کی اجازت کے سلسلہ میں کتابوں کے نام درج کرتے ہوئے:

''عد نیفاو اربعمائة مصنف'' (۴)

Marfat.com

''شیخ نے چارسو سے اوپر کتابیں شمار کی ہیں''

ان میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں مثلاً فتوحات مکیہ جو مصر و قسطنطنیہ میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ چار جلدوں میں یہ کتاب ابتداء کی دو جلدیں تقریباً ہزار ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہیں اور آخر کی دو جلدیں سات سات سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ گویا چار سو سے اوپر کتابوں میں صرف یہی ایک کتاب تین ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اسی سے ان کی دوسری کتابوں کا اندازہ کیجیے۔ صاحب قاموس نے ان کی ایک تفسیر کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''جن میں ان کی کبیر تفسیر ہے، جو سورہ کہف کی آیت وعلمناہ من لدنا علما تک پہنچ کر رہ گئی کہ شیخ کی وفات ہوگئی اس وجہ سے پوری نہ کر سکے، یہ ایک ایسی تفسیر ہے جس کا ہر حصہ اور اس کی ہر جلد ایک ایسے دریا کی شکل رکھتی ہے، جس کا کنارہ نہ ہو''۔(۵)

اور غالباً یہی تفسیر شیخ کی ہے جس کا ذکر البطل الغازی المجاہد صاحب السیف والقلم، الامیر عبدالقادر الجزائریؒ نے اپنی کتاب ''المواقف'' میں بایں الفاظ کیا ہے:

''معلوم ہو کہ ایک تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی کی پائی گئی ہے جس کا نام ''کتاب الجمع والتفصیل فی اسرار التنزیل'' ہے اور مقدار اس کتاب کی (۶۶۰) چھ سو ساٹھ جلدیں ہیں''۔(۶)

الجزائری نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصر میں سورہ کہف تک اس تفسیر کے اجزاء ملے ہیں۔ ''واللہ اعلم بالصواب'' جس شخص کے لکھنے کا یہ حال ہو، کہ فتوحات مکیہ جب لکھ رہے تھے تو:

''جہاں کہیں ہوتے (غالباً سفر و حضر ہر جگہ) روزانہ تین کراسہ (جز) لکھا لیا

Marfat.com

کرتے تھے''۔(۷)

اوراس کا اعتراف تو انہوں نے خود کیا ہے کہ:

''اپنی تصنیفوں میں کسی تصنیف کا میں نے مسودہ نہیں لکھا یعنی بس جو مسودہ ہوتا تھا، وہی مبیضہ بھی تھا''۔(۸)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ ان کی کتابیں عموماً برداشتہ قلم لکھی گئی ہیں اور اس کا پتہ خود ان کی کتابوں سے بھی کچھ چلتا ہے، جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے۔

بہر حال ان کی اسی ایک کتاب فتوحات مکیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے زمانہ کے کسی علم میں ان کا پایہ معمولی نہ تھا۔ اگر چہ ظاہر ہے کہ ان پر اصلی مذاق جس علم کا غالب تھا وہ تصوف ہی کا فن ہے اور دنیا میں عام طور پر ان کی شہرت ایک صوفی عالم ہی کی حیثیت سے ہے بھی۔ شیخ کے ان سارے علمی اور قلمی مجاہدات کے پیچھے کیا چیز عمل کر رہی تھی۔ میں نے اس کا کچھ ذکر اپنے اس عربی مقالہ میں بھی کیا ہے ان کے دل میں جس چیز کی آگ لگی ہوئی تھی اور اسی سوزش کو ان عجیب وغریب کتابوں کا میں سبب قرار دیتا ہوں، کچھ اس کا اندازہ ان کے منظوم خط سے بھی ہوتا ہے جو روم (ایشیائے کوچک) کے سلطان عز الدین کیکاؤس کے ایک مکتوب کے جواب میں انہوں نے لکھا ہے شیخ نے اس خط کو فتوحات میں درج فرمایا ہے۔ خط منظوم ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:

کتبت کتابی والدموع تسیل و مالی الی ما ارتضیه سبیل

''میں اپنا خط لکھ رہا ہوں اور آنسو بہ رہے ہیں اور میرے بس میں نہیں ہے کہ ان کو راضی کروں''۔

ارید اری دین النبی محمداً یقام و دین المبطلین یزول

''چاہتا ہوں کہ میں محمد ﷺ کے دین کو دیکھوں کہ وہ بلند کیا جائے اور جھوٹوں کا

Marfat.com

دین مٹ جائے"۔

فلم ارالا الزور یعلو و اهله یعزون والدین القویم ذلیل

"مگر بجز بناوٹی سخن سازیوں کے اوراس کے کاروبار کرنے والوں کے سوا کسی کو معزز ہوتے ہوئے نہیں پارہا ہوں"۔

فیا عز دین الله سمعا لناصح شفیقاً فنصاح الملوک قلیل

"اے اللہ کی دین کی عزت ایک بہی خواہ کی نصیحت سن، جو تجھ پر مہربان ہے یاد رکھ کہ بادشاہوں کو نصیحت کرنے والے کم ہیں"۔

و حاذر بتائید الالٰہ بطانة یشیر بامر ما علیه دلیل

"اور بچو اللہ کی مدد سے ایسوں کو رازدار بنانے سے جو اشارے ایسی باتوں کی طرف کرتا ہو، جس کی دلیل نہ ہو"۔(۹)

ان اشعار سے شیخ کے باطنی محرکات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کے مولد یعنی اندلس پر کفر کا تسلط دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا اور جیسا کہ ان کا خیال تھا جس کا ذکر مختلف مقامات مین انہوں نے کیا بھی ہے۔ یعنی ان ساری تباہیوں کی ذمہ داری اسلام کے سلاطین اور علماء کے سر عائد ہوتی ہے۔ مختلف مضامین لکھتے لکھتے کہیں ان کے قلم سے ان پوشیدہ جذبات کا اظہار ہو جاتا ہے۔ خود اپنے وطن اندلس کو خیرباد کہہ کے جب وہ مشرقی ممالک کی طرف چلے آئے اور اس طرح آئے جیسا کہ سوانح نگار نے لکھا ہے:

"اپنے وطن مرسیہ سے شیخ ۵۶۸ھ میں اشبیلیہ روانہ ہوئے اور ۵۹۸ھ تک وہیں رہے۔ پھر اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ حج کے ارادے سے جس کے بعد پھر اندلس واپس نہ ہوئے"۔(۱۰)

اندلس سے روانہ ہو کر جب جبل الطارق کی آبنائے کے پاس آئے ہیں تو

Marfat.com

سبتہ نامی شہر میں ان کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ اس ملاقات میں شیخ کا ان سے جو مکالمہ ہوا ہے، اس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''سمندر کے آبنائے کے پاس سبتہ میں بعض صالحین کے یہاں حاضر ہوا، مجھ میں اور حکومت میں بعض ایسی باتیں ہوئیں تھیں جن کا نتیجہ قلب کی تنگی تھی اور قدر و منزلت جس سے گرتی تھی، ان بزرگ کو اس کی خبر ملی تھی مجھ پر ان کی جب نظر پڑی تو بولے کہ بھائی ایسا آدمی ذلیل ہو جاتا ہے، جس کی اعانت کوئی ظالم نہ کرے، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں ایسا بادشاہ بھی گمراہ ہو جاتا ہے، جس کی رہنمائی کوئی عالم نہ کرے، بزرگ نے فرمایا کہ نرمی نرمی (یعنی ذرا نرمی اختیار کرنا چاہیے) میں نے عرض کیا کہ جی ہاں جب تک اصل پونجی پر آنچ نہ آئے یعنی دین محفوظ ہو، بزرگ نے یہ سن کر فرمایا کہ سچ کہتے ہو اور خاموش ہو گئے''۔(۱۱)

جہاں تک میرا خیال ہے شیخ کی ان ہی تلخ نوائیوں اور اندرونی بے چینیوں نے ان کو اندلس چھوڑنے پر مجبور کیا اور مشرق کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ کیونکہ یہاں ان کو بعض ایسے سلاطین مل گئے جو ان کی باتوں پر کان دھرتے تھے۔ شیخ ہمیشہ ان سلاطین کو اس طرف متوجہ کراتے تھے، کہ علماءِ سوء کی اصلاح کرو، دین ان ہی کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے۔ فتوحات ہی میں ایک جگہ انہوں نے علماءِ سوء کے متعلق ایک واقعہ درج کیا ہے، اس واقعہ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔

''وہی صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر غازی نے ایک دن مجھے خبر دی، یعنی مجھ سے اور ان سے بعض معاملات کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے ملک اور میری حکومت میں جو قابل

Marfat.com

اعتراض باتیں ہیں اور جو مظالم ہو رہے ان کے متعلق آپ مجھے منع فرماتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اس باب میں آپ کا خیال ہے وہی میرا بھی ہے کہ یقیناً یہ ساری باتیں غلط ہیں۔ لیکن سیدی! خدا کی قسم یہ جتنی بری باتیں ہیں، ان سب کے متعلق فقیہ کا فتویٰ موجود ہے۔ یعنی ان کی صحت و جواز کا فقیہ (مولوی) نے فتویٰ دے رکھا ہے، ان کے دستخط میرے پاس موجود ہیں، تو خدا کی ان ہی پر لعنت ہو''۔ (۱۲)

شیخ نے الملک الظاہر کے اس بیان کو نقل کر کے پھر اس نیک دل بادشاہ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''خود ایک مولوی جو فلاں صاحب ہیں انہوں نے مجھے فتویٰ دیا ہے، سلطان نے اس مولوی کی شخصیت بھی متعین کی، یہ اس شہر کے بڑے نامی گرامی فاضل ہیں۔ دین اور مذہب میں سختی ان کا بھی خاص امتیاز ہے۔ ان مولوی صاحب نے (بادشاہ نے کہا کہ) مجھے یہ بتایا ہے کہ مجھ پر خاص رمضان کا روزہ فرض نہیں ہے۔ بلکہ سال کے کسی ایک مہینہ میں جس میں بھی چاہوں، روزہ رکھ سکتا ہوں (غالباً مولوی کی تاویل یہ ہو کہ بادشاہوں کو خصوصاً اس زمانہ میں جنگی مہموں میں مشغول رہنا پڑتا تھا اس وجہ سے آج یہاں کل وہاں مارے مارے پھرتے تھے۔ یہ سفر کی حالت ہے اور مسافر روزوں کو ماہِ رمضان سے مؤخر کر سکتا ہے''۔ (۱۳) واللہ اعلم

شیخ فرماتے ہیں کہ اس فقیہ کے اس فتویٰ کا ذکر کر کے الملک الظاہر نے کہا:

''میں نے دل ہی دل میں اس مولوی پر لعنت کی اور اس پر اس کو ظاہر نہ کیا، مولوی کا بادشاہ نے نام بھی بتایا، خدا ان لوگوں پر رحم کرے''۔ (۱۴)

یہی بے دینیاں تھیں جو عوام ہی نہیں بلکہ خواص امت میں انہیں محسوس

Marfat.com

ہو رہی تھیں ۔ ملک کیکاؤس کے نام ایک اور طویل خط بھی شیخ نے لکھا تھا، جس کو بجنسہ انہوں نے فتوحات میں نقل کر دیا ہے۔ شروع میں اس کے لکھتے ہیں:

''۶۰۹ھ میں یونان کے شمالی حصہ کا بادشاہ جس کا نام الغالب لامر اللہ کیکاؤس ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا (یونان کے شمالی حصہ نے ایشیائے کوچک کا حصہ مراد ہے جہاں آج ترکوں کا پایہ تخت ہے اسی کو روم بھی کہتے تھے (۱۵)، مولانا روم اسی علاقہ کی طرف منسوب ہیں''۔

خط بہت طویل ہے، فتوحات کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں آیا ہے۔ اس خط کے آخر میں بھی چند اشعار ہیں جن میں سے بعض شعر یہ ہیں ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ملک کیکاؤس نے اپنا سلطانی نام عز الدین رکھا تھا۔

اذا انت اعززت الهدی و تبعته فانت لهذا الدین عز کما تدعی

''اگر دینی ہدایت کو تم سے عزت نصیب ہو، اور اس کی خود بھی تم پیروی کرو تو بیشک تم دین کی عزت ہو جیسا کہ تم پکارے جاتے ہو''۔

وان انت لم تحفل به و اهنته فانت تذل الدین تخفضه و ضعا

''اور اگر تم نے دین کو نہیں سمیٹا اور اسے ذلیل کیا تو پھر دین کے تم خوار کرنے والے، اور اسے تم نے پست کر دیا''

فلا تاخذ الا لقاب زوراً فانه لتسئل عنها یوم یجمعکم جمعا

''پس جھوٹ موٹ کے القاب نہ اختیار کیا کرو کیونکہ جس دن تم لوگ (قیامت میں) جمع کیے جاؤ گے، اس کے متعلق پوچھے جاؤ گے''

ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ خطاب تم پر اسی وقت ہوگا، جب دین کے اعزاز کا کام کرو گے ورنہ

وان قال دین لله کنت بملکه ذلیلاً و اهلی فی میادینه صرعی

Marfat.com

''اللہ سے دین نے اگر کہا کہ میں اس شخص کی حکومت میں ذلیل تھا اور دین دار لوگ اس ملک میں پچھڑے پڑے تھے تو قیامت کے دن تمہارا کیا جواب ہوگا''۔

اور آخر میں اسی بادشاہ کے کسی نائب السلطنت کی طرف ایما فرماتے ہوئے متنبہ کرتے ہیں:

لکم نائب فی الامر اصبح ملحداً . واضحی لا هل الدین یقطعهم قطعا

''تمہاری حکومت میں تمہارا جو نائب ہے وہ بے دین ہو گیا ہے۔ اربابِ دین کو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے پھر اسی بادشاہ کا جو دوسرا خطاب الغالب الامر اللہ ہے، اس سے نفع اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

فما لک لن تغلبه واسمک غالباً و مالک لم تعز له اذا اثر النقعا

''آخر تم اس پر غالب کیوں نہیں ہوتے حالانکہ نام تو تمہارا غالب ہے اس کو معزول کیوں نہیں کرتے وہ گرد تو اڑا چکا تھا ہے''۔(۱۶)

الغرض یہ اور اسی قسم کی مختلف شہادتوں سے جن کا ذکر اس مختصر مقالہ میں موجب طوالت ہوگا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شیخ کا عہد جس میں اسلام کے مغربی ممالک پر یورپ سے اور مشرقی ممالک پر تاتار سے کفر کا بادل امنڈ امنڈ کر آگ برسا رہے تھے اور اسلام کی جو وقعت قلوب میں تھی، دن بدن اس کی دیوار کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نہ صرف عوام بلکہ مسلمانوں کے خواص جن میں علماء و سلاطین و امراء سب ہی شریک تھے۔ اپنی اپنی ایمانی قوتوں کو کھوتے چلے جا رہے تھے۔ قرآن اور پیغمبر ﷺ سے ان کا تعلق کمزور ہوتا چلا جاتا تھا، اور اسی کے یہ نتائج تھے جن کا ذکر شیخ نے اپنے مذکورہ بالا بیانات میں فرمایا ہے۔

حضرت شیخ نے جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

فکر وغور کے بعد ان امراض کا سراغ لگالیا تھا جو مسلمانوں کو دین سے دور کرنے کے اسباب تھے اور بجائے جدل یا مولویوں کے عام مناظرانہ عقیم طریقوں کے انہوں نے ان امراض کے علاج کے متعلق کلی تدبیریں سوچ کر اختیار فرمائی تھیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، ان کی عام کتابوں کی تعداد تو چار سو سے بھی متجاوز ہے اور تفسیر کی چھ سو ساٹھ جلدوں کو اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ تعداد دونی سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، مگر تفسیر پر تو میری نظر نہیں پڑی۔ ان کے سوا سچی بات تو یہ ہے کہ بجز ایک دو کے عموماً ان کی کتابوں کے مضامین ایک ہی قسم کے ہیں۔ اجمالاً وتفصیلاً۔ مختلف پیرایوں میں وہ انہی مجوزہ علاجی تدبیروں کو دہرا دہرا کر بیان فرماتے ہیں۔

منجملہ ان کلی امور کے جن پر شیخ نے اپنی کتابوں میں سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں، علم کا مسئلہ بھی ہے۔ وہی جس کی تعبیر موجودہ اصطلاح میں تھیوری آف نالج (Theory of Knowledge) کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دین سے بغاوت کا وہ حصہ جو علم کے جھوٹے ادعاء پر مبنی ہے، شیخ نے چاہا ہے لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ خود اس ''علم'' اور ''دانش'' کی حقیت کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں اور اپنے اسی جاننے کی بنیاد پر نہ سوچنے والوں کے قلوب میں دین کا جو احتقار پیدا ہوتا ہے، شیخ نے سمجھانا چاہا ہے کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ خود یہ جاننا کیا چیز ہے اور تمہارے اس ''جاننے'' کی رسائی کا آخری نقطہ کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ آدمی پر جب اپنی ''دانش'' کی اصلی حقیقت کھل جاتی ہے تو وہ سارا نشہ کرکرا اور پھٹ کر ہوا ہو جاتا ہے، جس کے شکار عموماً وہی لوگ ہو جاتے ہیں جو تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد ہر چیز کی تنقید اپنے علم کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن علم وجہل کے سلسلہ میں آدمی کا جو صحیح مقام ہے جب وہ اس پر واضح ہو جاتا ہے تب سمجھ میں آتا ہے: معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

Marfat.com

اس مسئلہ کو شیخ نے فتوحاتِ مکیہ وفصوص الحکم وغیرہ میں مختلف اسالیب میں ادا کیا ہے سب کو اگر جمع کیا جائے اور ان شاء اللہ جب وقت آئے گا تو وہ جمع کیے جائیں گے، تو میں شاید مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ محض اس ایک مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات ونظریات ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات کی گنجائش سے کم کے متقاضی نہ ہوں گے۔ خصوصاً شیخ کا جو ایک خاص طریقہ ہے۔ یعنی وہ اپنے مسودہ پر نظر ثانی نہیں کرتے اور قلم اٹھا کر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں اس کا شبہ بھی ہوتا کہ ان کے کلام میں تضاد ہے۔ کامل بحث کرنے والے کو ضرورت ہوگی کہ سلسلہ کے ساتھ ان کے کلام کے مختلف اجزاء کو ایک خاص ترتیب کی شکل میں سمیٹے۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے اس تدبیر سے ان کے کلام میں بظاہر جو تناقض جو محسوس ہوتا ہے، عموماً وہ اٹھ جاتا ہے۔ ماسوا اس کے ایک بات یہ بھی ہے کہ شیخ بھی بہرحال آدمی ہیں اور آدمی کے خیالات میں کچھ ردو بدل اتار چڑھاؤ تو ہوتا ہی رہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنی کسی کتاب میں انہوں نے ایک خیال ظاہر کیا ہو۔ لیکن بعد کو ان کا خیال بدل گیا ہو۔ فتوحات میں اپنے خیال کی اس تبدیلی کا ایک دلچسپ قصہ خود ہی انہوں نے نقل فرمایا ہے ان کے اس خیالی انقلاب کی نوعیت پر چونکہ روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے تذکرہ کرتا ہوں فرماتے ہیں:

''میں ان لوگوں میں تھا جو عورتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور پھر اسی اصول پر اٹھارہ سال تک قائم رہا۔ اس طریقہ (یعنی طریقہ صوفیاء) میں جب ابتداءً داخل ہوا تو میرا بھی یہی خیال تھا''۔ (۱۷)

گویا اٹھارہ سال تک ایک خاص خیال کا ان پر تسلط رہا اس کے بعد ایک طویل بحث کے بعد اپنے اس خیال میں تبدیلی کے اسباب ووجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

Marfat.com

''مگر اب بحمد للہ عورتوں کی یہ نفرت مجھ سے نکل گئی ہے اور خدا نے عورتوں کو میرے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اب میں ان لوگوں میں ہوں جو عورتوں پر سب سے زیادہ مہربان ہیں اور ان کے حقوق کی سب سے زیادہ نگہداشت کرتے ہیں میں اب اس معاملہ میں بصیرت پر ہوں۔ یہ بات خدا کی طرف سے ہے۔ یعنی اسی نے عورتوں کو میرے لیے محبوب بنا دیا ہے۔ یہ بات کوئی طبیعت کا اقتضاء نہیں ہے''۔(۱۸)

جہاں تک میرا خیال ہے شیخ جب تک یورپ (اندلس) میں رہے اور اندلس کے صوفیاء پر قرب مکانی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ عیسائی رہبان اور تارک الدنیا فقراء کا اثر پڑتا ہی ہوگا، اور ظاہر ہے کہ عیسائی مذہب میں عورت ہی پر ان سارے مصائب کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، جن میں آدم اور اولاد آدم اس خاکدانِ اراضی میں مبتلا ہے۔ اربابِ کلیسا کا فتویٰ ہی یہ تھا کہ عورت صرف گندگی اور نجاست ہے، وہ شیطان ہے، اس میں روح نہیں ہے، بلکہ باوجود ان حالات کے جن کا مظاہرہ یورپ اس وقت نسائیت کے مسئلہ میں کر رہا ہے، پھر بھی مذہبی طور پر محض یورپ کے عام باشندوں ہی پر نہیں بلکہ جن بیچاروں کے نفس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی اثرات کو اپنے اندر جذب کیا، یا چرا لیا ہے، دنیا میں عورتوں کے ساتھ وہ خواہ کسی قسم کا بھی تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن دیکھا یہی جا رہا ہے کہ آنے والی آخرت کی زندگی میں عورتوں کا تخیل ان کے لیے ناقابل برداشت بنا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنی جنت کے سلسلے میں دوسری چیزوں کے ساتھ جوں ہی عورتوں کا ذکر آتا ہے ان کی پیشانیوں پر شکن پڑ جاتی ہے۔ بجز اس نفسیاتی سبب کے کہ عیسائی ذہنیت جنت میں عورت کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتی۔ گویا عورت کے ذکر کے ساتھ ہی خدا کی پاک بہشت ان کی نگاہوں میں حیوانی جنت کی قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

Marfat.com

سوچنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اس کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا جنت اور دوزخ کے مسائل بھی سائنس اور کیمسٹری کے حدود میں آتے ہیں یا آ سکتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ذیلی مسئلہ ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ شیخ کے خیالات میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اٹھارہ سال تک ایک خیال پر شیخ جمے رہے۔ لیکن مشرق کی زندگی نے ان پر ثابت کیا کہ جنت تو عورتوں ہی کے قدموں کے نیچے ہے۔ پھر ان کی رائے اس باب میں بدل گئی۔ شیخ نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب کے مختلف مقامات پر بڑی دلچسپ بحثیں فرمائی ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ شیخ کے متعلق ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان کا ایک خاص طرز یہ ہے کہ اپنے مختلف مضامین کا مخاطب انہوں نے مختلف طبقے کے لوگوں کو قرار دیا ہے ان کا نظریہ ہی یہ ہے جیسا کہ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ کلم الناس علی قدر عقولھم ایک یہ وجہ بھی ہے جو ان کے کلام سے بعض دفعہ لوگوں میں الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ وسوسہ ہوتا ہے کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ شیخ نے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فتوحات ہی میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کے مفتی جن کا نام انہوں نے ابو عبداللہ محمد بن ابی الصیف الیمنی نزیل مکہ بتایا ہے۔ ان مفتی صاحب کے سامنے ان کی کتاب جس کا نام ''مشاہد قدسیہ'' ہے اس کی ایک ایسی عبارت پیش کی گئی جو اپنے عنوان اور تعبیر میں کچھ وحشت رکھتی تھی۔ شیخ کو مفتی نے بلا کر دریافت کیا آپ نے اس کی ایک لطیف توجیہ کی لکھتے ہیں کہ سننے کے ساتھ:

''وہ بڑا خوش اور مسرور ہوا، خدا اس پر رحم کرے''۔(۱۹)

مفتی کو انہوں نے گو مطمئن فرما دیا لیکن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس عبارت کا ایک اور دقیق پہلو بھی تھا میں نے اس پہلو کا ذکر اس لیے اس مجلس میں نہیں

Marfat.com

کیا کہ وہ نہ اس کو برداشت کرسکتا تھا اور نہ اس کا انکار کرسکتا تھا۔ اس لیے اندیشہ تھا کہ جھنجھلا کر خواہ مخواہ بگڑ نہ بیٹھے۔ شیخ نے اس کے بعد ارقام فرمایا ہے کہ:

''اس کے پاس نہ تو قوی ایمان ہی تھا اور نہ علم اور سلامت نظر تھی۔ وہ حیران ہوکر رہ جاتا اسی لیے میں نے اس کے سامنے ایسی بات کی جو اس کے عقلی مزاج کے مطابق تھی''۔ (۲۰)

بہر حال اگر ان اجمالی نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو شیخ اکبر کے کلام میں اس قسم کی پیچیدگیاں جو محسوس ہوتی ہیں وہ انشاء اللہ بآسانی زائل ہوسکتی ہیں۔ اور سچی بات تو یہی ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے جیسا کہ شیخ نے خود بھی لکھا ہے، ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں ذرا وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگوں کے لیے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہوجاتی ہیں۔ لیکن یہ ان کے کلام کا نہیں پڑھنے والوں کا نقص ہے۔

اب ان تمہیدی باتوں کے بعد جو باوجود ارادۂ اختصار کے کافی طویل ہو گئیں۔ اصل مسئلہ کا ذکر حتی الوسع اجمال کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہتا ہوں کہ اجمال سے زیادہ کا یہ موقع بھی نہیں ہے۔ خدا کرے میری کتاب وہ مکمل ہوجائے جسے شیخ کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں کہ تفصیل وبسط کا صحیح مقام وہی کتاب ہوسکتی ہے۔

واللہ یوفق لما یحب و یرضاہ

شیخ اکبر اور نظریہ علم

بات یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یورپ کے چند حکماء کی بدولت اب تو یہ مسئلہ اہل علم کے لیے نامانوس نہیں رہا ہے کہ فلسفہ کے جس اسکول کی تعبیر ''مادیت'' سے کی جاتی ہے، یعنی بجائے خدا کے مادہ ہی کو عالم کے تمام شئون وصفات کا سرچشمہ فرض کیا جاتا ہے۔ خواہ ایسی صفات ہوں جنہیں ہم زندگی اور حیات کے بغیر

تصور کر سکتے ہوں یا ایسے نہ ہوں۔ ہر ایک کے متعلق اس طریقہ فکر میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے صرف مادہ ہی کی ارتقائی تجلیاں ہیں، یا بقول بعض مادہ ہی کے رحم سے یہ سارے بچے پیدا ہو رہے ہیں، جو جمادات ونباتات وحیوانات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یورپ کے ارتیابیوں اور تصوریوں دونوں نے یہ پوچھ کر کہ ''مادہ'' کا وہ لفظ جس پر مادیت کی ساری تعمیر کھڑی کی گئی ہے، خود اس کا ترجمہ کیا ہے یا یوں پوچھیے کہ ہم اپنے معلومات میں سے کس معلوم کی تعبیر مادہ کے لفظ سے کرتے ہیں؟ جونہی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے، چند معمولی سوال وجواب کے بعد بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مادہ صرف ایک لفظ ہے جس کے مصداق اور معنی کا کوئی تخیل نہ بولنے والے ہی کے سامنے ہے، نہ سننے والے کے۔ برکلے نے اس مسئلہ کو نارنگی کی مشہور مثال سے سمجھایا ہے، کہ ان ساری صفات کو جو نارنگی میں پائے جاتے ہیں، اگر اس سے الگ کر لی جائیں تو صفات کی تحلیل کے بعد بتایا جائے کہ کون سی چیز نارنگی میں ایسی باقی رہ جاتی ہے، جس کی تعبیر ذات یا ''مادہ'' سے کی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے مشہور ہے کہ پتھر پر پاؤں پٹک کر برکلے سے کہا تھا کہ یہ مادہ نہیں تو اور کیا ہے، جواب میں اس نے کہا کہ میں سختی کا منکر نہیں ہوں، جو آپ کی ٹانگ توڑ دے۔ البتہ اس سختی کی صفت کے پیچھے جس ذات کا دعویٰ کیا جاتا ہے مجھے اس سے انکار ہے، اور اس کے ثبوت کا کوئی ذریعہ کسی کے پاس کچھ نہیں، قطعاً کچھ نہیں ہے۔ بہر حال قریب قریب یہ مسئلہ اب مسلمہ ہے کہ مادہ ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کا علم نہ اس شخص کو تھا جس نے اس نام کو شروع شروع میں تراشا تھا اور نہ اس وقت تک کوئی خاص خیال کسی دماغ میں موجود ہے۔ اور نہ آئندہ کوئی اس کا صحیح تخیل پیدا کر سکتا ہے۔ بکسلے کا یہ مشہور فقرہ زبان زد اہل علم ہے کہ

''آج کی سائنس اس سے زیادہ کسی بات کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی، کہ

Marfat.com

میٹریلزم کا انتساب اُس کی طرف ہو، اس لیے کہ بہر حال میٹریلزم کی وقعت ایک فلسفیانہ ڈاگما (ادعا) سے زیادہ نہیں"

مگر خیر اس زمانہ میں تو کافی تدقیق وتحقیق کے بعد فلسفہ نے اس نقطہ پر آ کر دم توڑا ہے، لیکن آپ کو سن کر تعجب اور مسرت دونوں چیزیں حاصل ہوں گی کہ شیخ اکبر نے بھی جب اسلام کی نصرت کا علم اپنے ہاتھ میں لیا تو منجملہ اور چند کلی امور کے ان کی نظر بھی ادعائی حقیقت یعنی مادہ پر پڑی کہ دین کی بنیاد کو جس زمانہ میں بھی کھوکھلی کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس وقت بے دینوں کے ہاتھ میں سب سے زیادہ کارگر حربہ یہی مادہ کا ہوائی لفظ ثابت ہوا ہے۔

شیخ نے بھی اسی لیے اپنی کتاب میں اس مسئلہ کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے اور اسی لیے تاکہ مادہ کی حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ انہوں نے بھی پہلے ان ہی ذرائع کا جائزہ لینا چاہا ہے جن کے ذریعہ سے آدمی معلومات حاصل کرتا ہے۔

شیخ نے اس سلسلہ میں پہلا دعوی یہ کیا ہے کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی میں علم یعنی جاننے کے دو مستقل ذرائع ہیں، ایک حواس اور دوسری عقل اور اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ جن چیزوں تک حواس کی رسائی نہیں ہوتی، عقل سے آدمی ان کو اپنا معلوم بنا سکتا ہے، شیخ نے مختلف الفاظ میں اس دعویٰ کا شدت سے انکار کیا ہے، کبھی فرماتے ہیں:

"عقل بالکل سادہ پیدا کی گئی ہے، اس کے سامنے نظری علوم میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے"۔(۲۱)

کبھی اس دعویٰ کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں:

"ان العقل ما عنده من حيث نفسه علم" (۲۲)

"بذات خود عقل کے اندر کسی قسم کا کوئی علم نہیں ہے"

Marfat.com

اپنے ان دعاوی کو سمجھاتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز جو ہمیں معلوم نہ ہو، اس کا علم عقل کے ذریعہ سے حاصل کرنا ناممکن ہے، مگر سوال ہوتا ہے کہ پھر علم اور دانش کے معاملہ میں عقل کا کام کیا ہے، اسی کو ان الفاظ میں سمجھاتے ہیں:

''عقل جن باتوں کے علم کو حاصل کرتی ہے، یہ اس کے قبول کرنے اور مان لینے کی صلاحیت کا نتیجہ ہے''۔(۲۳)

مطلب یہ ہے کہ خود براہِ راست کسی چیز کے دریافت کرنے کی تو عقل میں صلاحیت نہیں ہے، البتہ دریافت کی ہوئی چیزوں کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت رکھی گئی ہے، رہ گئی یہ بات کہ پھر علم یعنی ایسے معلومات جو پہلے سے معلوم نہ تھے، ان کو آخر آدمی کس ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، شیخ نے اس کا جواب یہ دیا ہے:

''عقل ان علوم کو فکر کی قوت سے قبول کرتی ہے اور فکری قوت خیال کی مقلد ہے، خیال حواس کا مقلد ہے''۔(۲۴)

مطلب یہ ہے کہ عقل میں صرف معلومات کے ماننے اور قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور یہ معلومات عقل کو آدمی کی ایک اور قوت دیتی ہے، جس کا نام فکر ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ فکر کا کام یہ ہے کہ عقل گویا اس سے کہتی ہے:

میز الحق و الباطل — حق کو باطل سے جدا کر

یعنی معلومات جن میں حق و باطل دونوں ملے ہوئے ہیں ان میں سے جو حق ہے، اس کو باطل معلومات سے جدا کر دے۔ پھر یہ سوال اٹھا کر کہ آدمی کی فکری قوت جن معلومات پر عمل کرتی ہے، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ شیخ نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے:

''یعنی فکری قوت کی جولانگاہ بھی وہی میدان ہے، جسے خیالی قوت تیار کرتی

Marfat.com

ہے''۔(۲۵)

رہ گئی یہ بات کہ خیالی قوت میں معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں، شیخ نے اس کام کو دو قوتوں کی طرف منسوب کیا ہے، فرماتے ہیں:

''اور خیالی قوت میں وہی باتیں حاصل ہوتی ہیں جنہیں حواس عطا کرتے ہیں یا قوت مصورہ دیتی ہے''۔(۲۶)

یعنی خیالی قوت کو معلومات حواس سے ملتی ہیں، یا اس قوت سے ملتی ہیں جسے قوت مصورہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حواس سے مراد تو یہی باصرہ سامعہ وغیرہ کی حسی قوتیں ہیں، باقی قوت مصورہ تو اس کے متعلق خود فرماتے ہیں:

''قوت مصورہ کا مادہ محسوسات ہی سے حاصل ہوتا ہے، ایسی صورتیں جن کا وجود ذہن سے باہر واقع میں نہیں ہے، ترکیب دے کر قوتِ مصورہ اسے بناتی ہے۔ لیکن ان ترکیب یافتہ صورتوں کے سارے اجزاء انہی چیزوں سے حاصل کیے جاتے ہیں جو حواس کے فراہم کردہ ہوتے ہیں یعنی محسوسات سے (ب)''(۲۷)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ مصورہ کے معلومات کی بھی انتہا محسوسات ہی پر ہو جاتی ہے، یعنی براہِ راست معلومات کے حاصل کرنے کا حقیقی کام نہ عقل کا ہے، نہ فکر کا، نہ خیال کا نہ مصورہ کا، بلکہ یہ فرض صرف حواس کے سپرد ہے۔

پھر حواس میں بھی ہر حاسہ کا تعلق خاص خاص معلومات سے ہے، مثلاً سامعہ صوتی معلومات (آواز) باصرہ رنگ و روشنی، ذائقہ، مزہ، شامہ، خوشبو، بدبو وغیرہ کے علم حاصل کرنے کے مخصوص ذرائع ہیں۔ پس یہی حواس اپنے مقررہ معلومات کو ابتداءً حاصل کرتے ہیں اور بیچاری عقل ان ہی کی حاصل کردہ معلومات کو ہضم کرتی ہے اور اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ ایک مثال سے اس مسئلہ کو شیخ نے ان الفاظ میں سمجھایا ہے:

Marfat.com

قدرت نے ایک خاص قسم کی آفرینش، قوت شنوائی کو عطا کی ہے، اسی لیے اس کی پرواز اپنی حد سے تجاوز نہیں کر سکتی اور عقل کو اسی قوت شنوائی کا خدا نے محتاج کر دیا ہے۔ اسی قوت کے ذریعہ سے عقل آواز اور حروف، لفظوں کے مختلف انقلابی تغیرات اور مختلف زبانوں میں جو فرق ہے، ان سب کا علم حاصل کرتی ہے، اسی کے ذریعہ سے وہ پرندوں کے چہچہاہٹ، آندھیوں کے شور، دروازوں کی کھٹ کھٹ، پانی کے شور، آدمی کی آواز، بکریوں، مینڈھوں، بیل، اونٹ کی آوازوں میں اور بھی جو اس قسم کی آوازیں ہیں، ان تمام آوازوں میں فرق عقل اسی قوت شنوائی کی راہ سے حاصل کرتی ہے"۔(۲۸)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"عقل کے بس میں نہیں ہے کہ بذاتِ خود ان امور کا علم حاصل کرے، جب تک کہ شنوائی اس علم کو عقل تک نہ پہنچائے"۔(۲۹)

اسی طرح پھر باصرہ کی معلومات کو گنوانے کے بعد فرماتے ہیں:

"یہی حال بینائی کی قوت کا ہے، کہ تمام وہ چیزیں جو دیکھی جاتی ہیں، اللہ نے عقل کو ان امور کے علم میں اسی بینائی کی قوت کا فقیر بنا دیا ہے، اسی لیے سبزی، زردی، نیلگونی، سفیدی، سیاہی اور تمام رنگ جو سیاہی، سفیدی کے درمیان ہیں ان کا علم عقل کو مل ہی نہیں سکتا، جب تک کہ قوت بینائی اس نعمت کو ان کے لیے فراہم نہ کرے"۔(۳۰)

شیخ نے اس کے بعد لکھا ہے:

"وھکذا جمیع القوی المعروفة بالحواس"(۳۱)۔

"وہ ساری قوتیں جن کی تعبیر حواس سے کی جاتی ہے ان سب کا یہی حال ہے"

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ اگر ہر قسم کے حواس سے کوئی محروم پیدا ہوا۔ عقل اس کی خواہ کتنی بھی تیز ہو لیکن وہ اپنے اندر کسی بیرونی معلوم کے علم کو حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اصل کام معلومات کی فراہمی کا تو حواس ہی انجام دیتے ہیں۔

''پھر خیال وقوتِ خیالیہ حواس کی فقیر ہے۔ اسی لیے آدمی کسی چیز کا خیال کر ہی نہیں سکتا، جب تک کہ حواس اس چیز کا علم اسے عطا نہ کریں''۔(۳۲)

شیخ نے اس مسئلہ کو خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مختلف پیرایوں میں اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے، میں نے بطور مثال کے اس کلام سے چند فقرے منتخب کر کے پیش کیے ہیں:

پس جب یہ طے ہو گیا کہ معلومات کے حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ حواس ہی ہیں، ان کے سوا اور جن جن قوتوں کا علم سے تعلق سمجھا جاتا ہے اس کے تعلق کی حیثیت بالکل ثانوی درجہ کی ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ حواس کو جو چیز معلوم نہ ہو اس کا علم براہِ راست یہ ثانوی قوتیں حاصل کر لیں۔

اب اس کے بعد شیخ ادھر توجہ دلاتے ہیں کہ وجود کا یہ مظہر جسے ہم عالم اور کون کہتے ہیں ان کے متعلق ہمارا حقیقی علم کیا ہو سکتا ہے۔ شیخ نے دعویٰ کیا ہے مثلاً فصوص میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان العالم کله مجموع اعراض ''(۳۳)

''سارا عالم اعراض (صفات) کا مجموعہ ہے''

پھر اس کو پہلے ایک منطقی طریقہ سے سمجھاتے ہیں:

''اشیاء کی تعریف جب کی جاتی ہے، اس وقت یہ بات کھل جاتی ہے، کیونکہ چیزوں کی تعریف یہ لوگ جب کرتے ہیں، تو ان تعریفوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ساری چیزیں صرف اعراض یعنی صفات ہیں''۔(۳۴)

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ مثلاً جسم ہی کی تعریف کیجیے، یہی کہا جائے گا کہ طول وعرض وعمق کو جو قبول کرتا ہو، اب ظاہر ہے کہ طول بھی ایک عرض اور صفت ہے، عرض یعنی چوڑائی بھی ایک عرض اور صفت ہی ہے، عمق یعنی گہرائی بھی ایک صفت اور عرض ہی ہے۔ اس طرح نباتات کی تعریف میں علاوہ ان صفات کے یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ جس میں نشو ونما کی قوت ہو، ظاہر ہے کہ یہ نشو ونما کی صفات بھی عرض اور صفات ہی ہیں۔ آگے حیوان کی تعریف میں کہتے ہیں جس میں زندگی اور حیات ہو، ظاہر ہے کہ زندگی، حیات یہ بھی اعراض اور صفات ہی ہیں۔

اب یہ دعویٰ کہ ان صفات کے لیے موصوف کا ہونا یا ان اعراض کے لیے محل کا ہونا ضروری ہے، بس شیخ کو اسی سے اختلاف ہے۔ کیونکہ ان صفات کا علم تو آدمی کو حواس سے ہو رہا ہے۔ اور جو صفات نہیں ہیں، انہیں انسانی حواس جان ہی نہیں سکتے۔ گذر چکا کہ جتنے حواس ہیں سب کا تعلق صفات ہی سے ہے۔ مثلاً بینائی کا تعلق رنگ سے ہے روشنی سے ہے، اور یہ صفات ہیں۔ شنوائی کا آواز اور ہوائی ارتعاشات سے ہے۔ ارتعاشات بھی صفات ہی ہیں، شامہ کا خوشبو سے بدبو سے، بو بھی صفت ہے۔ لامسہ یعنی چھونے کی قوت کا تعلق حرارت، برودت، نرمی سختی سے ہے اور یہ سارے امور صفات ہیں۔ اب ان صفات کی آڑ میں جو مدعی ہے کہ کوئی ذات پوشیدہ ہے، اس کو یہ بتانا چاہیے کہ اس ذات کا علم کس ذریعہ سے اس کو حاصل ہو رہا ہے۔ عقل، خیال، فکر، ساری ادا کی قوتیں بتایا جا چکا کہ حواس ہی کی فقیر ہیں۔ حواس ہی کے حاصل کردہ معلومات کو یہ اپنا معلوم بناتے ہیں اور ان ہی پر اپنے اپنے دائرہ اثر کے حساب سے عمل کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز حواس ہی کی گرفت میں نہیں آ رہی ہے اس تک غریب حواس کی محتاج قوتوں کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ مادہ اسی ذات کا نام رکھا گیا تھا جو ان صفات کا حامل اور

Marfat.com

موصوف یا ان اعراض کی ذات ومحل ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ان صفات کے لیے موصوف کی ضرورت اس لیے جو محسوس ہو رہی ہے کہ کسی صفت مثلاً سیاہی کا قیام کپڑے کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے، اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ ضرورت ہی بے ضرورت ہے۔

''جو چیزیں بذاتِ خود قائم نہیں رہ سکتیں ان ہی کے مجموعہ سے ایسی چیز حاصل ہو رہی ہے جو بذاتِ خود قائم ہے''۔

شیخ کا خیال ہے کہ ان صفات کے پیچھے محض حواس اور عقل کے زور سے کسی ذات کا ثابت کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ وہ مدعی ہیں کہ مادہ ہی نہیں بلکہ ان صفات کے پیچھے جس کا مشاہدہ ہمارے حواس عالم کی شکل میں کر رہے ہیں کسی خدا کی ذات کو بھی محض حواس وعقل کے زور سے ثابت کرنے کی کوشش ایک ایسی کوشش ہے جو کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی ان کا مشہور فقرہ ہے:

''خدا کو عقل یعنی فکر ونظر کی راہ سے جس نے ڈھونڈھا وہ سرگشتہ اور سراسیمہ ہو کر رہ گیا''۔

دوسرے الفاظ میں اسی خیال کو یوں ادا کرتے ہیں:

''عقل اس حیثیت سے کہ وہ نظر وفکر، بحث وتلاش کا کام کرتی ہے خدا کو جان نہیں سکتی''۔

تیسری جگہ اس خیال کو یوں تعبیر کرتے ہیں:

''باری تعالیٰ محسوس تو ہیں نہیں، یعنی ان کا ادراک حواس سے تو ہوتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ حواس کے ذریعہ سے اس بنیاد پر ہم ان کو جان نہیں سکتے، رہی خیالی قوت تو اس کی گرفت میں وہی چیزیں آ سکتی ہیں جنہیں حواس عطا کرتے ہیں۔ اب خواہ وہ بجنسہٖ وہی صورت ہو جس کا حواس نے ادراک کیا

Marfat.com

تھا یا محسوسات کے بعض اجزاء کو دوسرے اجزاء کے ساتھ جوڑ کر فکر جو پیش کرتی ہے وہ ہو"۔

بالآخران تمام مباحث کا آخری نتیجہ پیدا کرتے ہیں:

"توحید کے مغز تک جو پہنچنا چاہتے ہیں، تو اسے ان آیتوں میں غور کرنا چاہیے جو کتاب عزیز میں وارد ہیں، یعنی حق تعالیٰ نے بذاتِ خود جو اپنی توحید بیان فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی ذات سے زیادہ خود اپنی ذات کا عالم اور کون ہو سکتا ہے تو چاہیے کہ تم ان باتوں میں غور کرو جنہیں خود خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور خدا سے دعا کرو کہ توحید کا صحیح علم تمہیں عطا کرے، ان شاء اللہ تم اس سے واقف ہو جاؤ گے، لیکن فکر کی راہ سے عقل ابدالآباد تک اس سے واقف نہیں ہو سکتی"۔(۳۵)

کسی جگہ فرماتے ہیں کہ عقل انسانی بہر حال اپنے علم میں حواس کی فقیری ہی پر جب مضطر ہے تو پھر:

"عجیب باتوں میں ایک بڑے اچنبھے کی بات میرے خیال میں یہ ہے کہ آدمی اپنی فکر اپنی نظر کی تو تقلید کرے، حالانکہ یہ قوتیں بھی اسی طرح نو پیدا اور حادث ہیں، جیسے آدمی کی دوسری قوتیں جو انسان میں خدا نے پیدا کی ہیں مگر اپنے رب کی تقلید آدمی نہیں کرنا چاہتا، یعنی خود اپنے متعلق حق تعالیٰ جو باتیں کتاب میں اپنے رسولوں کی زبان پر بیان کی ہیں ان کی تقلید نہیں کرتا"۔(۳۶)

اس قسم کی قرآنی آیتیں جن میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے اور شیخ کے زمانے کے اسلامی فلاسفہ (ج) ان ہی آیتوں سے استدلال کر کے لوگوں کو دین میں بھی حواس کی اس محتاج عقل کا دست نگر بنا رہے تھے ان کو متنبہ کرتے ہوئے شیخ فرماتے ہیں:

Marfat.com

''خدا نے جو ارادہ کیا تھا، عقل نے اسے الٹا سمجھا۔ یعنی تم کیوں نہیں سوچتے یا ''سوچنے'' والوں کے لیے یہ بات ہے''۔

قرآن کی ان آیتوں سے سمجھ لیا گیا کہ عقل ہی پر ٹیک لگا لیا جائے اور اس کو پیشوا بنا کر اس کی تقلید کی جائے، اور اس سے غفلت برتی گئی کہ فکر کا حکم جو دیا گیا ہے، اس سے خدا کا مقصد تو یہ ہے کہ اللہ کے علم اور اس کے جاننے کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بذاتِ خود حق تعالیٰ ہی اس کو بتائیں، اسی راہ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کی اصل حقیقت جیسا کہ وہ ہے کیا ہے، بجز اللہ کے خاص بندوں کے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی، یعنی انبیاء اور اولیاء کے سوا اور کوئی نہ سمجھا کہ تفکر و تدبر کا صحیح مطلب یہی ہے۔

بہر کیف علم کے متعلق تو شیخ کے چند نظریات میں سے ایک نظریہ یہ تھا، انہوں نے اسی کے ساتھ انسان کی علمی قوتوں کے دوسرے آثار و لوازم بھی بتائے ہیں، جن میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جو چیزیں اس کے پاس پیدا ہوتی ہیں اور جو کام کیے جاتے ہیں ان میں ایک ابعاثی مفعول بھی ہے جو عقل سے اسی طرح ابھرتی ہے، جیسے جبرئیلی حقیقت سے وحیہ صورت ابھرتی تھی'' (د)۔

اس مسئلہ کو ذرا زیادہ تفصیل کیساتھ واضح کرتے ہوئے فصوص میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اپنی خیالی قوت سے ہر آدمی اس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کا وجود خیال کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا، اور یہ تو خیر ایک عام بات ہے لیکن عارف اپنی ہمت سے ایسی چیز بھی پیدا کرتا ہے جو ہمت کے محل سے باہر ہو کر پائی جاتی ہے لیکن وہ یعنی عارف کی ہمت سے پیدا شدہ شے اسی وقت تک باقی رہتی ہے

Marfat.com

جب تک عارف کی ہمت اس کی حفاظت کرتی رہے اور ہمت سے پیدا کی ہوئی اس چیز کی حفاظت عارف پر کوئی بار بھی نہیں ڈالتی البتہ جب عارف پر غفلت طاری ہو جاتی ہے، یعنی جس چیز کو اس نے پیدا کیا تھا اس کی حفاظت سے وہ غافل ہو جاتا ہے تو اسی وقت (ہمت سے یہ پیدا شدہ شئے) معدوم ہو جاتی ہے''۔(۳۷)

اور اسی سے تخلیق عالم کے مسئلہ کو انہوں نے حل کیا ہے، گویا عالم کی آفرینش کیسے ہوئی؟ اس سوال کا جواب مخلوقات کی اسی تخلیق ابتعاثی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حواس سے جن معلومات کو آدمی حاصل کر لیتا ہے اور ان کی صورتوں کو جب چاہتا ہے توجہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے اپنے آگے حاضر پاتا ہے۔ یہ انسان کی قوت مصورہ ہی کی کاریگری ہے۔ عام ارباب فلسفہ کا یہ خیال کہ اشیاء کی صورتیں آدمی کے دماغ میں چھپ جاتی ہیں اور التفات کے بعد وہی چھپی ہوئی صورتیں سامنے آ جاتی ہیں، شیخ کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اپنی معلومات کی صورتوں میں توجہ اور التفات کے بعد شیخ کا خیال ہے کہ عالم تجلی کرتا رہتا ہے، فرماتے ہیں:

''اگر ہماری نگاہوں سے پردہ ہٹا دیا جائے اور قوتِ مصورہ جن صورتوں کو پیدا کرتی رہتی ہے ہم انہیں دیکھنے لگیں۔ یعنی خیال میں قوتِ خیالی جن صورتوں کو پیدا کرتی رہتی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو دیکھنے لگیں تو ہم پائیں گے کہ آدمی ہی ان مختلف صورتوں میں لمحہ بہ لمحہ تجلی کرتا رہتا ہے۔ یعنی ان صورتوں میں جن میں کوئی صورت دوسری صورت سے ملتی جلتی نہیں ہے (مثلاً ابھی درخت کی شکل میں ابھی سمندر کی شکل میں ابھی کلکتہ کی صورت میں تو اسی کے بعد بمبئی کی شکل میں، یعنی ان تمام شکلوں میں جنہیں

Marfat.com

آدمی سوچتا رہتا ہے)"۔

علم اور معلوم کا تعلق

علم ہی کے متعلق ایک اور پہلو پر شیخ نے اپنی کتابوں میں بکثرت اصرار فرمایا ہے۔ مثلاً اسی مسئلہ کو بیان فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"علم ایک ایسی نسبت ہے، جو ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتی ہے، معلوم تو تم اور تمہارے احوال ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ معلومات پر علم کا اثر نہیں پڑتا، بلکہ معلومات ہی کا اثر علم پر پڑتا ہے، معلومات اپنی ذات سے علم میں اسی اثر کو قائم کرتی ہیں جو واقعی ان معلومات کے آثار ہیں"

اسی مسئلہ کو مثال سے سمجھاتے ہیں:

"تم مثلاً کسی ایسی بات کو جو ناممکن ہے، جانتے ہو یعنی یہ جانتے ہو کہ وہ محال اور ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ تمہارے علم کا اس کے محال ہونے پر کوئی اثر نہیں۔ بلکہ خود اسی ناممکن امر نے تم میں علم عطا کیا ہے کہ وہ ناممکن ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم کا اثر معلوم پر نہیں پڑتا۔

مسئلہ علم اور تقدیر

اور علم کی اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے تقدیر کی گتھی کو سلجھانا چاہا ہے، فرماتے ہیں:

"بہر حال خود تمہارا ہی حکم ہے جو تم پر عائد ہوا ہے، اس لیے تعریف بھی اگر کرو تو خود اپنی کرو، اور مذمت بھی کرو تو اپنی کرو"۔ (۳۸)

بات ارادہ اختصار کے باوجود کافی طویل ہو گئی اب اس بحث کو جو الٰہیاتی مباحث و مسائل میں سب سے زیادہ پیچیدہ عقدہ ہے ان ہی چند اشارات کے تذکرہ پر ختم کر کے اپنے اس مقالہ کو بھی ختم کرتا ہوں۔

Marfat.com

''اگر در خانہ کس است ہمیں یک حرفے بس است''

جیسا کہ میں نے کسی دوسری جگہ بھی اشارہ کیا ہے ان مسائل کا زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ مقصود ہو تو خاکسار کی کتاب الدین القیم (حصہ اولیٰ) کا مطالعہ کیا جائے۔

واللہ یقول الحق و ھو یھدی السبیل

حواشی

الف۔ انڈین اوری اٹل کانفرنس کا سالانہ اجلاس حیدرآباد ہی میں جامعہ عثمانیہ کی زیرنگرانی منعقد ہوا تھا۔ خاکسار نے بھی اس کانفرنس میں ایک مختصر مقالہ پڑھا تھا۔ اسی کا مسودہ پڑا ہوا تھا، آج خیال آیا کہ معارف میں بھیج دوں شاید کسی کے لیے سبذکر اور یحدث لہ ذکری کا کام دے۔

ب۔ شیخ کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جس کا تجربہ ہر شخص کو ہوتا ہے یعنی ایسی بہت سی چیزوں کو بہ ظاہر آدمی سوچتا اور خیال کرتا ہے جن کا وجود خیال سے باہر نہیں ہوتا۔ مثلاً پچاس ہاتھوں کا آدمی یا ایسا جانور جس کا سر ہاتھی کا پیٹ کسی بیل کا بلکہ انہی خیالی تصورات کی تصویر اور مورتی بھی لوگ بناتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی یہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کا انسانی خیال سے باہر وجود نہیں ہوتا، بادنی تامل واضح ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے فرضی خیالات بھی دراصل خارج سے حاصل شدہ معلومات ہی کی ترکیب وتحلیل سے بنتے ہیں۔ بجائے دو ہاتھوں کے آپ ان ہی ہاتھوں کو دس بیس فرض کر سکتے ہیں، یہ کام جس قوت کے سپرد ہے اس کا نام قوت مصورہ ہے۔

ج۔ میرا اشارہ خصوصیت کے ساتھ ابن رشد کی طرف ہے اپنی کتابوں میں ان آیتوں سے ناجائز نفع اس شخص نے جو کچھ اٹھایا ہے وہ اس کے کلام کے پڑھنے والوں پر مخفی نہیں فصل المقال ہی میں مسلسل اسی قسم کی قرآنی آیتوں کو پیش کرتا چلا گیا ہے۔ فتوحات میں شیخ نے ایک موقع پر ابن رشد سے اپنی تفصیلی ملاقات کا جو خصوصی خلوت میں اس کی خواہش پر ہوئی تھی، ذکر فرمایا ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ابن رشد اس زمانہ میں بڈھا ہو چکا تھا، اور میں جوان تھا، میرے والد سے اس نے خواہش کی کہ تمہارے لڑکے کی میں نے تعریف سنی ہے، مجھ سے بھی ملنے کیلئے بھیج دو۔ والد کے حکم سے میں ابن رشد کے پاس گیا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، شیخ نے اس مجلس کے آخری نتیجہ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے یعنی وجدتہ شیخا متحیرا (میں نے ابن رشد کو ایک متحیر آدمی پایا) (الفتوحات المکیۃ، ۶/۱۰۵، ابن عربی، محی الدین ابوبکر، مصر، مطبع میریہ، سن، ن) اس ملاقات کا تفصیلی تذکرہ ان شاء اللہ اپنی مستقل کتاب میں کروں گا۔

د۔ شیخ کا اشارہ جبرئیل علیہ السلام کے اس تمثل کی طرف ہے جو دحیہ کلبی صحابیؓ کی

Marfat.com

صورت میں فرمایا کرتے تھے، یعنی دحیہ کلبیؓ کی صورت معلومہ کی صورت میں جبرئیل تجلی کرتے تھے، پھر یونہی اپنے معلومات کی شکل میں اگر حق تعالیٰ نے تجلی فرما کر عالم کے موجودہ نظام کو ظاہر اور پیدا فرمایا ہے تو اس میں کیا دشواری پیش آتی ہے۔ آخر دحیہ کی صورت میں جبرئیل جب تجلی کرتے تھے، متمثل ہوتے تھے تو ظاہر ہے کہ نہ جبرئیل ہی دحیہ کلبی بن جاتے تھے، نہ دحیہ جبرئیل۔ پس اپنے معلومات کی صورتوں میں حق تعالیٰ کو تجلی کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا عالم بن گیا اور نہ یہ کہ عالم خدا بن گیا (ان مسائل کی تفصیل کے لیے میری کتاب (الدین القیم) کا مطالعہ کرنا چاہیے، جو حال ہی میں ادارۂ الفرقان بریلی سے شائع ہوئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مقالۃ الشیخ الاکبر وطریقتہ، مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد، دکن، (تلاش بسیار کے بعد بھی مقالہ میسر نہیں آیا)

۲۔ الفتوحات المکیہ، ۵۳۹/۴، ابن عربی، محی الدین ابوبکر، مصر مطبع میریہ، س، ن

۳۔ ایضاً ۴۔ الفتوحات المکیہ (خاتمۃ الکتاب)، ۵۸۴/۴

۵۔ محولہ بالا

۶۔ مواقف، ص ۶۶۶ (عبدالقادر الجزائری کی یہ کتاب میسر نہیں آئی، از محقق)

۷۔ محولہ بالا

۸۔ الفتوحات المکیہ ۷۱۸/۴، مطبوعہ مصر، بولاق، س، ن

۹۔ الفتوحات المکیہ، ۵۳۳/۴، مطبوعہ میریہ،

۱۰۔ الفتوحات المکیہ، ۵۵۵/۴

۱۱۔ ایضاً، ۵۴۰/۴ ۱۲۔ الفتوحات المکیہ، ۹۱/۳، مطبوعہ بولاق

۱۳۔ محولہ بالا ۱۴۔ محولہ بالا

۱۵۔ الفتوحات المکیہ، ۵۴۷/۴، مطبوعہ میریہ

۱۶۔ ایضاً، ۵۴۸/۴۔۵۴۷

Marfat.com

۱۷۔ ایضاً، ۱۰۶/۴

۱۸۔ الفتوحات المکیہ، ۱۰۶/۴

۱۹۔ الفتوحات المکیہ، ۲۹۵/۲

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ الفتوحات المکیہ، ۳۷۷/۱

۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ محولہ بالا

۲۵۔ محولہ بالا

۲۶۔ محولہ بالا

۲۷۔ محولہ بالا

۲۸۔ الفتوحات المکیہ، ۲۵۵/۳

۲۹۔ محولہ بالا

۳۰۔ محولہ بالا

۳۱۔ محولہ بالا

۳۲۔ محولہ بالا

۳۳۔ فصوص الحکم، ص ۱۲۵، ابن عربی، محی الدین ابوبکر، مصر، دار احیاء الکتب العربیۃ، ۱۳۵۶ھ

۳۴۔ فصوص الحکم، ص ۱۲۶

۳۵۔ محولہ بالا

۳۶۔ الفتوحات المکیہ، ۳۷۶/۱، مطبوعہ میریہ

۳۷۔ فصوص الحکم، ص ۸۹۔۸۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۶۰

Marfat.com

علامہ سید مرتضٰی زبیدی

بلگرام (الف) کا ایک یمنی محدث مصری صوفی

اور

اس کی ایک کتاب

دستور ہے کہ تعارف وبصیرت کے لیے عموماً کتابوں کی ابتداء میں اس کے مؤلف کا حال اوراس کی کتاب کے اہم خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔اس مقدمہ کے درج کرنے کی معمولی وجہ تو یہی ہے لیکن اسی کے ساتھ مجھے مسلمانانِ ہند کے سامنے ان کے ایک ہم وطن، فاضل جلیل کا تذکرہ پیش کرنا ہے، جسے سب جانتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس حیثیت سے جاننا چاہیے ہندوستان کے مسلمان اس نقطۂ نظر سے بہت کم جانتے ہیں۔نواب صدیق حسن خان مرحوم نے ابجد العلوم میں مؤلف کتاب کے تذکرہ کو درج کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:

''میں نے اس بزرگ کے حالات میں ذرا بسط سے اس لیے کام لیا ہے کہ نہ صرف عوام الناس بلکہ اہلِ علم بھی اس شخص کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں''۔(۱)

حالانکہ ہندوستان کا یہ وہی فرد وحید ہے جس کے متعلق جدید طبقہ کے ایک ممتاز رکن مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو صدر کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد نے حسب ذیل الفاظ مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھے ہیں:

''علماءِ ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی، جب

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں جنوری وجون، ۱۹۲۷ء کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

تک اس میں علامہ سید مرتضٰی صاحب تاج العروس کا ترجمہ نہ ہو''۔(۲)

مولوی صاحب نے اس کے بعد وعدہ کیا ہے کہ کتاب کے آخر میں ان کے حالات کا اضافہ کیا جائے گا لیکن اس وقت تک مآثر الکرام کے جتنے نسخے میری نظر سے گذرے، کسی میں یہ اضافہ نہ پایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے ایفاء وعدہ کا موقع نہ مل سکا۔ واللہ اعلم

بدقسمتی تو دیکھو! کہ خود مآثر الکرام میں سید علامہ کا جہاں تذکرہ ہے، کاتب اور مصحح کی مہربانی سے وہاں نام غلط درج ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد کی کامل کتاب مولوی عبدالحق صاحب کو ناقص نظر آئی۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ سید مرتضٰی آزاد بلگرامی، مؤلف مآثر الکرام کے زمانہ میں نوعمر تھے۔ اس لیے آزاد نے آپ کا کوئی مستقل ذکر تو نہیں کیا ہے لیکن آپ کے جدامجد، سید قادری کے حالات میں انہوں نے اتنا لکھا تھا کہ

''واز ابنائے او سید مرتضٰی بن سید محمد بن سید قادری مسطور کتب عربی تحصیل کردہ دور حداثت بن توفیق زیارتِ حرمین شریفین یافتہ، دور ۱۱۶۴ھ باین سعادت فائز گشتہ، و در اماکن متبرکہ علم حدیث تحصیل نمود، درین ایام در زبید یمن اقامت دارد، ونزد شیخ عبدالخالق زبیدی فن حدیث سند می کند، حق تعالٰی اورا عمر بہ افزاید، وترقیات ذہنی کرامت نمائد''۔(۳)

کاتب نے بجائے ''مرتضٰی'' کے ''مقتدیٰ'' لکھ دیا، اور صرف اس ایک غلطی نے ہماری نگاہوں سے اس یگانہء عصر فاضل کو چھپا لیا۔ ورنہ آزاد مرحوم نے اپنے مختصر و مفید جملوں میں ان کے متعلق سب کچھ لکھ دیا تھا۔

بہر حال حق سبحانہٗ وتعالٰی کا شکر ہے کہ مصر کے اس ہندوستانی علامہ صوفی کے حالات قلم بند کرنے کی توفیق اس نے مجھے عنایت فرمائی۔ موقع و محل کے لحاظ

Marfat.com

سے اس وقت اختصار سے کام لیا جائے گا۔ لیکن اگر اعانت ایزدی نے مدد فرمائی تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی سید علامہ کا مفصل تذکرہ ان کے علوم وسوانح، خواطر وتفردات کو ایک مستقل تالیف کی شکل میں مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔

والامر بیدہ سبحانہ' وتعالیٰ

مؤلف کتاب کا نسب ووطن

کتاب نفحات قدسیہ فی الطریقہ العیدروسیہ جس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے مؤلف کا نام سید محمد مرتضیٰ اور کنیت ابو الفیض ہے۔ نسبی تعلق مشہور بلگرامی واسطی سادات (ب) سے ہے۔ شجرہ طیبہ مآثر الکرام سے آپ کا کامل نسب نامہ اس طرح مرتب ہوتا ہے۔

سید مرتضیٰ بن سید محمد بن سید قادری بن سید ضیاء اللہ بن سید خان محمد بن سید عبد الغفار بن سید تاج الدین بن سید دولارہ بن سید حسین بن سید محمد بن سید محمد بن سید بدہن بن سید جمال الدین بن سید ابراہیم بن سید ناصر بن سید سالار بن سید محمد صغریٰ ابن سید حسین بن سید ابو الفرح ثانی بن سید زید بن سید عمر بن سید حسن بن سید علی عراقی ابن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن محمد عیسیٰ موتم الاشال بن امام زید شہید بن امام ہمام سیدنا وسید المسلمین امام زین العابدین بن شہید کربلا امام حسین علیہ السلام بن اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب، وسیدۃ فاطمۃ الزہراء بضعۃ رحمۃ للعلمین امام المرسلین خاتم النبیین ﷺ۔

سید مرتضیٰ اگرچہ عام طور پر زبیدی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ لیکن آپ کی ولادت باسعادت شیراز دیار ہند کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام میں ہوئی۔ بلگرام کی اسلامی آبادی اس زمانہ میں دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصہ کو سید واڑہ اور دوسرے حصہ کو سیدان پورہ کہتے تھے۔

Marfat.com

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ کے آباء واجداد کا موروثی مکان سیدواڑہ میں تھا۔ لیکن سسرالی تعلقات کی وجہ سے آپ کے سلسلہ کے ایک بزرگ سید عبدالغفار نامی سیدان پورہ کے محلہ میں رہ پڑے اور اسی محلہ میں سید مرتضیٰ پیدا ہوئے۔ (۴)

ابتدائی تعلیم

تعلیم کا ابتدائی زمانہ بلگرام میں بسر ہوا۔ اگرچہ کوئی مستند تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ تاہم قرائن کا اقتضاء یہ ہے کہ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم سید علامہ نے بلگرام میں پائی۔ کیونکہ ابا عن جد یہ خاندان علم وفضل کی روشنی سے معمور تھا۔ آپ کے جدامجد سید قادری کا تعلق اکابرِ سلف کے ان بلند ہمت نفوس سے تھا جن کو علم وعرفان کی تلاش نے ہر قسم کی وطنی خصوصیات و مالوفات سے بالکل آزاد کر دیا تھا۔ مآثر الکرام میں ہے کہ سید قادری نے علم طب میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب وعجم کی باضابطہ سیر کی۔ آخر میں حما (شام) کی خانقاہ قادریہ میں، لنگر ڈال دیا، اور سید یسین حموی سے جو اس زمانہ میں سجادہ نشین تھے، مرید ہوئے، اور طریقہ قادریہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر بغداد میں رہے، علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد دہلی پہنچے۔ بالآخر خلوت گزینی کا جذبہ آپ پر غالب آیا اور عمر کا بقیہ حصہ بلگرام کے گوشۂ عافیت میں ختم کیا۔ سادات بلگرام پر آپ کی جلالتِ شان کا جو اثر تھا اس کا ثبوت ان تاریخی شعروں سے ملتا ہے۔

رخل القادری سیدنا صاحب الکشف والکرامات

الھم بحق عام رحلته ان للمتقی لحسنات

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کو خود دیکھا تھا، آپ کا بیان ہے کہ سید قادری نہ صرف سیر وسلوک، تصوف وحقائق میں شیخ کامل تھے بلکہ فقہ وحدیث وتفسیر

Marfat.com

میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔قرآن مجید کے حافظ تھے، تجوید وقرأت کے ماہر تھے۔مشہور ہندوستانی فاضل ملا جیون ان کے ہندوستانی استاد تھے، اور بیرون ہند میں ان کے سب سے بڑے استاد مولانا سلطان بن ناصر بن احمد خاپوری تھے، صحاح ستہ اور تجوید کی سند انہیں سے حاصل کی تھی۔(۵)

تعلیمی سفر

غالباً سید قادری کی یہی علمی الوالعزمیاں تھیں جوان کے پوتے کی طلب علم میں مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ دادا کا نقش قدم سامنے تھا۔سید مرتضٰی نے بھی وطن کو خیر باد کہا اور شروع شروع میں وہ الہٰ آباد پہنچے۔ یہاں اس وقت ملا فاخر الہٰ آبادی المتخلص بہ زائر کی درس وتدریس کا طوطی بول رہا تھا۔ کچھ ان سے پڑھتے رہے پھر دہلی پہنچے، دِلّی اس زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی دِلّی تھی۔حکیم الہند کے درس میں تحقیق کا دریا موجیں مار رہا تھا۔سید مرتضٰی زانوئے تلمذتہ کر کے بیٹھ گئے۔اپنی ایک یادداشت میں نہایت جوش ومسرت کے ساتھ شاہ ولی اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے۔صحیح طور پر اگر چہ یہ معلوم نہیں ہے کہ دہلی کی علمی حلقہ میں سید علامہ کب تک رہے۔تاہم ان کی تالیفات میں جو تحقیق و جامعیت کا رنگ پایا جاتا ہے اس میں ''ولی اللہی'' مذاق کو بہت کچھ دخل ہے۔

سفر حج

ابھی عنفوان شباب تھا کہ حج کا شوق مستولی ہوا اور نوعمری میں حجاز روانہ ہو گئے۔میر غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

''درحداثت سن توفیق زیارت حرمین شریفین یافتہ''۔(۶)

ایک سید جب عرب پہنچتا ہے تو اس کو اپنا آبائی وطن یاد آجاتا ہے۔اگر چہ وہ عارضی وطن کی آسانیاں اسے پھر اسے اپنے ملک میں واپس لے آتی ہیں۔مگر سید

Marfat.com

مرتضیٰ جب اپنے حقیقی وطن میں پہنچ گئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو گویا بالکل بھول گئے، اور کچھ اس طرح بھولے کہ پھر اس دیس کی طرف کبھی رخ نہیں کیا۔ عموماً غریب ہندوستان کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ گویا اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

سفر زبید

اسلامی علوم میں سے سید مرتضیٰ کا فطری میلان زیادہ تر حدیث اور ادب کی طرف تھا۔ ہندوستان میں اس وقت میرزاہد سلم مسلم کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ دہلوی خاندان اگرچہ حدیث وقرآن کا علم بردار تھا، تاہم ملک کا عام علمی ماحول معقولی تھا، جس سے غالباً سید مرتضیٰ کچھ خوش نہ تھے۔ جب عرب پہنچے تو یہاں معقولات سے زیادہ ان کو اپنے مذاق کی چیزیں نظر آئیں۔ حدیث، ادب، تفسیر کے بڑے بڑے ماہرین، عرب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں درس دے رہے تھے۔ پھر کیا تھا، علم کا متلاشی دھونی رما کر جم گیا۔ اگرچہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بجائے خود دارالعلوم تھے۔ لیکن سارے عرب میں یمن کو علمی حیثیت سے امتیاز حاصل تھا، اور اب بھی ہے۔ یمن کا مشہور تعلیمی شہر، زبید تھا اور سنا جاتا ہے کہ اب بھی ہے۔ سید مرتضیٰ زبید کی شہرت سن کر اسی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ زبید کے مشاہیر اربابِ درس میں، اس وقت علامہ عبدالخالق بن زین مزاجی بھی تھے۔ جنہوں نے ہندوستان کے مختلف علماء ومشائخ سے پڑھا اور فائدہ اٹھایا، جن میں علامہ حیات سندی، شیخ عبدالکریم ہندی، شیخ امراللہ ہندی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ عبدالخالق پر ہندوستان کا خاص حق تھا۔ بلگرام کا نوجوان طالب علم جب زبید پہنچا تو سب سے پہلے شیخ عبدالخالق ہی کے سایہ عاطفت میں اس کو جگہ ملی۔ جس کی خبر ہندوستان بھی پہنچی تھی، اور میر غلام علی نے مآثر میں اس کا

Marfat.com

تذکرہ بھی کیا ہے۔

آخر میں زبید کا مشہور علمی قدیم خاندان اہدلیہ ان پر مہربان ہوگیا۔ اس زمانہ میں اس خاندان کی درسی و افادی ریاست شیخ احمد بن محمد شریف مقبول اہدل (ج) پر ختم ہوتی تھی جو نہ صرف علومِ نقلیہ کے ماہر بصیر تھے بلکہ علوم عقلیہ مثلاً منطق، حساب ہیئت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ پیچیدہ مسائل کے حل میں ان کو خاص کمال تھا۔ تقریباً یہ کمال ان کو تمام علومِ متداولہ میں حاصل تھا۔ علامہ مرتضیٰ، شیخ عبد الخالق کے بعد انہیں کے فیوض سے مستفیض ہوتے رہے، اور زبید کی علمی دلچسپیوں میں کچھ ایسے منہمک ہوئے کہ گویا یہی ان کا وطن ہوگیا۔ تاج العروس کے خاتمہ نویس نے لکھا ہے:

"واقام بزبید مدة طویلة حتیٰ قیل له الزبیدی و اشتهر بذلک". (۷)

''ایک زمانہ دراز تک زبید میں رہے، یہاں تک کہ لوگوں نے زبیدی کہنا شروع کیا اور آج تک اسی نسبت سے مشہور ہیں''۔

اور خود ان پر بھی زبید کا بہت گہرا اثر تھا۔ مصر سے ایک دوست کے نام خط لکھتے ہیں اس میں جب زبید کا ذکر آیا تو قلم سے بے ساختہ یہ جملے نکل پڑے۔

''خدائے واحد منان سے یہ دعا ہے کہ کاش! مجھے پھر اس خطہ (زبید) میں پہنچا تا، تا کہ اپنے پرانے گذرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتا اور اس سرزمین سے انس حاصل کرتا''۔ (۸)

حج مکہ اور طریقہ قدسیہ عیدروسیہ میں بیعت

عموماً تاریخوں میں لکھا ہے کہ سید علامہ نے متعدد حج کیے ہیں۔ نہیں معلوم کہ یہ کس حج کا واقعہ ہے کہ یہ زبید سے مکہ مکرمہ بارادۂ حج آئے ہوئے تھے کہ خدا کے گھر میں، نبوت کے گھرانے کا ان کو ایک آفتاب مل گیا۔ یہی وہ روشنی تھی جس نے

Marfat.com

سید کی حقیقت میں انقلاب پیدا کر دیا، ان کے علم کو عرفان سے دانستن کو شناختن سے بدل دیا۔ یعنی عیدروسی طریقہ کے ایک "حبیب" سید عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ العیدروسی کی زیارت نصیب ہوئی۔ خدا جانے سید علامہ نے ان میں کیا دیکھا کہ بلگرام، الہٰ آباد، دہلی اور زبید کی گلیوں میں گھوم گھوم کر جو سرمایہ اتنی طویل مدت میں جمع کیا تھا، اس کو اس عیدروسی درویش کے قدموں پر نثار کر دیا، تاج العروس کے خاتمہ نگار نے لکھا ہے:

"واجتمع بالسید عبدالرحمن العیدروس بمکة المشرفة ولازمه ملازمة کلیة"۔(۹)

"مکہ مکرمہ میں سید عبدالرحمٰن عیدروس سے ان کی ملاقات ہوئی اور کلی طور پر پھر انہیں کے ہو رہے"

سید علامہ خود لکھتے ہیں:

"فانه ممن ربانی و بلبن تادیبه غذانی". (۱۰)

"انہوں نے میری پرورش فرمائی اور اپنی تادیب کے دودھ سے مجھ سیراب کیا"

سید عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ، عیدروس نے اگرچہ باطنی اور ظاہری کمالات کا اکتساب زیادہ تر اپنے والد مرحوم اور سید عبدالرحمٰن بافقیہ سے کیا تھا۔ تاہم ان کے زمرۂ اساتذہ میں چند ہندوستانی علماء بھی تھے۔ ابجد العلوم میں لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ حیات سندی، مولوی حیدر ہندی اور سید فضل اللہ بن احمد ہندی سے بھی پڑھا تھا۔(۱۱) ممکن ہے کہ اس ہندوستانی رابطہ نے سید عیدروسی کی خاص توجہ علامہ مرتضیٰ پر مبذول کرادی ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو، عیدروسیہ سلسلہ میں داخل ہو جانے کے بعد سید علامہ کا علمی ساز، روحانی سوز سے بدل گیا، آسمان کے نیچے یہ ایک عجیب تماشا تھا کہ ایک حافظ الحدیث مسند الوقت، محدث، ولغوی ایک درویش کے قدموں پر جھکا

Marfat.com

ہوا تھا، نہ اسے اپنے علم کا خیال تھا، نہ اپنے فضل کا لحاظ تھا۔ حیرت تو اس پر ہے کہ سید مرتضیٰ نے بایں ہمہ تبحر و وسعتِ نظر، سید عبدالرحمٰن عیدروس سے مختصر المعانی سبقاً سبقاً پڑھی، اور احیاء العلوم غزالی کا بھی ایک حصہ اپنے پیر ہی سے پڑھا، اسی درس سے احیاء العلوم کی اس عظیم الشان ضخیم شرح کی بنیاد پڑ گئی جو اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین کے نام سے مشہور ہے۔ مصر والوں نے اسے چھاپ دیا ہے اور ایک قیمتی ذخیرۂ معلومات کی حیثیت سے علمائے اسلام کے ہاتھوں میں ہے۔

سفرِ مصر

میں کہہ چکا ہوں کہ سید علامہ پر بیعت کے بعد دوسرا رنگ چڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اب ان کی ہر جنبش ان کا ہر سکون پیر کے اشارۂ چشم کے ساتھ وابستہ تھا۔ تاج العروس کے خاتمہ نگار کا بیان ہے کہ سید مرتضیٰ اپنے پیر کے حکم و ترغیب سے بجائے ہندوستان کے جو ان کا وطن تھا عرب سے سیدھے مصر کی طرف روانہ ہوئے، اور ۱۹ صفر ۱۱۹۷ھ میں قاہرہ پہنچے اور ایک زمانہ تک خان الصاغہ کی سرائے ان کی قیام گاہ تھی۔ (۱۲)

مصر کے مشاغل

درویش پیر نے اپنے محدث و لغوی مرید کو مصر کس لیے بھیجا تھا۔ اس کو کون جان سکتا ہے۔ لیکن سید مرتضیٰ نے اپنے اس قیام کو غنیمت خیال کیا۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے مجھ پر جو احسانات ہیں، ان میں ایک بڑا احسان یہ ہے کہ میں جب مصر پہنچا تو بیکار پڑا نہ رہا۔ بلکہ فرصت نکال کر میں یہاں بھی طلب علم میں منہمک اور اس کے رموز و اسرار کے حل میں مصروف ہو گیا''۔ (۱۳)

اطراف مصر کی سیاحت

سید مرتضی کو علم حدیث کی متعدد شاخوں میں سے مختلف النوعیت سند کے حصول کا بہت شوق تھا۔ زبید کے ایک عالم کے نام ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

''وہ دن جو گذر گئے، ان میں اس کا خاص شوق تھا کہ لوگ عالی سند کی تلاش میں دور دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے تھے۔ لیکن اب یہ ذوق معدوم ہو رہا ہے۔ وہ بساط ہی الٹ گئی، ہمتیں پست ہیں، بگڑی کے بنانے والے کوتاہیوں کے دور کرنے والے وہ بزرگانِ دین کہاں ہیں، جن پر ملت کو فخر تھا''۔ (۱۴)

پھر اپنے متعلق ایک خاص مسرت و نشاط کے ساتھ لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کی اس صنف کا ذوق ان پر کس قدر غالب تھا، ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''لیکن ان گذشتہ بزرگوں کے آثار کا کچھ حصہ اب بھی باقی ہے، دنیا کے گوشوں میں وہ چیزیں اب بھی کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں اور یہ بندہ الحمدللہ ان لوگوں میں ہے، جس نے علم حدیث اور علم اسناد کے اساتذہ کی خدمت میں بہت کچھ تگ و دو کی ہے اور ان سے حاصل کر کے اب اس نے اپنے علمی صحن میں اپنا دستر خوان بچھایا ہے''۔ (۱۵)

سند عالی تلاش کیوں کی جاتی ہے، اس کی وجہ انہوں نے اسی کتاب میں یہ بیان کی ہے:

''حدیث کی سندوں میں سند عالی معتبر ہوتی ہے۔ یعنی جس میں وسایط کم ہوں اور یہ قاعدہ ہے کہ جہاں تک وسایط کم ہوں گے جھوٹ کا احتمال کم ہوتا جاتا ہے، اور جہاں تک واسطے زیادہ ہوں گے کذب کا احتمال قوی ہوتا جاتا ہے''۔ (۱۶)

Marfat.com

بہر حال قیامِ مصر کے زمانے میں ان کا ابتدائی مشغلہ یہی تھا کہ مشائخ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے پاس جو سند ہوتی اس کو حاصل کرتے۔ علمائے مصر میں ان کو ایک ایسا محدث ملا جس کی سند دیگر معاصرین کے لحاظ سے بہت عالی تھی، ایک خط میں خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''ولم ینبه لعلو سندہٖ الا القلیل لا شتغا لھم باحوالھم''(۱۷)

''لیکن اس محدث کی اونچی سند پر بہت کم لوگوں کو تنبیہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً لوگ اپنے ذاتی معاملات میں منہمک ہیں''۔

اسی ذوق میں انہوں نے قاہرہ سے بھی باہر قدم نکالا اور مختلف اضلاع و بلاد میں گھومتے رہے۔ ایک یادداشت میں ان مقامات کی تفصیل بھی لکھی ہے، جہاں جہاں سند کی تلاش میں یہ پہنچے، ان میں سے، اسبوط، جرجان، فرشوط، دمیاط، محلّہ، سمنود، بوصیر ومہتور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔(۱۸)

فلسطین کا سفر

سب کچھ مل رہا تھا لیکن علم کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی تھی۔ آخر اسی سلسلہ میں (نیز بہ نیت زیارت) بیت المقدس کا بھی سفر کیا۔ ایک خط میں خود لکھتے ہیں:

''میں نے بیت المقدس کا بھی سفر کیا اور وہاں کے ارباب اسناد کی خدمت میں حاضر ہوا، بیت المقدس سے رملہ بھی اسی دھن میں پہنچا اور ہر جگہ میں نے حدیث کی سماعت کر کے سند حاصل کی''۔(۱۹)

تحصیل اجازات

محدثین کا دستور تھا کہ اگر کسی استاد کے پاس خود نہیں پہنچ سکتے تھے تو خط و کتابت کے ذریعہ سے اجازت نامے منگوایا کرتے تھے۔ سید علامہ نے یہ بھی کیا،

Marfat.com

خود لکھتے ہیں:

''مجھے حلب، فاس، تونس، سولا، تلمسان کے محدثین نے بھی اجازت نامے لکھ کر بھیجے، ماسوا اس کے مصر میں بھی مغرب اقصیٰ کے چند صاحب اسناد محدثین کی ملاقات سے شرف اندوز ہوا، اور اجازت حاصل کی''۔(۲۰)

مصر کا مستقل قیام اور نکاح

جس نے کسب کمال میں اتنی جان فرسا محنت کی ہو، اس کی علمی وسعت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ سید علامہ میں اس کے بعد جس قسم کی جامعیت پیدا ہوگئی تھی، وہ اپنے زمانہ میں اپنی آپ نظیر تھی۔ وہ ادیب تھے، مفسر تھے، محدث تھے، لغوی تھے، منطقی تھے، فلسفی تھے، آپ کو فقہ اربعہ کی اجازت حاصل تھی، اور ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسی عرصہ میں ایک شیخ کامل کی نظر توجہ ان کو نصیب ہوئی، جس نے ان کے سارے علمی کمالات کو مرکز انابت پر گردش دے دیا تھا۔ نہ صرف علوم بلکہ اس سیر و سیاحت میں ان کو مختلف اسلامی زبانوں پر بھی عبور حاصل ہوگیا تھا۔ خصوصاً فارسی، ترکی، نہایت آسانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے، اور عربی تو ان کی گویا مادری زبان ہوگئی تھی۔ اگرچہ تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن بارھویں صدی ہجری کے ہندوستانی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اردو نہ جانتے تھے بالکل بعید از عقل ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ چینی اور پشتو کے سوا دنیائے اسلام کی ہر ایک زبان سے وہ واقف تھے اور اس مختلف زباندانی نے آئندہ زندگی میں ان کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔

بہرحال اب سید علامہ نے کسی خاص مقام پر جم کر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ پیر کا حکم مصر میں رہنے کا تھا۔ پھر مصر کے سوا کہاں جاتے۔ محلہ عطفۃ الغسال میں آپ نے ایک مستقل مکان لیا اور دمیاط کے ایک بزرگ ذوالفقار دمیاطی جو غالباً

ان کے عقیدت مند تھے، ان کی دختر نیک اختر سے جن کا نام زبیدہ تھا، آپ نے نکاح کرلیا اور تالیف وتصنیف کو اپنا خاص موزوں شغل قرار دیا۔

تاج العروس کی تالیف

قاموس فن لغت میں گویا متن متین ہے کیونکہ فیروز آبادی نے نہایت مختصر لفظوں میں زیادہ مطالب کے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ سید علامہ کی غالباً سب سے پہلی نگاہ انتخاب اس پر پڑی اور کامل چودہ سال گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر آپ نے اس ٹھوس اور جامع کتاب کی ایک ضخیم شرح نو جلدوں میں لکھی، اور تقریباً ہر جلد کے صفحات پانچ سو صفحات سے کم نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کتاب کا طول وعرض بہت غیر معمولی ہے۔ اگر چھوٹی تقطیع پر شائع کی جائے تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس کی ضخامت بجائے ۹ جلدوں کے اٹھارہ جلدوں تک پہنچ جائے گی۔

تاج العروس کی ختم کی تقریب

سید علامہ چودہ سال تک نہایت خاموشی کے ساتھ اس مہم کے سر کرنے میں مسلسل مصروف رہے، جب کام ختم ہوگیا تو آپ نے قدیم دستور کے مطابق مصر کے تمام اعیان واشراف کی دھوم دھام سے ایک دعوت کی، جس میں علماء، صلحاء، مشائخ، الغرض ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے۔ دعوت کے بعد آپ نے سب کو ایک مجلس میں جمع کیا اور اپنی محنت ان کے سامنے پیش کی۔ لوگ انگشت بدنداں تھے۔ حیرت تھی کہ ہندوستان کے غریب الوطن مسافر نے یہ کیا کیا اور بالاتفاق سبھوں نے ان کی جلالت قدر کا اعتراف کیا۔ مصر کے مسلم الثبوت اساتذہ وسربرآوردہ علماء نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس پر اپنی تقریظیں ثبت کیں۔ ان میں اپنے زمانہ کے شیخ الکل شیخ علی صعیدی، شیخ احمد دردیر، شیخ ابوالانوار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

Marfat.com

تاج العروس کی شہرت عامہ اور اس کی شاہانہ قدر و منزلت

مصر میں جس وقت اس کتاب کا غلغلہ بلند ہوا تو اطراف و جوانب سے جوق در جوق لوگ اس ندرت انگیز حیرت خیز چیز کے دیکھنے کے لیے امنڈ پڑے۔ رفتہ رفتہ اس کی جلالتِ شان، علوِ مرتبت کا شہرہ دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچا۔ قسطنطنیہ سے خلیفۃ المسلمین کا فرمان آیا کہ اس کا ایک نسخہ سلطانی کتب خانہ کے لیے فوراً بھیجا جائے۔ مراکش کے سلطان نے بھی اس کا ایک نسخہ طلب کیا۔ دارفور کے امیر نے بھی ایک نسخہ اپنے لیے لکھوایا۔ حالانکہ اگر بکفایت بھی لکھوایا جاتا تو ہر نسخہ کی لکھائی پر کم از کم ایک ہزار ریال خرچ ہوتا تھا۔ اس سے مسلمانوں کے علمی ذوق اور اسلامی امراء کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کل کی بات ہے لیکن زمانہ کی اس نیرنگی کا کچھ ٹھکانہ ہے کہ آج اگر کسی اسلامی کتاب کی قیمت بدقسمتی سے دس یا بیس تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے مصنفین صرف کیڑوں اور دیمک کے نگران کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

شغل درس حدیث

تاج العروس نے مصریوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اب انہوں نے پہچانا کہ ان میں کس گھرانے کا کس ملک کا کون آدمی ہے نہ صرف عوام الناس بلکہ ممتاز افاضل مصر بھی سید علامہ کی خدمت میں عقیدت کے ساتھ آنے لگے۔ جیسا کہ مین لکھ چکا ہوں، سید ممدوح کو اسناد و اجازات کا ذاتی شوق تھا۔ آنے جانے والوں پر بھی یہ ذوق غالب ہوا اور انہوں نے سید سے سند کا مطالبہ شروع کیا۔ حتی کہ آخر میں مصر بلکہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے علمی مرکز میں بھی جنبش ہوئی اور ازہر کے شیوخ و اساتذہ بھی حصول سند کی غرض سے آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ جب تک میرے سامنے حدیث سنی یا سنائی نہ جائے گی، سند

Marfat.com

نہیں دے سکتا۔ آخر یہ طے ہوا کہ شیخوں کی جامع مسجد میں جو صلیبیہ میں ہے، ہر پیر اور جمعرات کو سید علامہ حدیث کا درس دیں گے حلقہ میں جو شریک ہوں گے ان کو سند دی جائے گی اور اسی کے بعد تالیف کے سوا تدریس کا بھی سلسلہ جاری ہوا۔

سید علامہ اس زمانہ میں محلہ اعطفہ الغسال سے سویقۃ اللالاء منتقل ہو گئے تھے، یہیں سے آپ شیخون کی جامع مسجد میں جاتے اور درس دیتے۔

آغاز درس

- سب سے پہلی کتاب جو سید علامہ نے شروع کرائی وہ صحیح بخاری تھی، سید حسن شیخونی قاری تھے اور دوسرے حضرات سنتے تھے، دنیا یہ سن کر تعجب کرے گی، اس درس میں جامع ازہر کے مشہور اساتذہ و معلمین بھی ہوتے تھے، جن میں شیخ احمد سجاعی اور شیخ مصطفیٰ طائی بہت زیادہ ممتاز تھے۔

طریقِ درس

مصر میں بھی اس زمانہ میں درسِ حدیث کا وہی عام طریقہ تھا، جو اس وقت ہندوستان میں مروج ہے یعنی شاگرد کتاب پڑھتا جاتا ہے اور استاد سنتا رہتا ہے، جہاں پر کوئی چیز قابل ذکر ہوتی ہے اسے بتا دیتا ہے لیکن سلف کا طریقہ درس یہ نہ تھا وہ املاء کراتے تھے۔ یعنی استاد متن و سند کے ساتھ حدیث کو زبانی بیان کرتا تھا اور پھر مختلف اعتبارات سے اس پر بحث کرتا تھا، سید علامہ نے عام طریقہ کے سوا املاء کی رسم کہن کو پھر زندہ کیا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں معمولی درس کے بعد، قدیم حفاظ کی طرح املاء بھی کراتا ہوں، جس میں متن کے ساتھ سند بھی بیان کرتا ہوں اور مطالب و معانی سے بیچ بیچ میں بحث کرتا جاتا ہوں، طلبہ میری ان تقریروں کو قلم بند کرتے ہیں جو اس وقت متعدد جلدوں کی شکل میں مرتب ہو چکی ہیں''۔(۲۱)

Marfat.com

بسط و تفصیل کی نوعیت

سید علامہ اپنے اس املائی درس میں کئی تفصیل و توضیح سے کام لیتے تھے۔ اس کا اندازہ محض اس سے ہوسکتا ہے کہ ام زرع کی مشہور حدیث جو غالباً بائیس سطروں سے زیادہ نہیں ہے، اس کے متعلق اپنے جن مضامین کا املاء کرایا صرف اس کی ضخامت سات جز تک پہنچ گئی۔ اسی خط میں لکھتے ہیں:

''ام زرع کی حدیث پر میں نے سات جزوں میں املاء کرایا ہے اس حدیث کی شرح چودہ مجلسوں میں ختم ہوئی۔ طلبہ اس کی نقلیں لے رہے ہیں اور مختلف ممالک میں پھیلا رہے ہیں''۔(۲۲)

مصریوں پر آپ کا اثر

یوں تو جب سے تاج العروس شائع ہوئی تھی، آپ کے فضل و جلالت کا پرچم مصر میں لہرا رہا تھا لیکن حدیث شریف کے اس انوکھے طریقہ درس نے آپ کی شان و عظمت کو دوبالا کر دیا اور عام سے لے کر خواص ہر ایک آپ کا ثناء خواں اور عقیدت مند تھا۔ امراء اور اعیانِ دولت جوشِ عقیدت میں آ کر آپ کو اپنی محل سراؤں میں بلاتے اور اس تقریب سے عظیم الشان دعوتیں کرتے۔

مجلس دعوت

سید علامہ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی امیر کے یہاں سے دعوت آتی تو اپنے طلبہ کاتب، نیز دیگر متوسلین کو لے کر اس کے مکان پر پہنچتے۔ داعی اپنے مکان کو ہر قسم کی آرائشوں سے سجاتا۔ گھر کے لوگ نئے کپڑے پہنتے، مردوں کا مجمع سامنے ہوتا، عورتیں اور بچیاں پردے کے پیچھے ہوتیں، عود، بخور اور ہر قسم کی خوشبو دار چیزیں جلائی جاتیں۔ اس کے بعد سید، بخاری، دارمی یا کسی دوسری کتاب کی چند حدیثیں

سند کے ساتھ سناتے پھر سب مل کر درود شریف پڑھتے اس کے بعد کاتب اٹھتا اور تمام حاضرین خواہ مرد ہوں یا عورت بلکہ بچوں کے بھی نام لکھتا، پھر اس پر تاریخ و وقت درج کر کے سید علامہ کی خدمت میں لاتا۔ سید اس پر ''صح ذلک'' لکھ دیتے اور یہ محدثین کا قدیم دستور تھا۔

بیرون مصر میں آپ کا آوازہ

میں کہہ چکا ہوں کہ تاج العروس کی شہرت اسلامی دنیا کے سلاطین تک پہنچ چکی تھی۔ اب اسی کے ساتھ سید علامہ کے درس حدیث کی خوشبو مصر کی دیواروں کو پھاند کر غیر ممالک میں پہنچی۔ اکثر اقطار و امصار سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور جو نہیں آ سکتے تھے وہ تحریر کے ذریعہ سے سند اور اجازت نامے منگوایا کرتے تھے۔ سید علامہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس وقت تک میں نے غزہ، (شام) دمشق، حلب، عین تاب (موصل) آذربیجان (ایران) تونس، الجزائر، دیاربکر، مدراس (ہندوستان) میں اپنی سند اور اجازت نامے بھیجے''۔ (۲۳)

تاج العروس کے خاتمہ نگار کا بیان ہے کہ صرف انہیں ممالک سے نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے روزمرہ آپ کے پاس درخواستیں پیش ہوتی تھیں اور عوام ہی نہیں بلکہ ان ممالک کے امراء و سلاطین بھی خطوط لکھتے اور نہایت نیازمندی کے ساتھ اجازت نامے یا سند طلب کرتے۔ خاتمہ نگار نے اس سند میں لکھا ہے کہ یمن، شام، ہندوستان، بصرہ، عراق، مراکش، سوڈان، قزان، الجزائر، الغرض ہر طرف سے شدید تقاضے آتے رہتے تھے۔ (۲۴)

خلیفۃ المسلمین کی درخواست

آخر میں قسطنطنیہ سے خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید اول نے آپ کو

قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی اور آپ نے منظور بھی فرمالیا تھا لیکن پھر خدا جانے کیا موانع پیش آئے کہ نہ جاسکے۔ سلطان نے اس کے بعد یہ درخواست پیش کی کہ تو پھر وہیں سے مجھے اپنی سندوں اور حدیث کی کتابوں کی اجازت لکھ بھیجئے۔ سید علامہ نے اپنے ہاتھ سے اجازت نامہ لکھ کر بارگاہ سلطانی میں بھیجا۔ سلطان کے ساتھ ترکی کے مشہور فاضل خبیر، صدر اعظم علامہ راغب پاشا نے بھی آپ سے سند اور اجازت نامہ حاصل کیا، اور دنیاوی حیثیت سے ایک مسلمان عالم کا یہ آخری نقطہ عروج تھا جو ایک غریب الوطن ہندوستانی عالم کو دوسرے ملک میں حاصل ہوا۔ (۲۵)

﴿قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء﴾ (۲۶)

اوراد و وظائف کی اجازت

مصر میں سید علامہ کا قیام اپنے پیر کے حکم سے تھا، وہاں حدیث تفسیر یا جس چیز کا درس دیتے تھے، سب میں بجائے درس کے تلقین و ذکر کی شان زیادہ غالب تھی۔ اپنے درس میں خلافیات و جدلیات سے زیادہ حقائق و معارف فضائل اعمال کی حدیثوں پر زور دیتے تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے شیخ سے جن اذکار اور اوراد کی آپ کو اجازت تھی، طالبین کی اس طرف بھی رہنمائی فرماتے تھے، تاج العروس کا خاتمہ نگار لکھتا ہے:

"ویجیز ھم باوراد واحزاب". (۲۷)

"اور لوگوں کو وہ اوراد و وظائف کی بھی اجازت دیتے تھے"

سید علامہ کا حلیہ و سیرت

تاج العروس کے خاتمہ نگار نے آپ کی شکل و صورت کی پوری توضیح کی ہے اور میں اسی سے نقل کرتا ہوں۔ اس کا بیان ہے، سید مرتضیٰ میانہ قد، چھریرے

Marfat.com

بدن کے تھے رنگ سنہرا تھا، اعضاء متناسب تھے، داڑھی بہت معتدل تھی لیکن اکثر حصہ سفید ہو چکا تھا، ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے، چہرہ پر ایک دائمی بشاشت رہتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ نہایت باوقار اور بھاری بھرکم تھے، ان کی مجلس بارعب اور پُر ہیبت ہوتی تھی۔ اخلاق نہایت پاکیزہ اور لطیف تھے، گفتگو نہایت دلچسپ پرمغز، نوادر ولطائف سے معمور ہوتی تھی، حافظہ نہایت قوی تھا۔ نہایت سمجھ دار اور ذکی طبیعت تھی۔(۲۸)

لباس ووضع

سید علامہ اچھے لباس کے شوقین تھے، بدن پر ہمیشہ صاف ستھرا جامہ ہوتا، سر پر مکہ والوں کی طرح عمامہ باندھتے جس میں جالیاں اور ریشمی مزرکش ڈورے پڑے ہوتے۔(۲۹)

ذرائع معاش

میں نے تلاش کیا کہ سید علامہ کے گذر اوقات کی کیا صورت تھی لیکن کوئی واضح بیان نہ ملا۔ تاہم ان کی جو زندگی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فراخی رزق سے بھی ان کو نوازا تھا۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس وقت ہمارے یہاں دو حبشی لونڈیاں اور ایک حبشی غلام ہے۔ باندیوں کا نام سعادہ اور رحمت تھا، اور غلام کا نام بلال تھا اور عجیب بات ہے کہ سید علامہ جب اپنے لیے کسی عالم سے سند یا اجازت نامہ طلب کرتے تو اس میں لکھتے کہ میری بیوی اور میری لونڈیوں اور غلام کے نام سے بھی اجازت نامہ بھیجے گا۔(۳۰)

بہرحال معاشی حیثیت سے سید علامہ کی حالت اچھی تھی، اس کا سامان کہاں سے ہوتا ہے۔ غالباً گمان یہ ہے کہ حکومتِ مصر یا وہاں کے ارباب خیر آپ کی

Marfat.com

مدد کرتے تھے، اور شہرت عامہ کے بعد ممکن ہے کہ خلیفۃ المسلمین یا دوسرے سلاطین کے یہاں سے آپ کو امدادیں ملتی ہوں۔

آخر عمر اور وفات

بہر حال جو بھی صورت حال ہو، سید علامہ نہایت عزت و جلال، صیت و شہرت کے ساتھ مصر میں زندگی گذار رہے تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اپنے عہد میں خدا نے ان کو وہ بلند رتبہ عطا فرمایا تھا جو نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ اس سے پیشتر بھی کم لوگوں کو نصیب ہوا تھا۔ وہ مصر ہی کے نہیں بلکہ اپنے زمانہ میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محدث، سب سے بڑے ادیب، سب سے بڑے لغوی اور آخر میں ایک مرتاض، صاحب باطن ولی اللہ تھے، تقریباً ہر اسلامی ملک کے لوگ آپ کے پاس آتے تھے اور جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ آپ تقریباً ہر اسلامی ملک کی زبان سے واقف تھے اس لیے قدرتی طور پر جو بھی آپ کے پاس آتا تھا وہ آپ کو اپنا پاتا تھا۔ ایرانی آتے تو ان سے فارسی میں گفتگو ہوتی۔ فارسی زبان کے مؤلفین و شعراء کا کلام ان کو سناتے وہ اس سے خوش ہوتا۔ ہندی جاتا تو ہندوستانی علماء کا حال پوچھتے۔ ترکی پہنچتے تو ترک فضلاء و صوفیاء کی قیمتی باتیں ان کو سناتے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک آپ کو اپنا سمجھتا تھا، اور غالباً مختلف زبانوں کے علم نے آپ کی قابلیت کے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا اور پھر یہی نہیں بلکہ کچھ دنوں سے جو مسلمانوں کا ایک عام دستور ہو گیا تھا کہ جن لوگوں کو ظاہری علوم و فنون میں انہماک ہوتا ہے کہ وہ باطن سے عموماً صفر یا کم از کم نا آشنا ہوتے ہیں اور اسی طرح اربابِ باطن علومِ ظاہری کی طرف کم توجہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ سچ یہ ہے کہ جس نے حقیقت کو پالیا وہ مجاز سے بے نیاز ہو جاتا ہے تاہم بے بصروں کے لیے نکتہ چینی کا موقع باقی رہتا ہے۔ لیکن سید علامہ کی عجیب شخصیت تھی وہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی زمانہ میں

Marfat.com

اگر ایک طرف سیبویہ اور جوہری کے جانشین تھے تو دوسری طرف ابن حجر اور عینی کے مسند درس کو ان پر ناز تھا۔ اگر ایک حیثیت سے ابن ہمام ابن نجیم کی روح ان کی فقہی نکتہ سنجیوں سے مسرور تھی تو دوسری طرف یہ حیرت انگیز تماشا تھا کہ سید نا غوث الثقلین، وسیدنا حبیب العیدروس الاکبرؒ کی مبارک آنکھوں کی آپ ٹھنڈک تھے اور یہی وہ جامعیت ہے جس کی ائمہ اسلام میں تمنا کی جاتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بہت کم پوری ہوتی ہے۔ لیکن جہاں کہیں اور جب کبھی کسی میں یہ جامع حیثیتیں جمع ہو گئی ہیں، مسلمان اس کی طرف پل پڑے۔ اسلامی دنیا ایسی شخصیت کے آگے لوٹنے لگی ہے اور یہی حال سید علامہ کا بھی ہوا لوگ ہر چار طرف سے امڈے پڑتے تھے۔ مختلف آرزو مختلف سوالات، مختلف مشکلات لے کر آتے اور تشفی حاصل کر کے جاتے تھے۔ ارشاد و ہدایت، درس و تدریس، وعظ و تذکیر، خط و کتابت کا دریا بہ رہا تھا اور پیاسے سیراب ہو رہے تھے وفات سے کچھ دن پیشتر تک خدا کا یہ فیض عمیم اسی طرح موجیں مار رہا تھا۔ (۳۱) یکا یک خدا جانے آپ نے کیا محسوس کیا کہ تاج العروس کا خاتمہ نگار لکھتا ہے کہ اچانک:

"لزم داره و احتجب عن اصحابه و اعتكف بد اخل الحريم و اغلق الباب و ترک الدروس و الاقراء". (۳۲)

کیا دیکھا، یا کیا دکھایا گیا، بہر حال اثر یہ تھا کہ ایسی بلند و وسیع شخصیت یکا یک سمٹ گئی اور یہ سب کچھ تھا وہ کسی کے لیے گویا کچھ نہ رہ گیا، اسی کے کچھ دن بعد قاہرہ میں طاعون پھیلا، جامع کردی جو سید علامہ کے مکان کے روبرو واقع ہے۔ وہیں نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ نماز سے فارغ ہوئے کہ طاعون کا اثر محسوس کیا۔ گھر پہنچے اور زبان بند ہو گئی۔ ہفتہ کا دن اسی خاموشی میں گذرا اور اتوار کے دن علم و عرفان کا وہ آفتاب جو گنگا کے ساحل پر طلوع ہوا تھا۔ نیل کی وادی

میں غروب ہوگیا۔ فِاِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن. ۱۲۰۵ھ شعبان کا مہینہ تھا۔

شہر میں شیوع طاعون کی وجہ سے سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کو اس واقعہ کی خبر بھی نہیں ہوئی حتیٰ کہ جامع ازہر کے اساتذہ جن میں آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت تھی، ان کو بھی آپ کی وفات کا اس وقت علم نہ ہوسکا۔ محلّہ میں جو چند مسلمان تھے انہوں نے آپ کی تجہیز و تکفین کی اور مصر کی مشہور درگاہ سیدہ رقیہ میں اس علمی دفینہ کو لوگوں نے محفوظ کر دیا۔ تاج العروس کے خاتمہ نگار نے لکھا ہے کہ سید علامہ نے اپنی زندگی میں ایک قبر اپنے لیے اس درگاہ میں بنوائی تھی اور اس میں مدفون ہوئے: (۳۳)

عاش حمیدا ومات شهیدا فالحیٰوة حیوته والممات مماته اللهم اغفرله واجعله من ورثة جنة النعیم، و نور قبره و قدس سره وارض عنه وعن امة محمد ﷺ اجمعین.

اولاد

میں نے لکھا ہے کہ سید علامہ نے قاہرہ میں شادی کر لی تھی لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

تالیفات

اگرچہ جسمانی طور پر مصر میں اس واسطی سید کا کوئی سلسلہ جاری نہیں ہوا لیکن اس کے ان علمی سلسلوں کو کون گن سکتا ہے۔ نہ صرف مصر بلکہ اسلامی دنیا پر چھا گئے۔ مختلف علوم وفنون میں سید علامہ کی کتابیں سو 100 سے متجاوز ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

۱) تاج العروس ۹ جلد

۲) اتحاف السادہ المتقین شرح احیاء علوم الدین ۸ جلد

۳) تکملۃ القاموس اجلد

۴) الفیۃ السند معہ شرحہا اجلد

۵) الجواہر المنیفہ فی تائید مذہب ابی حنیفہ اجلد

۶) امالی حنفیۃ اجلد

۷) حکمۃ الاشراق الی کتاب الآ فاق اجلد

۸) ترویح القلوب بذکر ملوک بنی ایوب اجلد

ان کتابوں کے علاوہ سید علامہ کے چھوٹے بڑے رسالے حدیث، تفسیر، تاریخ، لغت، علم الاسناد، تخاریج فقہ، منطق، فلسفہ، ادب، الغرض ہر علم میں آتے ہیں کہ ان کو کون شمار کر سکتا ہے۔ آپ کی تالیفات میں سے تاج العروس، شرح احیاء العلوم، الجواہر المنیفہ چھپ چکی ہیں۔

کتاب النفحۃ القدوسیہ لواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ

ان ہی کتابوں میں سے آپ کی ایک کتاب النفحۃ القدوسیہ لواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ ہے، جس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ سید علامہ کے پیر و شیخ سیدنا عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ عیدروس حضرمی رحمۃ اللہ علیہ ایک مجمع السلاسل بزرگ تھے۔ تقریباً اکثر شائع وذائع بلکہ بعض نادر طریقوں کی آپ کو اجازت تھی، سید علامہ نے ان تمام طریقوں کی اجازت وسند شیخ قدس سرہ سے حاصل کی تھی۔

خیال ہوتا ہے کہ ابتداً سید علامہ کو یہ خیال گذرا کہ ان تمام طریقوں کو ایک جگہ جمع کر دوں۔ لیکن اس کے بعد آپ نے اس خیال کو ایک مستقل تصنیف کی شکل میں بدل دیا، جو طریقے شیخ سے پہنچے تھے، ان کے سوا اور بھی کتابوں میں آپ کو جو طریقے نظر آئے، سب ہی کو لے لیا، اور حروف تہجی کی ترتیب سے ان کی فہرست تیار کی۔ درحقیقت اس کتاب کا اصلی موضوع یہی ہے، جو بجائے خود ایک اہم علمی اور

Marfat.com

دینی خدمت ہے۔ کیونکہ صوفیا کے حالات وطرق کے متعلق جو کتابیں مرتب ہوئی ہیں عموماً ان کا تعلق کسی خاص طریقہ، یا خاص ملک، خاص شہر کے اولیاء اللہ سے ہے۔ جس کا عام اثر یہ ہے کہ مصر کے مسلمان نہیں جانتے کہ ہندوستان میں کن بزرگوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے، ہندوستانی یہ نہیں جانتے کہ عرب میں ارشاد وسلوک کے کتنے طریقے مروج ہیں اور اس کی وجہ سے بسا اوقات ایک ملک کے مسلمان دوسرے ممالک کے بزرگوں سے نفع اٹھانے مین کوتاہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک ہے، مقصد ایک ہے۔ پھر اس میں بھی اس قسم کی تنگ نظریوں سے اگر کام لیا گیا، تو اس کا انجام بجز محرومی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

سید علامہ نے بڑا کام کیا کہ چند مختصر ورقوں میں ساری دنیائے اسلام کے ارباب باطن صلحاء، اولیاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقوں کو قلم بند کر دیا ہے۔ غالباً یہ کتاب ایسی حاوی ہے کہ عرب، عجم، مصر، مراکو، تونس، ہندوستان، الغرض کسی اسلامی ملک کا کوئی ایسا مشہور ومعروف معتبر طریقہ نہیں ہے، جس کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کے پڑھنے سے ارباب ذوق کے علم میں بہت کچھ اضافہ کی امید ہے اور یہ تو اصل مقصد ہے، لیکن اس کے ماسوا ضمنی اور ذیلی طور پر سید علامہ نے مختلف مقامات پر ایسی قیمتی باتیں درج کی ہیں جس کا ایک جگہ ملنا دشوار تھا اگرچہ ان باتوں کا تفصیلی علم تو کتاب کے پڑھنے سے ہوسکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس میں زیادہ تر سندوں کا ذکر ہے، جس کے پڑھنے میں ممکن ہے کہ عام لوگوں کو دلچسپی نہ ہو، اس سے چند اہم باتوں کا ذکر اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ سید علامہ نے شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ صوفیہ کے اس کثرت طرق کے اسباب کیا ہیں، کیا ان کی اسناد کسی اختلاف پر ہے، لوگ اس کی کوشش کیوں کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو، مختلف طریقوں کی ان کو اجازت

حاصل ہو۔ اس اکثار کا کیا نفع ہے اور سب سے اہم بحث ''خرقہ'' کی ہے۔ سید علامہ چونکہ صوفی ہونے کے ساتھ محدث بھی ہیں، اس لیے محدثانہ طور پر آپ نے اس پر بحث کی ہے۔ جو غالباً اس کتاب کے سوا دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد تلقین ذکر کے متعلق بھی ایک مفصل محققانہ بیان درج ہے، جس سے نہ صرف صوفی کی بلکہ محدثین علماء کی بھی راہنمائی ہوتی ہے۔

۲۔ اس کتاب کے دیکھنے والوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ فقر و طریقت کے سلسلے علاوہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلفاء حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ سے بھی جاری ہوئے ہیں۔ سید علامہ نے خاص خاص طریقوں کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے، بلکہ بکریہ، فاروقیہ تو عنوان میں درج ہے، ادھمیہ کے ذیل میں طریقہ فاروقیہ کا اور مداریہ کے تحت میں آپ نے عثمانی سلسلہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ بعض طریقے حضرت انس بن مالکؓ خادمِ سرورِ کائنات ﷺ اور حضرت ابو درداء صحابیؓ تک بھی منتہی ہوتے ہیں۔ لفظ ''دردائیہ'' کے تحت میں حضرت ابوالدرداءؓ اور ابو طالب مکیؒ کے طریقہ میں حضرت انسؓ کا ذکر فرمایا ہے۔

۳۔ علمائے ظاہر کو یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوگا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ الاسلام زکریا انصاری، تاج الدین سبکی، شاگرد امام ذہبی، زین الدین عراقی، حافظ مغلطائی، جلال الدین سیوطی، کمال الدین بن ہمام، امام الحرمین جیسے علماء بھی بارگاہِ فقر کے نیاز کیشوں میں ہیں، باضابطہ بیعت، ذکر ارادت سے مشرف ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار، اور ان کی عبرت کے لیے تو خود سید علامہ کا وجود بہت کافی ہے۔ ان میں کون ہے جو سید کے علمی علوِ مرتبت اور محدثانہ جلالت کا منکر ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تماشا ہے کہ ایک محدث تریم کے ایک درویش کی غلامی پر نازاں ہے، خاتمہ میں سید علامہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھنا چاہیے۔

Marfat.com

۴۔ اس کتاب میں سید علامہ نے متفرق مقامات پر مختلف اولیاء اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے برای العین ملاقات کی اجازت حاصل کی، اسی طرح حضرت خضر و الیاس علیہما السلام کی ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ خضر علیہ السلام کی حیات وممات میں چونکہ علماء ظاہر کو اختلاف ہے، اس لیے طریقہ خضریہ کے ذیل میں سید نے اس پر سیر کن بحث کی جو قابل دید ہے۔

۵۔ طریقہ محمدیہ کے ذیل میں ایک لطیف بیان اس مسئلہ کے متعلق درج ہے کہ اب بھی کوئی آنحضرت ﷺ سے براہ راست نفع اٹھا سکتا ہے۔ سید نے اس کی تدبیر بتائی ہے اور وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

۶۔ ایک عجیب بات اس کتاب میں یہ بھی ہے کہ خلفائے عباسیہ جس طرح بیعت، سمع و طاعت و خلافت لیتے تھے، اسی طرح وہ بیعت، طریقت و ارادت بھی لیتے تھے۔ لفظ ''عباسیہ'' کے تحت میں ان کی پوری سند درج ہے۔

۷۔ امام سحنون، معلم افریقہ مدون مذہب مالکیہ کے ایک شاگرد ابوعقال کی طرف ایک طریقہ منسوب ہے۔ جس کو افریقہ میں مدولیہ کہتے ہیں۔ سید علامہ نے ان کے ذکر میں ''جذب'' کی نہایت محققانہ وضاحت کی ہے۔ جس کو ''مجذوب فقراء'' کے ''فقر'' و ''وصول'' میں شبہ ہے، ان کو خاص طور پر یہ بحث پڑھنی چاہیے۔

۸۔ اس زمانہ میں ایک عام خیال یہ بھی پھیلا ہوا ہے کہ صوفیوں نے مسلمانوں کے جذبہ شجاعت کو پامال کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت برباد ہوگئی۔ ایسے حضرات کے لیے مناسب ہوگا کہ لفظ ''بکتاشیہ'' کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، پڑھیں، ان کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی وہ مشہور و معروف ''فوجی قوت'' جس کا نام سن کر یورپ تھرا جاتا تھا۔ یعنی ترکوں کی ''ینگچری فوج'' ایک صوفی کی مرتب کی ہوئی تھی۔ اور کیا معلوم کہ ہندوستان، ترکستان، افریقہ میں جو کچھ تھا، اس کا زیادہ تر قیام

Marfat.com

ان ہی نفوس طیبہ کے ساتھ وابستہ تھا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ان شاءاللہ کسی مستقل تصنیف سے ان کو ظاہر کیا جائے گا۔

۹۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ ان کا ایک ہم وطن جامع ازہر کے شیوخ کا استاد ہوگیا تھا، اسی طرح وہ یہ سن کر بھی خوش ہوں گے کہ ان ہی کے وطن کے ایک بزرگ شیخ تاج الدین زکریا ملتانی جو حضرت شیخ باقی باللہ نقشبندی کے خلیفہ تھے، انہوں نے بصرہ، یمن، احساء، نجد اور خود حجاز میں طریقہ نقشبندیہ کو پھیلایا اور ان ممالک میں ان کے مریدوں کی بڑی جماعت تھی، سید علامہ نے لفظ تاجیہ کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ سید علامہ نے اس کتاب میں ''طریقہ قلندریہ'' کا خصوصیت کے ساتھ اور ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ''ملامتیہ'' کے بیان میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ان پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، وہ شرعاً قابل لحاظ نہیں ہے اور یہ دونوں بحثیں دیکھنے کے قابل ہیں۔

۱۱۔ ''نقشبندیہ'' طریقہ تعلیم و تربیت کے بیان میں بہ نسبت اور سلسلوں کے سید علامہ نے بسط سے کام لیا ہے اور اتنا لکھا ہے کہ محض اس کتاب کی مدد سے آدمی اس طریقہ کے مشاغل کو حاصل کر کے کامیاب ہوسکتا ہے۔

۱۲۔ ایک نئی چیز اس کتاب میں یہ بھی ہے کہ طریقہ نقشبندیہ کے ذیل میں سید علامہ نے ایک ایسے بزرگ کا تذکرہ کیا ہے جو کسریٰ نوشیرواں کے خاندان سے تھا، ان کا نام نامی ابوعلی احمد بن محمد قاسم بن منصور بن شہریار رودباری ہے اور ایسے تو متعدد بزرگوں کا ذکر ہے، جو مختلف خاندان شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۳۔ لفظ ''غازیہ'' کے تحت میں سیدی احمد بن علی درعی سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے ''جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا وہ جہنم میں نہیں جاسکتا''۔

Marfat.com

اور بعض دوسرے اہل اللہ سے بھی اس قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ بظاہر یہ دعویٰ عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد سید علامہ نے اس دعویٰ کی جو وجہ مسلسل سند سے نقل کی ہے اس سے راز واضح ہو جاتا ہے۔ سید نے اپنے پیر سے، انہوں نے حسین بن عبدالرحیم سے، انہوں نے ابو ناصر سے، انہوں نے ابو سالم فشاشی سے، وہ سیدی احمد بن علی صاحب دعوی سے راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''نارِ جہنم اس شخص کو نہیں چھو سکتی جس نے تجھ کو دیکھا یا تیرے دیکھنے والے کو دیکھا'' سیدی احمد کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی اس کے بعد اگر انہوں نے دنیا کو یہ بشارت دی تو پھر اس کے سوا چارہ کیا تھا یہ تو

انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

اور اس کے کہنے پر وہ مجبور تھے، ورنہ خود سیدی احمد کا جو حال تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس بشارت کو نقل فرماتے اور پھر کہتے کہ:

''خوف کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا، اگرچہ میں جنت میں ہی کیوں نہ ہوں، فرض کرو کہ اس کے بعد بھی اگر مجھ سے کہا جائے کہ جنت سے نکل جا، تو میں کیا کرلوں گا، اور کیا بول سکتا ہوں''۔

کیا اس کے بعد بھی ان بزرگوں کے اظہارِ واقعہ کو کوئی دعویٰ پر محمول کر سکتا ہے۔ باقی یہ امر کہ ان کو دیکھنے والا جنت کا کیوں مستحق ہو جاتا ہے۔ سید علامہ نے اس کی خود توجیہہ کی ہے، فرماتے ہیں:

''آپ کا یہ فرمانا کہ میں جنت کا ضامن ہوں''

اس کا مطلب یہ ہے میں اس بات کا ذمہ دار ہوں کہ ایسے شخص کی موت اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ اگر موسیٰ کو دیکھ کر ساحروں میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے، اگر سرورِ کائنات ﷺ کی نظرِ اقدس عمر کو فاروق بنا سکتی ہے۔ تو حضور ﷺ کے

Marfat.com

اتباع وخدام کی جن پر نگاہ پڑی، ان میں کوئی ایسا ایمانی انقلاب پیدا ہو جائے کہ اس کے بعد ان سے اہل جنت کے افعال صادر ہوں تو اس پر لوگوں کو تعجب کیوں ہے

۱۴۔ ''خلوتیہ'' کے تحت میں، شعبان آفندی قسطمونی کا یہ عجیب واقعہ سید علامہ نے نقل کیا ہے کہ:

''انہوں نے جنوں کے رئیس سے یہ عہد لیا کہ ان کے طریقہ والوں میں کسی کو جن اذیت نہ پہنچائیں اور ایسی کوئی کشتی ڈبوئی نہ جائے جس میں ان کے طریقہ کا کوئی آدمی سوار ہو اور ان کے سلسلہ کے کسی آدمی پر قرض کا بوجھ نہ رہے، اور خلافت محمدیہ کا خاتمہ ایسے شخص پر ہو، آپ کے طریقہ میں داخل ہو''۔

آنحضرت ﷺ نے جنوں کی بیعت لی اور ان سے بعض معاہدات کیے۔ پس اتباع نبوی کا یہ کیا عجیب ثمرہ ہے کہ انسان کامل ہو جاتا ہے، اور جو کامل ہو جاتا ہے نہ صرف نباتات وحیوانات بلکہ جن تک اس کے زیر فرمان ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بزرگوں کے سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد انسان کن دینی ودنیوی سعادتوں سے بہرہ یاب ہوسکتا ہے۔ کیا معلوم کہ خدا کے کس دوست نے اپنے مولیٰ سے کیا کیا وعدے کیے ہیں۔

۱۵۔ لفظ ''قادریہ'' کے تحت میں طریقہ قادریہ کی اس نماز کا بھی ذکر کیا ہے جو عام طور پر اس سلسلہ کے حضرات پڑھتے ہیں، اور محدث علامہ نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ دیکھنے والوں کو دیکھنا چاہیے۔

۱۶۔ حسین بن منصور کا ذکر بھی اس کتاب میں ہے اور ان کے نام سے ایک خاص طریقہ ''حلاجیہ'' منسوب ہے، سید علامہ نے لکھا ہے:

''خطیب بغدادی نے حسین کا وسیع تذکرہ کیا ہے''

''آج خطیب کی کتاب ناپید ہے، ورنہ دیکھا جاتا کہ بغداد کے اس خطیب

Marfat.com

نے بغداد کے اس بدنام صوفی کا کیا حال لکھا ہے۔ ان لوگوں کو جو حسین بن منصور سے بہت برہم ہیں۔ خطیب کی تاریخ تلاش کرنی چاہیے، غالباً ان کو اپنے خیال میں ترمیم کرنی پڑے گی ورنہ اس سے پیشتر اگر حسن ظن سے کام لیا جاتا تو کیا یہ بہتر نہ تھا۔

۱۸۔ اس کتاب میں اور بھی بعض نادر اور عجیب باتیں ہیں، مثلاً ابو سالم ابراہیم ابن احمد زوادیؒ کی عمر ایک سو چھتیس (۱۳۶) سال لکھی ہے۔ اسی طرح لفظ وقائیہ کے تحت میں حضرت محمد وفاؒ کے حالات لکھتے ہوئے سید علامہ نے لکھا ہے:

''آپ امی تھے لیکن ادبائے قوم میں آپ بحیثیت زبان دانی کے بہت ممتاز تھے، آپ نے سات یا دس سال کی عمر میں بہت سی تالیفیں کیں''

الغرض یہ کتاب اگرچہ بظاہر اسمائے اولیاء اللہ کی ایک اجمالی فہرست ہے۔ لیکن بیچ بیچ میں ایسے عجیب وغریب معلومات، مفید بیانات درج ہیں جو بہت سی کتابوں کے پڑھنے سے بھی میسر نہیں آسکتے۔ سید علامہ نے اگرچہ التزام نہیں کیا ہے، تاہم بعض اہم طریقوں کے ذکر میں اسی طریقہ کے اصول، فوائد، دستور العمل کو نہایت جامع لفظوں میں لکھ جاتے ہیں۔ مشہور اکابر اولیاء کے سنین وفات، مقام وفات، زندگی کے کسی اہم واقعہ کا بھی ضرور ذکر کرتے ہیں۔ آخر میں خاتمہ لکھا ہے جو سلسلہ فقر وسلوک کی جان ہے اور اگر انسان اسی کو اپنا دستور العمل بنالے تو وہ بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

''تصورِ شیخ''، پر سید علامہ کو بہت اصرار ہے اور خاتمہ میں اس مسئلہ پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

۱۹۰۔ طریقہ ہمدانیہ کے ذیل میں سید علامہ نے لکھا ہے کہ اس طریقہ کے بانی سید علی ہمدانی کشمیری اپنے مریدوں سے خاص خاص اوراد اذکار صبح وعصر میں ذکر بالجہر کراتے تھے۔ شیخ الحدیث فی الدیار الہندیہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

Marfat.com

استاذ نا ومولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے میں نے یہ سنا ہے کہ اس طریقہ سے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جنہوں نے اس کو بدعت کہا ہے غلطی پر ہیں۔

نیاز مند نے ہندوستانی مسلمانوں کے نفع کے لیے، قطب العصر والزمان، سید السادات بقیہ الکرام البررہ غوث الانام البدر التمام سیدنا وسندنا مولانا الہمام سید حبیب العیدروس الحسینی التریمی الحضرمی نزیل حیدرآباد دکن، متعنا اللہ المسلمین بطول بقاہٗ کے اشارہ قدسیہ سے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور میری محنت کا اگرچہ یہ کافی صلہ ہے کہ سید امام کے فرمان کی تعمیل ہوگئی۔ تاہم جن لوگوں کو اس کتاب سے نفع پہنچے ان سے توقع ہے کہ اس عاصی و سیاہ کار کی مغفرت کی دعا فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں کے طفیل میں جن کے اسمائے گرامی کے لکھنے سے اس ترجمہ میں بندہ عاجز سعادت اندوز ہوا ہے، مجھ پر رحم فرمائے، توفیق خیر عنایت فرمائے اور میرا حشر ان ہی ابراء واتقیاء کے ادنی خدام میں کرے۔

ربنا اغفرلنا ذنوبنا و کفرعنا سیئات اعمالنا و توفنا مع الابرار

Marfat.com

حواشی

الف۔ دراصل یہ مضمون کتاب ''تحفہ قدسیہ'' کے ترجمہ کا تعارفی مقدمہ ہے، ہمارے مخدوم اخونافی اللہ مولانا عبدالباری پروفیسر عثمانیہ کالج کے اصرار سے معارف میں اشاعت کے لیے بھیج دیتا ہوں۔ اس مقدمہ سے ناظرین کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس کے جوابدہ مولانا عبدالباری ہیں۔ میں نے محض ان کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ تاہم برادران اودھ سے اتنا تو ضرور عرض کروں گا کہ اگر مصر و یمن کیلیے نہیں تو کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کوئی مرتضی کیوں نہیں اٹھتا۔ ہندوستان کا شیراز بجائے لندن و برلن کے شیراز ہی ہوتا تو اچھا تھا۔ کیا بلگرام و خیرآباد، سندیلہ و سنہالی، کاکوری اور گوپامئو دیوہ اور بانسہ کے مسلمان میری اس آرزو کو سنتے ہیں۔

ب۔ سادات بلگرام حضرت ابوالفراح واسطی کے اولاد میں ہیں۔ علامہ عبدالواحد بلگرامی کا اسی سناد پر یہ مشہور شعر ہے۔

دانی کہ خوش نویسی ما از برائے چیست ما نیم واسطی و قلم نیز واسطی

(ماثرالکرام، ص ۱۳۵، بلگرامی، آزاد علی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء)

سید ابوالفرح واسطی امام زید شہید بن سید الساجدین امام زین العابدینؒ کے خانوادۂ شرافت و سیادت کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ نے خود ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف نہیں فرمایا لیکن آپ کے تین صاحبزادے یہاں تشریف لائے اور انہیں کی اولاد ہندوستان میں پھیلی سید مبارک محدث، اور میر عبدالجلیل بلگرامی سے شجرہ طیبہ میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے یہ عبارت نقل کی ہے۔

''از انجملہ سید ابوالفراس کہ جد سادات بلگرام است در جاجیز رسید، و سید ابوالفضائل در جہاتر و سید داؤد در تھن پور وطن گرفتند'' (ماثرالکرام، ص ۱۳۷،)

ان ہی ابوالفراس کی نسل میں ایک بزرگ علی بن حسین تھے، جن کے چار بیٹے تھے ان میں سے ایک بلگرام میں آکر بسے، شجرۂ طیبہ میں ہے:

''محمد در بلگرام و سید جعفر در مدولی، و سید احمد در دہرسو، و سید معزالدین در جاجیز بوطن گرفتند'' (ماثرالکرام، ص ۱۳۸)

Marfat.com

جاجیزی سادات کا ایک خاندان صوبہ بہار کے بارہ گانواں میں آباد ہوا اور بحمد للہ کہ راقم الحروف کا بھی تعلق اسی خاندان سے ہے۔

ج۔ ابدل کے معنی عام طور پر اقرب (نزدیک) کے لیے جاتے ہیں لیکن بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''علی اللہ دل'' کی مصحف شکل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حوالہ جات

۱۔ ابجد العلوم، ۳/۲۴، قنوجی، صدیق حسن خان، نواب، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۰ھ

۲۔ مآثر الکرام، (مقدمہ)، ص ۲۰، عبد الحق، مولوی، آگرہ مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء

۳۔ مآثر الکرام، ۱/۱۴۹، بلگرامی، آزاد علی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء

۴۔ ایضاً، ۱/۱۳۹

۵۔ ایضاً، ۱/۱۴۹۔۱۴۴

۶۔ ایضاً، ۱/۱۴۹

۷۔ تاج العروس، (خاتمۃ الکتاب) ۱۰/۴۶۹، زبیدی، سید محمد مرتضیٰ، مصر، مطبع الخیریۃ، ۱۳۰۶ھ

۸۔ ابجد العلوم، ۱/۱۸

۹۔ تاج العروس، ۱۰/۴۶۹

۱۰۔ محولہ بالا

۱۱۔ ابجد العلوم، ۳/۲۳

۱۲۔ تاج العروس، ۱۰/۴۶۹

۱۳۔ ابجد العلوم، ۳/۱۹۔۱۸

۱۴۔ ایضاً، ۳/۱۳۔۱۲

۱۵۔ ایضاً، ۳/۱۳۔۱۰

۱۶۔ ایضاً، ۳/۱۲

۱۷۔ ابجد العلوم، ۳/۱۹

۱۸۔ محولہ بالا

۱۹۔ محولہ بالا

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ ابجد العلوم، ۳/۲۰

۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ تاج العروس، ۱۰/۴۷۰

۲۵۔ ابجد العلوم، ۳/۲۲

۲۶۔ آل عمران/۲۶

۲۷۔ تاج العروس، ۱۰/۴۷۰

۲۸۔ محولہ بالا

Marfat.com

۲۹۔ ابجد العلوم، ۳/۲۱

۳۰۔ تاج العروس، ۱۰/۴۷۰

۳۱۔ محولہ بالا

۳۲۔ محولہ بالا

۳۳۔ محولہ بالا

Marfat.com

ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی

یوں تو مغربی افکار و خیالات سے ہندوستان اسی زمانہ میں اثر پذیر ہونے لگا تھا، جب گوا بندر سے اکبری دربار میں دانایان فرنگ کی آمد و رفت شروع ہوئی، ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا:

''آمد و رفت فرنگیاں نیز شد و بعضے اعتقاداتِ عقلی ایشان را فراگرفتند'' (۱)

''اکبری دربار میں فرنگیوں کی آمد و رفت بھی جاری ہوئی اور ان ہی لوگوں سے بادشاہ نے بعض عقلی اعتقادات و نظریات کو حاصل کیا''۔

حاجی حبیب اللہ نامی کوئی صاحب تھے، ارغنون (پیانو، باجہ) اپنے ساتھ فرنگستان سے وہ لائے جس کے ساتھ اس کے فرنگی سازندے بھی تھے اس باجہ کی کرشمہ نوازیوں کا مظاہرہ اکبر کے دربار میں جب کیا گیا، تو ملا ہی نے لکھا ہے:

''اہل مجلس از ان عجوبہ حیران ماند'' (۲)

''مجلس والوں کو اس عجیب باجے نے ششدر و حیران بنا دیا''

ان حیران ہونے والوں میں خود ملا صاحب بھی تھے، لکھا ہے کہ اس باجے کی جیسی تعریف کی جائے میں بھی بیان نہیں کرسکتا۔

بہرحال اس مجلس میں بھی اکبر نے درباریوں سے پوچھا کہ آج دنیا کے پردے پر سب سے زیادہ عقل و دانش رکھنے والے کون لوگ ہیں؟ گو جواب دینے والوں نے بادشاہ کے سوال کو شاید نہیں سمجھا، ابوالفضل نے اپنے والد بزرگوار ملا مبارک

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں اکتوبر و نومبر ۱۹۵۱ء، جنوری ۱۹۵۲ء کو تین اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

کا نام پیش کر دیا اور حکیم ھمام نے دعویٰ کیا کہ ''اعقل ناس خود رامی دانم'' (۳)

لیکن جس مجلس میں جس خاص حال کی وجہ سے یہ سوال اکبر کے دل میں پیدا ہوا تھا، یا ہو سکتا تھا اس کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں گیا، حالانکہ ملا عبدالقادر ہی نے اسی کتاب میں ''دانایانِ فرنگ'' کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر ان لوگوں کو ''اربابِ عقل واجتہاد زمان'' کے نام سے موسوم کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ قصہ تو طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ قصبہ جلیسر میں ایک مجذوب شیخ قطب نامی رہتے تھے، ان سے اور انہیں دانایانِ فرنگ سے ایک دفعہ جھڑپ پر سرِ دربار ہوگئی، مجذوب صاحب نے دعوی کیا کہ آگ کا الاؤ جوڑا جائے اور ان فرنگیوں کو حکم دیا جائے کہ ہمارے ساتھ اس میں پھاندیں اس موقع پر ملا نے لکھا ہے:

''ارباب عقل واجتہاد را حاضر سافتند'' (۴)

''اکبر نے اربابِ عقل واجتہاد کو حاضر ہونے کا حکم دیا''

دانایان فرنگ مجذوب کے اس رنگ کو دیکھ کر حیران ہوئے، ملا بدایونی نے لکھا ہے:

''دست در کمر فرنگی زدہ گفت ہان بسم اللہ'' (۵)

''مجذوب صاحب نے فرنگی کی کمر میں ہاتھ دے کر کہا کہ ہاں بسم اللہ''

ظاہر ہے کہ عقل والے بیچارے مجذوب کا ساتھ کیا دیتے، سب بادشاہ کا منہ دیکھنے لگے، اکبر ان فرنگیوں سے اس حد تک متاثر تھا کہ بیچارے مجذوب ہی کو جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اکبر کے دینِ الٰہی میں اس قسم کے دفعات جو پائے جاتے ہیں:

''از یک زن نکاح نکند مگر آنکہ نازا و باشد وگرنہ خدا نیکے وزن نیکے'' (۶)

Marfat.com

''بجز ایسے آدمی کے جس کی بیوی بانجھ ہو حکم دیا گیا کہ ایک ہی عورت تک ہر شخص نکاح کو محدود رکھے، آخر جب خدا بھی ایک ہے، تو عورت کو بھی چاہیے کہ ایک ہی ہو''

یا جیسا کہ ملا عبدالقادر ہی کا بیان ہے:

''توغل در استحالہ وحی، وتشکیک در نبوت و بود جن و ملک و سائر مغیبات و معجزات وکرامات انکار صریح آورند'' (۷)

''بادشاہ کو اس قسم کے مسائل میں مثلاً وحی کا ہونا ناممکن ہے، یا نبوت میں شک اندازی میں غلو پیدا ہو گیا، اسی طرح جن، فرشتے اور دوسری غیبی ہستیوں نیز معجزے اور کرامات کا بادشاہ صراحتہً انکار کرنے لگے''

اور اس باب میں اتنا غلو کہ بقول ملا صاحب مسئلہ معراج کی عقلی تنقید فرماتے ہوئے بہ سرِ دربار بادشاہ سلامت ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اہلِ مجلس کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے:

''ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا نماند استادہ تواند بود'' (۸)

''جب تک میری ایک ٹانگ زمین پر ٹکی نہ رہے، میرا کھڑا رہنا، ممکن نہیں''

اس عملی مشاہدے سے مطلب یہ تھا کہ نیچر کے مقرر قوانین کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے:

''شخصے در یک لحظہ بآن گرانی جسم از خوابگاہ بآسمان رود، ونود ہزار سخن گوئی گوئی یا خدائے تعالیٰ بکند و بسترش ہنوز گرم باشد تا باز بیاید'' (۹)

''ایک آدمی پل بھر میں اپنے بوجھل جسم کے ساتھ خوابگاہ سے آسمان پر چلا جائے، اور نوے ہزار باتیں خدا سے کر بھی لے، اور اس حال میں کہ ابھی اس کے بستر کی گرمی باقی ہی تھی وہ واپس بھی آ جائے''

Marfat.com

یہ اور اسی قسم کی بیسیوں باتیں جن کا ذکر ملا نے بھی کیا ہے، اور ملا کے سوا دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی جن کا کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے (الف)، ظاہر ہے کہ ''دانایانِ فرنگ'' کی دانائیوں کے سوا اور کس چیز کا عکس ان کو قرار دیا جائے، سولہویں صدی کے نصف آخر سے سترہویں صدی عیسوی کے اَبتدائی سالوں تک ہندوستان میں اکبر کو فرمانروائی کا موقع میسر آیا تھا، اور یہی وہ زمانہ ہے جب قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکل کر یورپ اپنی جدید علمی نشاءت میں بلوغ کے حدود تک اگر کلیتہً نہیں پہنچ چکا تھا تو ان حدود میں داخل ہونے کے لیے بلاشبہ تیار ہو چکا تھا۔ بقول الفرڈ ریپر جس کا:

''لازمی نتیجہ وہ اصلاح فلسفہ تھی، جو پندرہویں اور سولہویں صدی کے آزاد خیالوں نے شروع کی، ۱۶۰۰ء کے قریب بعض نہایت باجرأت جدت پسندوں نے جاری رکھی، اطالیہ میں برونو، انگلستان میں بیکن، اور فرانس مین ڈیکارٹ (ب)''۔(۱۰)

اور جیسا کہ اسی نے لکھا کہ کلیسا کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود اسی زمانہ میں (پندرہویں سولہویں صدی میں)

''نئے نظریات پھیل گئے، کثرت سے اکتشافات و ایجادات ہونے لگے، پہلے چھپائی ایجاد ہوئی، پھر پرکار بحری اور پھر دوربین''۔(۱۱)

آگے اسی کے الفاظ میں:

''علوم نے مدرسیت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تھا، اور آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر آگے کو قدم بڑھا چکے تھے''۔(۱۲)

وہی رقمطراز ہے کہ اس وقت تک:

''کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی، واسکوڈی گاما نے اس گڈھوپ کے گرد

Marfat.com

سے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کیا، اور سب سے زیادہ یہ بات کہ میگیلن (Megellen) زمین کے اردگرد چکر لگانے میں کامیاب ہوا'' (۱۳)

الغرض بنی نوع انسانی کے آخری پیغمبر ﷺ کے حساب سے ہزار سال (ج) کی مدت جب پوری ہو رہی تھی، یا بقول ڈریپر:

''پندرہویں صدی کے وسط سے مغربی یورپ میں یکے بعد دیگرے متعدد حیرت انگیز واقعات ظاہر ہوئے'' (۱۴)

یہی زمانہ اکبر کی حکمرانی کا بھی تھا اور اسی زمانہ میں سیاسی رشتہ تو ابھی قائم نہیں ہوا تھا، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علمی اور فکری دباؤ یورپ کا ہندوستان پر پڑنے لگا تھا، اور ملک کی سب سے بڑی نمائندہ شخصیت ہی اس سے متاثر ہو چکی تھی، تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ بھی اثر پذیریوں کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہی رہا، دانشمند خان جن کا اصلی نام ملا شفیعائی یزدی تھا، عہد جہانگیری و شاہجہانی کے سوا عالمگیری دور میں بھی غیر معمولی عزت و اعتبار کی نظروں سے مغلی حکومت میں دیکھے جاتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے، ان ہی کے متعلق مآثر الامراء میں روایت نقل کی گئی ہے:

''خان مزبور در انجام عمر بعلم اہل فرنگ مائل گردید، و اکثرے از تحریفات آن جماعۃ تکرار می نمود'' (۱۵)

''مذکورہ بالا خان صاحب آخر عمر میں اہلِ فرنگ کے علم کی طرف مائل ہو گئے اور ان ہی فرنگیوں کی الٹی پلٹی باتوں کو دہراتے رہتے تھے''

خافی خان محمد شاہی عہد کے مشہور مؤرخ نے بھی ان ہی فرنگیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محرر اوراق مکرر دران مکان و نبادر دار دگشتہ با علمائے آنہا صحبت داشتہ

Marfat.com

مذاکرہ نمودہ''(۱۶)

''ان اوراق کا لکھنے والا (یعنی خود خافی خان) بار بار ان مقامات میں (جہاں فرنگیوں کے ساحلی مراکز تھے) اوران بندرگاہوں میں جہاں وہ رہتے تھے، آتا جاتا رہا ہے اور فرنگیوں کے اہل علم کی صحبت میں رہ کران سے علمی مذاکروں اور مباحثوں کا بھی موقع اس کو ملتا رہا ہے''

مذاکرہا نمود کے سلسلے میں جہاں دینی بحثوں کی گنجائش ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ علمائے فرنگ اپنے ملک کے فکری رجحانات کا تذکرہ بھی نہ کرتے ہوں گے،

اور یہ قصے ان دنوں کے ہیں جب مغل دربار میں فرنگیوں کی درخواست ان الفاظ میں پیش ہورہی تھی:

''ما از طرف شما نوکر بے علوفہ برائے دفع شر مفسدان روئے دریا ہستیم، پارچہ زمین ناکارہ کنار دریا کہ حکام وفرمان روایان سلف ایں مرز وبوم بہ بزرگان ماداوہ اند، آبادکردہ خدمت می نمائیم (د)''۔(۱۷)

''ہم لوگ بغیر تنخواہ کے آپ کے نوکر ہیں، تاکہ سمندر میں فساد کرنے والوں کا ہم قلع قمع کرتے رہیں، اس ملک (ہندوستان) کے گذشتہ حکمرانوں نے سمندر کے کنارہ کی ناکارہ زمین ہمارے بزرگوں کو عطا کی تھی، جسے آبادکر کے ہم لوگ آپ کی خدمت انجام دیتے ہیں''

ظاہر ہے کہ ہندوستانی حکومت کے بھی ''نوکر بے علوفہ'' جن کی سب سے بڑی عزت یہی تھی کہ ''خدمت می نمائیم'' کا موقع ہندوستانیوں کے متعلق ان کو جو مل گیا تھا، اس کو باقی رکھا جائے، وہی جب ہندوستان کے حکمران ہوکر ہندوستانیوں ہی کو نوکر رکھنے لگے، اور جو خادم تھے، وہی جب مخدوم بن گئے اور ملا عبدالقادر کے

Marfat.com

یہی ''پادھری'' پادری بن کر ہندوستان کے برزن و بازار میں پتنگوں کی طرح جب پھیل گئے اور بقول سرسید احمد خان یہ رواج بھی نکلا کہ آنکھوں کے سامنے یہ تماشا دکھایا جارہا تھا:

''پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا، اور پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی'' (۱۸)

صرف پادریوں ہی کا حال یہ نہ تھا کہ بلکہ انگریزی حکام علامہ سید صاحب کے ساتھ یہ کررہے تھے:

''حکام انگریزی ولایت جو اس ملک میں نوکر ہیں، وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں، اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں'' (۱۹)

بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہورہا تھا:

''اکثر حکام معتمد اور افسران فوج نے اپنے تابعین (ماتحتوں) سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی، بعض صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو'' (۲۰)

اور آخر میں ان ہی فرنگیوں کی دلیریاں ترقی کر کے اس نقطہ تک پہنچ گئیں کہ بقول سید صاحب مرحوم:

''پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام

Marfat.com

ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہوگئی'' (۲۱)

پس چاہیے:

''مذہب بھی ایک ہو جائے، اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ (ہندوستانی لوگ) بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ'' (۲۲)

جب نوکر بے علوفہ ہونے کے زمانہ مین یورپ ہندوستان کو اپنے افکار وخیالات سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مطلق العنانیوں کے ان دنوں میں ہندوستان کے باشندوں کا کیا حال ہوگا، پادری اے ایڈمنڈ کی مذکورہ بالا چھٹی، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ حکومت کے اشارے سے ملک میں گشت کرائی جارہی ہے، سید صاحب نے لکھا ہے:

''ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت آ گیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو''۔ (۲۳)

ان ہی کے الفاظ اس کے بعد یہ بھی ہیں:

''سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیات گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں'' (۲۴)

خلاصہ یہ ہے کہ جس قصہ کی ابتداء پندرہویں صدی میں ہوئی تھی، انیسویں صدی کے نصف میں اسی کی انتہا مذکورہ بالا مہیب شکلوں میں ہندوستانیوں کے سامنے کھڑی ہوکر ان کی ملی اور قومی زندگی کو آخری فیصلہ کا جس وقت منتظر بنا کر دھمکا رہی تھی، اس نازک ترین وقت میں بعض جگر دار افراد مختلف گوشوں سے اٹھ کھڑے ہوئے، ان مین اس ملک کے مسلمان باشندے بھی تھے اور ہندو بھی۔

خدا کا شکر ہے کہ ان کی کوششوں کا سلسلہ جاری رہا، اور خواہ واقعی اسباب کچھ ہی ہوں، لیکن دیکھا یہی گیا کہ پانی کے جس راستے سے فرنگی آئے تھے، اسی آبی راہ سے اپنی ایڑیوں پر وہ واپس ہو گئے، کام کرنے والوں نے اپنی اپنی بساط اور اپنے اپنے امکانات، ذہنی رجحانات کے تحت کام کیا، اج ہم ان کا ذکر تشکر و امتنان کے ساتھ کرتے ہیں، ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی عملی صلاحیتوں سے کام لیا، اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے عمل سے زیادہ اس راہ میں علمی اور فکری کوششوں ہی کی حد تک اپنی خدمات کو محدود رکھا۔ کم و بیش ان میں سے اکثروں کے نام کا بھی اور کام کا بھی ہم تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، شاید ہی ان میں کوئی ایسی بدقسمت ہستی ہوگی، جسے لوگوں نے کلیتہً بھلا دیا ہو، اور اسی لیے تعجب ہوتا ہے کہ واللہ واعلم کیا صورت پیش آئی، کہ اسی میدان میں علمی و فکری حیثیت سے عین اس وقت جب گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، ایک غریب مولوی کے قلم نے گوشہ میں بیٹھ کر جو کام کیا تھا، چرچا تو اس کے کاموں کا ہر جگہ کیا گیا، اس کے بہت سے خود آفیردہ نکات و نظریات کو لوگوں نے اپنی طرف منسوب کر کے پھیلایا، لیکن اس بدقسمت مظلوم مولوی کا نام لوگوں کے حافظہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ کیوں نکل گیا، آج میں اسی بھولے اور بھلائے ہوئے مظلوم مولوی سے لوگوں کو کچھ روشناس کرنا چاہتا ہوں۔

یہ امروہہ کے رہنے والے نقوی خاندان کے سید تھے۔ نام ان کا مولوی حکیم محمد حسن تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ خاکسار بھی ایک مدت تک نہ ان کے نام ہی سے واقف تھا اور نہ کام سے۔ خیال آتا ہے کہ پہلی دفعہ اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی زبانِ مبارک سے یہ سنا کہ بہت سے خیالات اس زمانہ میں لوگ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کی جماعت کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کا بڑا حصہ ان ہی مولوی محمد حسن امروہوی کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ شاہ صاحب نے

Marfat.com

مرزائی عقائد وخیالات پر اپنی بعض عربی کتابوں میں بحث کی ہے، ان میں بھی مولوی صاحب کا ضمناً ذکر آ گیا ہے۔ ان کو ان امروہوی مولوی صاحب سے کچھ شکایت بھی تھی، فرماتے تھے کہ اچھی باتوں کے ساتھ بعض دفعہ وہی ایسی چیزوں کی تائید کرنے لگتے ہیں، جنے دیکھ کر ان کے متعلق کہنا پڑتا ہے:

''یومن بکل حق و باطل''

''ہر سچ اور جھوٹ دونوں قسم کی باتوں کو وہ مان لیتے ہیں''

حضرت الاستاذ کے گوش زدہ الفاظ ابتدائی محرک ہوئے اور ان کی کتابوں کی جستجو کرنے لگا، افسوس ہے کہ بجز ایک کتاب یعنی قرآن کی تفسیر جس کا نام ''غایۃ البرہان'' ہے، مجھے ان کی اور کوئی کتاب نہیں ملی بجز ایک خاص پہلو کے تفسیر تو ان کی چنداں اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اس تفسیر کے ساتھ ایک ضخیم مقدمہ بھی ہے جس میں اپنی بہت سی کتابوں کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔ باوجودیکہ سب چھپی ہوئی ہیں لیکن اب نہ کتب فروشوں ہی کے پاس ملتی ہیں اور نہ ہی کتب خانوں ہی میں، ان کا سراغ ملا۔

بہر حال مدت سے خیال تھا کہ اس مظلوم مولوی پر جو ظلم اہلِ علم و دین کی طرف سے ہوا ہے کچھ اس کی تلافی کی جائے اسی خیال کی تکمیل اپنے اس مضمون سے کر رہا ہوں۔

افسوس ہے کہ مولوی صاحب کی شخصی زندگی کے متعلق بھی باوجود تلاش کے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی، کب پیدا ہوئے اور کس سنہ میں کہاں وفات ہوئی، اس وقت تک ان معمولی باتوں کے جاننے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کی تفسیر ہی کے مقدمہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تعلیم انیسویں صدی کے مشہور اساتذہ سے پائی تھی خود لکھتے ہیں:

''اس فقیر اضعف عباد عبد الدہر محمد، حسن امروہوی نے طفولیت سے ارباب

Marfat.com

تحقیق واصحاب یقین کی خدمت میں تربیت پائی''۔

اسی اجمال کی تفصیل یہ کی ہے:

''فلسفہ مشائیہ واشراقیہ وعلوم کلامی عقلیہ، خدمت یگانہ آفاق مثل افضل المحققین مولانا فضل حق صاحب مرحوم خیرآبادی سے''

اسی طرح دینی علوم کے متعلق لکھتے ہیں:

''وکتب نقلیہ مثل حدیث وتفسیر استاد زمانہ مولانا مفتی صدر الدین مرحوم دہلوی سے''(۲۵)

مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم اور مفتی صدر الدین صاحب مرحوم کے علمی مقام سے جو واقف ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولوی محمد حسن مرحوم معمولی گرو کے چیلے نہ تھے، طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی لکھا ہے:

''اور طب امام الاطباء حکیم امام الدین الدہلوی مرحوم سے''

ابتداء میں طب ہی کو معاش کا ذریعہ بنایا ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے بھائی مولوی حکیم عبدالصمد مرحوم ''اودے پور میواڑ میں خاص طبیب مہاراجہ سجن سنگھ کے تھے''

غالباً اسی تعلق سے یہ بھی اودے پور ہی کے دربار سے طبی صیغہ میں وابستہ ہوگئے تھے، بیان کیا کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اجمیر شریف حاضر ہوئے اور کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد یہ بھی اودے پور پہنچے گئے۔ ''اور مہاراجہ سروپ سنگھ کے خاص طبیبوں میں منسلک ہوا''

مہاراجہ سروپ سنگھ کے بعد مہاراجہ شمبھو سنگھ سے بھی وہی تعلق طبی ملازمت کا قائم رہا، ان کے ہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کے زمانے میں جب رامپور میں مولوی صاحب کا قیام تھا ایک بزرگ جن کا نام وہی ''حضرت شاہ

Marfat.com

صاحب قبلہ وکعبہ اویسی، قادری، مصطفیٰ آبادی ثم اندوری"

بتاتے ہیں ان ہی سے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں مرید بھی ہوئے، اپنے پیر طریقت سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، اسی سے اندازہ کیجیے کہ "غایۃ البرہان" تو اپنی تفسیر کا تاریخی نام رکھا تھا لیکن عرفی نام اس کا "تفسیر حضرت شاہی" تھا۔ بیان کیا ہے:

"یہ فقیر چند سال خدمت میں (شاہ صاحب کے) حاضر رہا، بندہ نوازیان فرمائیں جو بیان میں نہ آسکیں"

اور اسی کے بعد اپنے پیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے:

"میں جو کچھ کرتا ہوں تیرے واسطے کرتا ہوں"

گویا دوسرے لفظوں میں مولوی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جن معلومات ونظریات کو اس کتاب میں پیش کیا ہے ان میں شاہ صاحب کے باطنی تصرفات کو بھی دخل ہے۔

بہر حال ریاست اودے پور کی ملازمت ہی کے زمانہ میں خود ہی بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ چھٹی لے کر اجمیر پہنچے، یہاں اس وقت تک اجمیر میں غالباً وہ کالج قائم ہو چکا تھا، جس میں صرف والیانِ ملک اور راجے رجواڑوں کے بچے تعلیم پاتے تھے، مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ اجمیر آنے کے بعد "کتب خانہ اجمیر گورنمنٹ کالج کو دیکھ کر دل للچایا"

للچانے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "جس میں ہزار ہا کتب انگریزی وسنسکرت، وعربی وفارسی زبان میں ہیں"

اور ان ہی کے ساتھ "تراجم کتب مقدسہ سابقہ اور ان کے تفاسیر موجود ہیں" (۲۶)

عربی اور فارسی زبانوں کے تو خیر مولوی صاحب عالم ہی تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودے پور میں قیام کا موقع جوان کو ملا تو ریاست کے پنڈتوں سے غالباً بھاشا اور سنسکرت بھی کچھ سیکھ لی تھی، تفسیر کے اسی مقدمہ میں سنسکرت زبان کی کتابوں کے بعض فقرات اسی زبان اور اسی کے حروف میں انہوں نے نقل کیے ہیں جن کا تذکرہ بھی ان شاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

اور گو جدید معلومات کا کافی ذخیرہ اس مقدمہ میں پایا جاتا ہے، لیکن صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان معلومات کو براہِ راست انگریزی زبان کی کتابوں کے مطالعہ سے مولوی صاحب نے فراہم کیا تھا، یا دوسرے ذرائع سے ان نئی باتوں کا علم ان کو حاصل ہوا تھا، ایک موقع پر کوہستان یورال کے میدان میں اور ن برگ نامی مقام اور اس کے گرد و نواح کے خاص حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیکھو جغرافیہ انگریزی کی بڑی بڑی کتابوں کو'' (۲۷)

اسی طرح ایک موقعہ مشہور مؤرخ ڈایوڈورس کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دیکھو مصر کی تاریخ زولن کو'' (۲۸)

اسی طرح ان کے کلام میں اس قسم کے فقرات جو پائے جاتے ہیں مثلاً:

''کتب مقدسہ کے ترجمے سو سے زیادہ زبانوں کے قریب میں کرائے گئے ہیں، جو جا بجا بہم پہنچتے ہیں، اور ان سے ہم کو واقفیت پیدا ہوئی، اور گو ان ترجموں میں ترجمہ اپنی فہم کے مطابق مترجم کرتا ہے، لیکن عہد عتیق کی اصلی کتاب کے حصص بھی کچھ ملتے ہیں اور انجیل کا یونانی ترجمہ اسلامی زمانہ سے پہلے کا ہے، اس کی نقل بہم پہنچتی ہے'' (۲۹)

بظاہر اس سے اگر یہ سمجھا جائے کہ عبرانی اور یونانی زبانوں کی کتابوں کی

Marfat.com

بھی تھوڑی بہت استعداد وہ رکھتے تھے، تو شاید یہ بے جا نہ ہو، تاہم قطعی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ واقعی حال ان زبانوں کے جاننے کے متعلق ان کا کیا تھا؟

لیکن علوم وفنون کے متعلق صاف لفظوں میں انہوں نے یہ دعوی کیا ہے:

''فقیر کو مسائل حکمت جدید وقدیم فیثاغورثی، حکمت اہلِ فارس، ومشائیہ ویونانیہ واشراقیہ وشاکنگ ہندو وویشنو، وجین مت واہل چین کے مسائل جغرافیہ وہیئت قدیم وجدید ومسائل طب میں دخل ہے'' (۳۰)

اوران کی کتاب میں جو معلومات مختلف علوم وفنون کے متعلق پائے جاتے ہیں، شاید ان کو دیکھ کر مشکل ہی سے ان کے اس دعویٰ کی..... تردید کی کوئی جرأت کرسکتا ہے۔

ان کے علمی ذوق ہی کا نتیجہ تھا کہ جب ان کے سامنے اجمیر گورنمنٹ کالج کا کتابی ذخیرہ آیا، تو جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، دامنِ اختیار ہاتھ سے چھوٹ گیا اور مادی منافع کی قطعاً پروانہ کی، انہوں نے اودے پور راج کی ملازمت کو اپنے اسی علمی ذوق پر قربان کردیا، ان کے اپنے الفاظ میں:

''کتب خانہ اجمیر گورنمنٹ کالج کا دل للچایا، تو کثیر تنخواہ ترک کرکے مدرس اول کالج اجمیر کا مقرر ہوا''۔

مدرس اول غالباً ہیڈ مولوی کا ترجمہ ہے، اس کا پتہ نہ چلا کہ تنخواہ کالج سے جوان کو ملتی تھی، اس کی مقدار کیا تھی؟ تاہم جس زمانہ کی یہ بات ہے، عام طور پر چالیس پچاس روپے سے زیادہ نہ ہونی چاہیے، کوئی شبہ نہیں کہ جو آمدنی، جو عزت وجاہ رئیس میواڑ کے طبیب خاص ہونے کی صورت میں مولوی صاحب کو میسر ہو چکی تھی، اس سے دست بردار ہو کر اس قلیل تنخواہ کو صرف علمی ذوق کے تحت قبول کرلینا ان کی زندگی ہی کا صرف نمایاں واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کا

Marfat.com

قدیم نظام لوگوں میں علم کی جس پیاس کو جس قدر پیدا کرتا تھا، جدید تعلیمی نظام نے اس کو بڑھانے کے بجائے شاید اس پیاس کو بجھا ہی دیا، یا اس جذبہ کو اتنا افسردہ و پژمردہ کر دیا کہ آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کہ محض کتابوں کے انبار کو دیکھ کر ایک کافی معزز عہدے پر لات مارنے کے لیے آدمی تیار ہو جائے، مگر مولوی صاحب نے یہی کیا، مالی اور جاہی منافع سے تو وہ محروم ہو گئے لیکن خود لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج کی ملازمت کا نتیجہ یہ ہوا:

''وہاں علوم جدیدہ و نیو سائنس کی تحقیقات حاصل ہوئی'' (۳۱)

اور گو مولوی صاحب نے اس کو جیسا کہ چاہیے ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ علاوہ علمی ذوق یا بقول ان کے ''دل للچایا'' اس کے سوا ایک دوسرا جذبہ بھی ان پر مسلط تھا، لیکن کہیں کہیں قلم سے ان کے اس قسم کی باتیں بھی ٹپکتی چلی گئی ہیں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

''یہ نازک وقت اہلِ اسلام کے اندر جو الحاد و تنفر کی اشاعت کا ہے''

فرماتے ہیں:

''ایک جہاں ہے کہ برگشتہ ہوا چلا جاتا ہے اور جا بجا انگریزی و روسی علوم (ہ) کو ترقی ہے، اور طلبہ کے خیالات جو ان کے خیالوں کے مطابق اسلام کے مخالف ہوئے جاتے ہیں'' (۳۲)

ایک طرف وہ اس حال کو دیکھ رہے تھے، اور دوسری طرف ان کو یہ نظر آ رہا تھا کہ جدید شبہات اور اعتراضات غیر اقوام کی طرف نئے علوم و فنون کی روشنی میں اسلام پر جو وارد ہو رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں جیسا کہ وہی یہ اطلاع دیتے ہوئے:

''اس پر ادھورے ناواقف ملاؤں کی طرف سے صفات لگائے جاویں جس سے بے علمی ظاہر اہل علم کے نزدیک ہو، اگر چہ جاہل خوش ہوں اور گو اصل

Marfat.com

مطلب آیات (قرآن مجید) ظاہر نہ ہو"

آگے وہی لکھتے ہیں:

"پس ناواقف اس قسم کے ملاؤں سے خوش ہوتے ہیں، جولن ترانیاں بگھاریں پر واقفین اور خاص کر مخالف بہت کچھ سبکی سے ان کو دیکھتے ہیں" (۳۳)

اسی موقع پر انہوں نے لکھا ہے کہ:

"علم نام مکابرہ ودھاندھلی کا نہیں، بلکہ واقع کے مطابق جاننے کو علم کہتے ہیں"

پھر اس زمانہ کے اکتشافات جدیدہ، اور علمی ترقیوں کا ذکر کر کے علماء کو متوجہ کیا ہے کہ پہلے ان سے واقفیت پیدا کر کے چاہیے کہ مخالفوں کا جواب دیا جائے۔

"نہ اینکہ ایسے وقت میں بھی خیالات بیہودہ پکارتے رہیں اور مضحکہ عقلاء بنیں" (۳۴)

ادھر قدیم تعلیم کے نمائندوں کی یہ کیفیت، اور اسی کے مقابلے میں اسکول اور کالج کے نئے تعلیم یافتون کی پیدائش کا سلسلہ ان ہی کے زمانہ میں جو شروع ہو چکا تھا، مولوی صاحب نے اس طبقہ کے متعلق اپنے احساسات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

"اس عرصہ میں تھوڑے سے علم جدید سے آشنا ہو کر مضامین آیات واحادیث کو اس کے مطابق جب نہیں پاتے تو نیچری ہوتے جاتے ہیں، تا آنکہ کتب حدیث کو طاق میں رکھنے کی کتابیں سمجھتے ہیں" (۳۵)

خلاصہ یہ ہے کہ سیاسی زبوں حالیوں نے صرف مسلمان ہی کو نکبت وادبار کی ٹھوکروں کا شکار بنا کر نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ مسلمانوں کے ضعف وناتوانی کو دیکھ کر اسلام بھی چاروں طرف سے مخالفوں نے گھیر لیا تھا، اور بے دردی کے ساتھ توہین

Marfat.com

اعتراضوں اور تحقیری نکتہ چینیوں کے تیروں کا نشانہ اسے بنالیا تھا، مولوی صاحب مرحوم نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلام کی شوکت کے مقابلہ میں دم مارنے کی طاقت بالخصوص ممالکِ اسلامیہ میں دوسرے کو ہوتی نہ تھی'' (۳۶)

مگر مسلمانوں کی سیاسی بے کسی نے لوگوں کو جری بنا دیا، اور انہی کی شخصی اصطلاحوں میں داریہ، ناریہ(و)، آریہ، الغرض طرح طرح کے فرقے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے اور غالباً صحیح خیال ہے:

''اسلام اور قرآن ہی کے چرچے نے آریہ کو جگایا کہ منہ سے خدا کو ایک کہنے لگے'' (۳۷)

اور اسی بنیاد پر مورتی پوجا کی مخالفت میں سرگرمی دکھانے لگے، ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''قرآن مجید سے وہ توحید جاری ہوئی کہ ایک جہان جو بت پرستی و آفتاب و ماہتاب پرستی، مسیح پرستی، ہابیل پرستی، و ملائکہ و جن پرستی، و بھوت پرستی، میں گرفتار تھا، ان کو کنارۂ توحید پر لگا دیا اور بت پرستوں کو جگا دیا'' (۳۸)

پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ قرآن کی یہ برکت کسی خاص ملک اور قوم ہی کی حد تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ ''خواہ یورپ میں خواہ افریقہ میں خواہ امریکہ میں'' جہاں کہیں جاؤ گے تم کو اس اسلامی اور قرآنی برکت کے آثار محسوس ہوں گے، حتی کہ آریہ کے ساتھ فرقہ داریہ کے متعلق فرماتے ہیں:

''قرآن کی بدولت ہے کہ جو کہ مسیح کو بیٹا خدا کا کہنے سے نصاری شرماتے ہیں'' (۳۹)

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان مین جن ایجادی نادر نمائیوں کا تماشہ

Marfat.com

یکے بعد دیگرے ہو رہا تھا، ان کو دیکھ دیکھ کر عوام و خاص سب ہی متاثر تھے، مولوی صاحب بھی اس تاثر میں گو دوسروں کے شریک بن کر، ایک موقع پر یہ لکھتے ہیں کہ:

''پہاڑوں پر ان کا (یورپ والوں کا) زور اور سمندر پر''

آگے بیان کرتے ہیں:

''واقف کے نزدیک کہا نہیں کہ ایک اندور سے حیدرآباد تک پیش مقام کے قریب پہاڑوں کو برما کے اندر سے ریل لے گئے ہیں کہ اوپر نیچے پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور سمندر کو کوسوں تک پاٹ دیتی ہے'' (۴۰)

حیدرآباد کا لفظ کتاب میں چھپا ہوا ہے، غالباً بمبئی کی جگہ غلطی سے حیدر آباد کا لفظ قلم سے نکل گیا ہے، کیونکہ یہ ٹینل جنہیں دکن والے مفیدے کہتے ہیں، بمبئی ہی کے راستے میں زیادہ بنائے گئے تھے، اور گوان کی تعلیم کلیتہً قدیم ماحول میں ہوئی لیکن غیروں کے علمی و ذہنی کمالات کے اعتراف میں تنگ دلی سے انہوں نے کہیں کام نہیں لیا ہے۔ مثلاً جغرافیہ کے علم کی تکمیل و تحقیق میں یورپ والوں نے جو کام کیا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس عرصہ میں جغرافیہ کی تحقیقات ایسے درجہ کو پہنچی ہے کہ مثل ہے کہ ''مزید بران متصور نہ باشد''

اور وہ اس کے بھی قائل ہیں:

''بیشک، تطبیق مسائل عقل و نقل عمدہ شے ہے، جہاں تک بہم پہنچے'' (۴۱)

مگر اسی کے ساتھ وہ اس پر بھی لوگوں کو متنبہ کرتے چلے گئے ہیں کہ نتائج ہر علم کے ضروری نہیں کہ یقینی ہی ہوں، بلکہ زیادہ تر عقلی علوم کے نظریات تخمینی ہوتے ہیں، مثلاً طب کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ بیان کرتے ہیں:

''طب کے تجربے جو ظنیہ ہیں ان کے خلاف کرنے میں باک نہیں، لیکن جو

Marfat.com

یقینی بات ہواس میں مخالفت بڑی سبکی کی بات ہے''(۴۲)

آگے وہی لکھتے ہیں:

''بدین وجہ ہم نے کہا ہے کہ جیسے بہت سے قیاسات وتجربے اطباء ہنود غلط ہیں.....ویسے ہی یونانی وڈاکٹری''(۴۳)

بہرحال گو ہمارے اس مظلوم مولوی نے پرانے مذاق کے مولویوں ہی سے ان ہی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی تھی، جن کے پڑھنے پڑھانے کا رواج مسلمانوں کی پرانی درسگاہوں میں تھا، لیکن اپنی ذاتی جدوجہد اور مطالعہ محنت سے یورپ کے جدید افکار وخیالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی باخبر تھے۔ اسلام اور مسلمانوں پر، مسلمانوں کی تاریخ پر، اعتراضات اور تنقیدوں کا جو نیا سلسلہ یورپ کی جدید علمی نشأت میں جاری ہوا تھا، صرف انہی سے وہ واقف نظر نہیں آتے، بلکہ کائنات کے متعلق جو قدیم طریقہ تصور تھا، اور اس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اصلاح مغربی حکماء کی طرف سے ہوتی چلی آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے کی کوشش میں وہ سرگرم تھے۔

ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی تفسیر کے اس مقدمہ میں علم کلام اور تصوف کے پرانے مباحث مثلاً اثباتِ واجب، توحید، وحدت وجود، وحدتِ شہود، مثال، حشر ونشر، جنت ونار، ملائکہ، جن، رسالت، وحی وغیرہ کے ساتھ ساتھ تعدد ازدواج، غلامی، جہاد جیسی چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے، حد یہ ہے کہ ان ہی جدید وقدیم مہمات کے انبار میں آپ کو اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے کے اس الزام کا تذکرہ بھی ملے گا، جو مسلمانوں کی تاریخ پر یورپ والوں کی طرف سے لگایا گیا تھا، یہ لکھ کر:

''یہ امر محض غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ کا قدیم کتب خانہ

Marfat.com

جلا دیا''

اپنے خیال کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

''جیسے گبن وسینٹ کرائی، دیلوٹارک، اس کی تصریح کرتے ہیں، بلکہ کتب خانہ مذکور سیزر قیصر کے وقت جلایا گیا'' (۴۴)

جس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا یورپین مصنفین کی کتابوں یا ان کے تراجم کے مطالعہ کا مصنف کو موقع ملا تھا؛ کچھ بھی ہو، انیسویں صدی کے ایک ہندوستانی مولوی کی تفسیر میں گبن اور دیوٹارک کے ناموں کا تذکرہ ہی بتاتا ہے کہ مولویوں کا جو عام ماحول اس زمانہ میں تھا اور اسی ماحول میں محدود رہنے کا جو غلط رجحان لوگوں میں پایا جاتا ہے، کم از کم ہمارے اس مظلوم مولوی کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ بیسویں صدی میں جن نظریات کو یورپ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے، انیسویں صدی کے اس مولوی کے کلام میں ان کی طرف بھی اشارے پائے جاتے ہیں، مثلاً یہی آواز یا صوت کا مسئلہ ہے۔ قدیم فلسفہ میں آواز کو غیر قار ٹھہرایا گیا ہے، یعنی پہلا جزء جب تک اس کا معدوم نہ ہو جائے، اس وقت تک دوسرا جزء موجود نہیں ہوسکتا۔ برعکس اس کے آج یہ مسئلہ عام ہو چکا ہے کہ ہر پیدا ہونے والی آواز فضا میں موجود ہے، چاہا جائے تو ہزار ہا ہزار سال کی تقریروں کو بھی اس زمانہ کا آدمی سن سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے بعض اربابِ کشف آج سے صدیوں پہلے اسی دعوی کا اعلان کر چکے تھے، شیخ ابن عربی اندلسیؒ جن کی وفات ۶۳۸ھ، بمطابق ۱۲۴۰ء یعنی تقریباً سات سو سال پہلے ہو چکی تھی، اپنی مشہور کتاب فتوحات مکیہ میں یہ ارقام فرماتے ہوئے:

''و هذا الحروف لا یزال فی الهواء یمسک علیها شکلها''(۴۵)

''یہ حروف (جو منہ سے نکلتے ہیں) ہمیشہ ان کی شکل ہوا میں قائم ودائم رہی ہے''۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

''الاشکال اللفظیة فی محل لا یقبل ذلک و لهذا کان لها البقاء''۔(۴۶)

''الفاظ کی صورت و ہیئت جس چیز میں جا کر قائم ہو جاتی ہے، چونکہ وہ زوال پذیر نہیں ہے، اس لیے الفاظ کی صورت اور ہیئت ہمیشہ باقی رہتی ہے''۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار فرماتے ہیں:

''فالجو کله مملوء من کلام العالم''(۴۷)

''ساری فضا دنیا والوں کی باتوں سے بھری ہوئی ہے''

اور اسی حقیقت تک آج سائنس بھی پہنچ چکی ہے، شیخ نے لکھا ہے کہ ساری فضا کا دنیا والوں کی باتوں سے مملو اور بھرا ہوا ہونا، یہ ایک ایسا واقعہ ہے:

''یراه صاحب الکشف صوراً قائمة''(۴۸)

''کشف کی قوت رکھنے والے، آوازوں کی صورتوں کو فضا میں قائم و دائم پاتے ہیں''۔

خیر یہ تو شیخ اکبر کا ایک کشفی نظریہ ہے، اسی فتوحات مکیہ کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے، یہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے مظلوم مولوی نے اپنے مقدمہ تفسیر میں شیخ اکبر کے اسی نظریہ کا تذکرہ کرتے ہوئے، اور یہ کہتے ہوئے کہ قرآنی آیت:

﴿ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید﴾(۴۹)

''نہیں بولتا ہے کوئی بات مگر اسکے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے''

سے بھی آدمی کا ذہن اس مسئلہ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

آگے وہی لکھتے ہیں:

''قیام آواز موجود ہوائی کا، اس وقت میں آلہ حفاظت آواز سے ظاہر ہوا ہے''۔(۵۰)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آواز کے اس جدید نظریہ سے یورپ والوں کے وہ واقف تھے، حالانکہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ نئی باتوں کے جاننے کا غیر معمولی جذبہ ان میں جو بھڑک اٹھا تھا، اس کے سوا اس قسم کی واقفیتوں میں اور کس چیز کو دخیل مانا جائے۔

اسی طرح آج کل یورپ والوں نے اپنی تنقید کے لیے اسلام کے جن مسائل کا انتخاب کر رکھا ہے، جن میں وہی تعدد ازدواج، غلامی، جہاد کے سہ شاخے کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اگرچہ ان میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اسلام کے ساتھ کسی قسم کی خصوصیت رکھتا ہو۔ دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب یا مذہبی قوم ایسی ہوگی جس کا دامن ان دھبوں سے پاک ہو، بشرطیکہ ان کو واقعی انسانیت کے دامن کا دھبہ قرار دیا جائے، مگر اسلام ہی کو نشانہ بنا کر دو سو سال سے پلٹ پلٹ کر اعتراض کرنے والے ان ہی کو دہرا رہے ہیں، جواب دے دیا جاتا ہے مگر جب دیکھیے اسلام کے مقابلہ میں صلیبی محاذ سے اسی سہ شاخے (تعدد ازدواج، غلامی، جہاد) کو لیے ہوئے لوگ حملہ کر رہے ہیں۔ پہلے اس صلیبی ہتھیار کو پادری استعمال کرتے تھے، اور اس زمانہ میں تحقیق و ریسرچ کی نقاب ڈال ڈال کر ان ہی پادریوں کی اولاد داد تحقیق دے رہی ہے۔

بہرحال معمولی لفظی ردوبدل کے ساتھ پیش کرنے والے کا انتہائی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کے ساتھ اسی کو اس طرح پیش کرتے رہتے ہیں کہ گویا ان کا کوئی جواب مسلمانوں کی طرف سے کبھی دیا ہی نہیں گیا تھا۔

Marfat.com

کچھ بھی ہو جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہمارے مظلوم مولوی نے ان سوالوں کو بھی چھیڑا ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر تعبیری سقامت اور بیانی ژولیدگیوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد لکھنے والوں کی طرف سے شاید مشکل ہی سے کچھ اضافہ ہوا ہو، بلکہ تعدد ازدواج کے مسئلہ میں منجملہ دوسری باتوں کے اعداد و شمار والے جدید یورپین طریقہ استدلال کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ لکھا ہے:

''بحساب مردم شماری ایک ارب چالیس کروڑ میں گیارہویں حصہ عورتیں زیادہ ہیں، تو قریب بارہ کروڑ عورتوں کے جو فاضل رہیں، اگر مرد کو بشرط عدالت دوسرا نکاح درست نہ ہو تو وہ بیچاری کیا کریں''۔ (۵۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اعداد و شمار کا طلسم قائم کر کے اس سے نتائج پیدا کرنے کا جو شوق یورپ والوں پر مسلط ہے، ہمارے اس مظلوم مولوی نے استدلال کے اس جدید طریقہ کو بھانپ بھی لیا تھا اور اس سے کام لینا بھی شروع کر دیا تھا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ان کی بعض چابک دستیاں بڑی دلچسپ ہیں۔ ہیرے کے متعلق یورپ کے اربابِ سائنس نے یہ مشہور کیا تھا کہ معدن زغال کے گیس سے ہر ہیرا تیار ہوتا ہے، گویا کہ صاف و شفاف گیس کا نام ہیرا ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے اسی کو بنیاد بنا کر سارے فلکی اجرام کی تخلیق کی جو توجیہ کی ہے، وہ سننے کے قابل ہے، اتنی بات تو لوگوں کو معلوم ہے کہ قرآن میں آسمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿ثم استوی الی السماء وھی دخان﴾ (۵۲)

''پھر خدا آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور آسمان دھواں گیس ہے''

Marfat.com

مظلوم مولوی نے اسی قرآنی مقدمہ کو پیش کر کے لکھا ہے:

''ظاہر ہے کہ تاروں کا مادہ دخان (گینس) ہے جیسے اس عرصہ میں (بمعنی ہمارے زمانہ میں) ہیرے کا مادہ دخان (گیس) ظاہر ہوا ہے، جو شفاف ہوتا ہے''۔ (۵۳)

یہ بھی ان ہی کا دعوی ہے:

''آفتاب و ماہتاب ثوابت دخان سے بنائے گئے ہیں جیسے ہیرا دخان سے بنتا ہے''۔

پھر اس سوال کا جواب یعنی آسمان جب صرف گیس اور دخان ہے، تو قرآن میں سات طبقات میں اس کو جو تقسیم کیا گیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، مظلوم مولوی نے اس سلسلہ میں یورپ ہی کے فلکیوں کے ایک نظریہ کو پیش کر کے اس کا جواب دیا، انہوں نے لکھا ہے:

''حکمت جدید والے چھ درجات اس کے (یعنی آسمان) کے بہ نظر قلت و کثرت روشنی کے کرتے ہیں''۔

مطلب یہ ہے کہ فضا کا وہ حصہ جو تاروں سے بھرا ہوا ہے، فلکیات کے مغربی حکماء نے یہ دیکھ کر کہ بعض حصہ فضاء کا زیادہ روشن ہے، اور بعض میں روشنی کم ہے، الغرض روشنی کی کمی بیشی سے انہوں نے چھ درجوں میں آسمان کو بانٹا ہے، مظلوم مولوی نے تسلیم کر لیا کہ قرآن کے دخانی آسمان کے چھ طبقات تو یوں نکل آئے، باقی ساتواں طبقہ سو اس کے متعلق یہی لکھتے ہیں:

''نیچے والے میدان کے روشن تاروں کو (قرآن میں) آسمان پائیں ﴿السماء الدنیا﴾ فرمایا جس کے اندر کارخانہ سورج اور اس کے سیاروں ہے''۔ (۵۴)

عبارت میں یہاں کچھ گنجلک سے رہ گئی ہے، بظاہر ان کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ چھ طبقات جو روشنی کی کمی و بیشی سے پیدا ہوئے ہیں، وہ فضا کے اس حصہ

Marfat.com

سے الگ ہیں جس میں ہمیں تارے جگمگاتے نظر آتے ہیں، اور سورج اپنے اردگرد گردش کرنے والے سیاروں کے ساتھ اسی میں قائم ہے، گویا آسمان کے متعلق یونانیوں کا جو نظریہ تھا کہ ٹھوس قسم کے اجرام ہیں اور ستارے ان میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس کو قرآن کے مخالف قرار دے کر قرآن کے دخانی نظریہ اور فلکیات کے مغربی حکماء کے خیال میں تطبیق کی شکل پیدا کر دی گئی ہے اور آسمان کے جرمی وجود کے متعلق ہندوستان کے مدرسوں میں جو شور وغل مغربی خیالات کی وجہ سے مچا ہوا تھا، مظلوم مولوی نے اپنے نزدیک مذکورہ طریقہ سے گویا اس کا فیصلہ کر دیا تھا۔

اسی سلسلہ میں سال و ماہ کے حساب میں قوموں کا مذاق شمسی اور قمری ہونے کے حساب سے جو مختلف ہے، ہمارے مظلوم مولوی کا یہ لطیفہ کافی دلآویز ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عموماً نباتات اپنی نشو ونما میں بھی اور پھلنے پھولنے میں بھی آفتاب کی حرارت کے محتاج ہیں، لیکن اسی کے بالمقابل یہ دیکھا جاتا ہے کہ مظلوم مولوی نے لکھا ہے:

''نو ماہ قمری میں اس (آدمی) کے حمل کی تعداد اور حیض ونفاس میں ماہ قمری کا حساب ہے''۔

بظاہر ان کی غرض یہ ہے کہ انسانی وجود کی پیدائش کا سلسلہ جن قدرتی قوانین کے تحت جاری ہے، یعنی حمل حیض ونفاس وغیرہ، چونکہ بجائے شمسی حساب کے قمری حساب کا تابع ہے، اس لیے وہی لکھتے ہیں کہ جن قوموں میں ''انسانیت زیادہ ہے ان کے ہاں اب تک حساب قمری کا شمار ہے'' (۵۵)

امراض اور وباؤں کے متعلق عموماً قدیم اطباء قائل تھے کہ کہ مادی عفونت یا مادہ کی سڑاند کے یہ نتائج ہیں، گویا کسی زندہ وجود کی طرف ان بیماریوں کو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جراثیم کا نظریہ جو انیسویں صدی میں شاید قطعی فیصلہ کی صورت

Marfat.com

اختیار نہ کر سکا تھا، لیکن ہمارے مظلوم مولوی تک اس کی خبر پہنچ گئی تھی، انہوں نے جراثیم کے اسی نظریہ کی پشت پناہی میں جن کے عقیدے کی تائید کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس وقت میں تحقیقات فرانس نے ظاہر ہوا ہے کہ بہت چھوٹے چھوٹے کیڑے جو سیر بین (خوردبین) سے بہ مشکل دریافت ہوتے ہیں، وہ دل میں گھس کر وبا کے باعث ہوکر باعث ہلاکت انسان ہوتے ہیں''۔(۵۶)

اس سلسلہ میں مظلوم مولوی نے اس قرآنی آیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جس میں فرمایا گیا ہے:

''ہم نے جن کو نار سموم سے پیدا کیا ہے''(۵۶،الف)

ان کا خیال ہے کہ سموم کا لفظ سم سے ماخوذ ہے، جس کے معنی زہر ہیں اور یہی زہر ان ہی نادیدہ مخفی ہستیوں میں چھپا رہتا ہے، جنہیں آج کل جراثیم کہتے ہیں اور بنی آدم کو وہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ بہر حال بجائے مردہ مادہ کے اتنا تو بہر حال تسلیم کر ہی لیا گیا کہ ان وبائی امراض میں پوشیدہ زندہ ہستیوں کے بکھیڑے کو دخل ہے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ پھر مذہبی روایات میں اگر جنی آسیب کا ذکر آتا ہے، تو لفظی فرق کے سوا واقعہ کی نوعیت میں اب اختلاف ہی کیا باقی رہا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح و شام وہ اسی قسم کے معلومات کی جستجو اور تلاش میں رہتے تھے۔ ان کے زمانہ میں یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی کہ جزیرۂ جاوا میں ایک ایسا زلزلہ آیا کہ سو میل تک زمین شق ہو گی، اسی خبر کو بنیاد بنا کر اور یہ کہ جیسے زمین نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے، اسی طرح چاند بھی اسی نظام کا ایک سیارہ ہے، تو شق قمر کے معجزہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں ''کیا بعید ہے کہ سو میل تک جاوہ کی زمین پچھلے دنوں شق ہو گئی تھی'' (۵۷)

Marfat.com

ان کے زمانہ میں گنے چنے ہندوستان میں چند اخبار جو نکلتے تھے، عام مولویوں کی روش کے خلاف ان اخباروں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پڑھا کرتے تھے، اپنی کتاب مین اودھ اخبار، سراج الاخبار وغیرہ کا مختلف مقامات میں حوالہ بھی دیا ہے اور اپنے کام کی چیزیں ان اخباروں سے چن لیا کرتے تھے، حضرت نوحؑ کی عمر کی غیر معمولی طوالت پر بحث کرتے ہوئے اور یہ بیان کرتے ہوئے کہ عمریں عموماً جسمانی حالت کی استواری وقوت کی تابع ہوتی تھیں، جس زمانہ میں آدمی کے ہڈے پنجے، ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء آج کل کے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے اور زیادہ مضبوط ہوتے تھے، تو عمریں بھی ان کی جسمانی قوت کے مطابق موجودہ عمروں سے زیادہ ہوتی تھیں۔ پھر اس مقدمہ کے ثبوت میں کہ آج کل کے لحاظ سے پہلے زمانہ کے لوگوں کی جسمانی حالت مختلف تھی، یہ خبر دیتے ہوئے کہ ''اودھ اخبار، ۱۷ر جون ۱۸۹۰ء لکھا میں لکھا ہے''۔

ہمارے مظلوم مولوی نے معلومات کا کافی ذخیرہ اس سلسلہ میں جمع کر دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک آدمی کی ہڈی لندن بھیجی گئی ہے، جس میں ایک ڈاڑھ بیس سیر لکھی ہے اور اس عہد قیصرۂ ہند (ملکہ وکٹوریہ) میں نہرِ سرہند کے مابین ایک ندی سے آدمی کی کھوپڑی نکلی ہے جو ہاتھی کی کھوپڑی کے برابر ہے۔ اسی سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ کی اس خبر کو بھی درج کیا ہے کہ ۷۷۲ھ میں سرہند ہی کے قریب ایسی ہڈیاں آدمیوں کی برآمد ہوئیں جن میں ہاتھ کی ہڈیاں تین گز کی تھیں (۵۸) اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنے وطن امروہہ کے متصل قصبہ جس کا نام کانٹہ ہے، اسی کانٹہ کی ایک قبر کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''میرے عزیز منشی عبدالرحمٰن جو بڑے معتمد وثقہ ہیں''

یہ خبر ان کو سنائی: ''قبر برسات میں کھلی دیکھی جن کی ساق (پنڈلی کی ہڈی)

Marfat.com

بوسیدہ تین گز کی تھی''۔

بہر حال ان معلومات کی روشنی میں دعویٰ کیا ہے:

''عمریں بقدر قد و قامت تھیں''

اسی طرح شداد والے باغ کے سلسلے میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ ریگستان میں اس قسم کے باغ کے غائب ہو جانے پر تعجب نہ کرنا چاہیے انہوں نے اجمیر شریف کے قریب کچاون نامی قصبہ کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے:

''کچاون اجمیر شریف سے پچیس کوس کے فاصلہ پر وہاں کے ایک سیٹھ نے کنواں کھدوایا جس میں ستر پچھتر ہاتھ نیچے کوئلی اور اونٹ کی مینگنی نکلی ہے''۔(۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ پڑھتے دیکھتے اور سنتے تھے چاہتے تھے کہ اس سے اسلام اور اسلامیات کی تائید و نصرت کا پہلو پیدا کر لیا جائے، یہ الگ مسئلہ ہے کہ اپنی اس کوشش میں واقعی وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ پہلے بھی حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی تنقید ان کے اقوال کے متعلق نقل کر چکا ہوں کہ ''حق و باطل ہر قسم کی باتوں کے سامنے جھک جانے'' کا عیب ان میں پایا جاتا تھا، لیکن نیت اس مظلوم مولوی کی بہر حال نیک ہی معلوم ہوتی ہے، بلکہ دین کی خدمت کا یہ جذبہ کہا جا سکتا ہے کہ قابلِ رشک ہے اور اس قابل ہے کہ دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت کا سبق بن جائے۔

بعض مواقع میں وہ چھوٹی چھوٹی عام اور مشہور باتوں سے ایسے نتائج پیدا کر لیتے ہیں کہ بے ساختہ ان کے ذہنی انتقال پر دل داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کرۂ ارض کی مشہور پرانی تقسیم جس میں ریاضی کے قاعدے سے زمین کو ہفت اقلیم میں بانٹا جاتا تھا، یورپ والوں نے اس کے مقابلہ میں ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ والی تقسیم کو زیادہ شہرت دے رکھی ہے۔ اگرچہ بذاتِ خود یہ تقسیم نئی نہیں

Marfat.com

ہے بلکہ پرانی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ یورپ والوں کی مشہور کی ہوئی اسی تقسیم کا تذکرہ کرتے ہوئے ''ایشیا'' کے لفظ کو وہ ''عیشیا'' کی صورت میں لکھتے ہیں۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ عیش یعنی زندگی گذارنے کا صحیح مقام چونکہ ایشیا ہی تھا، عموماً معتدل اقالیم جہاں آفتاب کی روشنی اور حرارت سے مستفید ہونے کے زیادہ مواقع میسر ہیں۔ اس لیے اصلی نام اس کا ''عیشیا'' تھا۔ بعد کو یہی نام ایشیا کے نام سے مشہور ہو گیا ہے تو ایک لفظی لطیفہ لیکن دلچسپ ضرور ہے۔

ان کی کتاب میں اس قسم کے چٹکلوں کی کافی تعداد پائی جاتی ہے، ایک موقع پر یہ لکھتے ہیں:

''حیوانوں کی غذا نباتات اور اشجار اور نبات کی غذا جمادات، جمادات کی غذا عناصر، عناصر کی غذا اکسوجن و ہیڈروجن (و) وغیرہ ہیں کہ ہر ایک بطور طبعی مناسبت و قربت کے جیسے علم طب سے ظاہر ہے، اپنے میں محو کر لیتا ہے''

اور اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں:

''ان میں سے انسان ہے جس کی غذا طبعی حیوانات طیبات ہیں'' (۶۰)

یوں مسئلہ اکل لحم (گوشت خوری) کو قدرت کا ایک طبعی امر قرار دینے میں اپنے آپ کو وہ حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔

ان کے ذہنی انتقال کی ایک دلچسپ مثال شاید وہ بات بھی ہو سکتی ہے جو آدم و حوا کے قصہ کی تفصیل میں ان کے قلم سے نکل گئی ہے، ان کا خیال ہے کہ شجرہ جس کے معنی باہم گتھ جانے کے بھی ہیں، قرآن میں ﴿فیما شجر بینھم﴾ کے الفاظ کا مطلب یہی کہ باہمی آویزش والے جھگڑوں میں ان کو چاہیے کہ پیغمبر کو حکم بنائیں۔

Marfat.com

الغرض لفظ الشجرہ کی اس لغوی تشریح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مظلوم مولوی نے دعویٰ کیا ہے کہ مقاربت اور مجامعت یعنی ہم بستری سے دونوں کو منع کیا گیا تھا، روایتوں میں الشجرہ کے متعلق جو یہ دو مختلف باتیں آئی ہیں، یعنی بعضوں میں گیہوں اور بعضوں میں کہا گیا ہے کہ وہ انگور کا درخت تھا، ہمارے مظلوم مولوی کا خیال ہے کہ دونوں روایتیں صحیح ہیں اور مطلب یہ تھا:

''مرد کی طرف سے مشبہ بہ انگور اور عورت کی طرف سے مشبہ بہ گندم'' (۶۱)

استعارے کے رنگ میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿فبدت لهما سوآتهما﴾ (۶۱ الف) (پس کھل گئیں دونوں کی شرمگاہیں) کی اطلاع ﴿فلما ذاقا الشجر﴾ (۶۱ ب) (جب چکھ لیا باہمی آویزش کا مزہ دونوں نے) کی خبر کے بعد جو دی گئی ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے ان ہی قرآنی آیتوں کو اپنے خیال کا تائیدی قرینہ قرار دیا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ اہلِ علم کے لیے یہ خیال کس حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے، خود خاکسار کے نزدیک تو قرآن کی ایسی باتیں جن کی تشریح نہ قرآن ہی میں کی گئی ہو اور نہ صحیح حدیث میں ان کا مطلب بیان کیا گیا ہو ان کو اجمال ہی کی حالت میں چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے ورنہ اپنے جی سے تو کہنے والے طرح طرح کی باتیں کہہ سکتے ہیں (ز)۔

میری غرض تو صرف یہ ہے کہ خواہ بات مانی جائے یا نہ مانی جائے لیکن گندم و انگور والی مختلف روایتوں میں تطبیق کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہے۔ اگرچہ واقع کے رو سے گندم والی روایت ہو یا انگور والی دونوں ہی محدثین کی معیار سے گری ہوئی روایتیں ہیں۔ لیکن ان کا ذہنی انتقال قابلِ تعریف ہے اور صرف یہی دکھانا میرا مقصود ہے۔

اور یہ قصے تو ان کی علمی جستجو ذہنی رفتار کی خصوصیتوں کے متعلق تھے۔ لیکن

Marfat.com

ان کی علمی زندگی کا سب سے اہم ترین موضوع جیسا کہ میں پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں، درحقیقت بائبل کا گہرا مطالعہ اور قرآنی بیانات کی توضیح وتشریح میں اس سے استفادہ ہی ہمارے مظلوم مولوی کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ علمائے اسلام میں جہاں تک خاکسار جانتا ہے اپنے زمانہ کی حد تک شاید وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ براہِ راست تورات وانجیل دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوبہ کتابوں کے مطالعہ کرنے والے سلف میں بھی کچھ لوگ گزرے ہیں۔لیکن اول سے آخر تک قرآن کا مطالعہ بائبل کو سامنے رکھ کر یا بائبل کا مطالعہ قرآن کو سامنے رکھ کر میں تو نہیں جانتا کہ ہمارے مظلوم مولوی سے پہلے کسی عالم نے کیا ہو، ان کے بعد اس میں شک نہیں کہ بعض دوسرے بزرگوں کو بھی اس کی توفیق ہوئی اور اس کا دعویٰ اگر کوئی کر گزرے کہ اس کی توفیق کا تحریکی نمونہ مظلوم مولوی ہی کا طرزِ عمل بنا ہو، تو مشکل ہی سے اس کی تردید ہو سکتی ہے، بلکہ کافی قرائن ایسے پائے جاتے ہیں جن سے اس دعویٰ کی گونہ تائید ہی ہوتی ہے۔مثلاً ''والتین والزیتون'' کے قرآنی الفاظ ہی کو دیکھیے جن کی قسمیں سورہ والتین میں کھائی گئی ہیں۔سمجھا جاتا ہے کہ انجیر اور مشہور روغنی درخت زیتون کے ساتھ ان الفاظ کی کتابوں میں جو تفسیر کی جاتی تھی، بجائے اس کے نبوت کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے دو مقامات کا نام ان کو قرار دینا اس زمانہ کا نیا انکشاف ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کے اعلان سے پہلے بے چارے اسی مظلوم مولوی نے یہ لکھتے ہوئے:

''تین و زیتون و طور سینین و بلدامین کے باہم ربط دریافت نہیں ہوتے، اس کو کتب سابقہ (بائبل) سے دریافت کرنا چاہیے''۔پھر اپنا بیان ان الفاظ میں درج کیا ہے:

''کوہ تین پر مسیح علیہ السلام نے ﴿مثلھم فی الانجیل﴾ کی تفسیر بکمال خوبی فرمائی ہے، جیسے فصل پنجم متی میں مراد اس پہاڑ سے جس پر مسیح حسب فصل

Marfat.com

مذکور چڑھے"۔

آگے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یہی پہاڑ کوہ تین ہے، وہی لکھتے ہیں:

"وہ (یعنی کوہ تین) پندرہ میل بیت المقدس سے ہے"۔(۶۲)

اسی طرح کوہ زیتون کا بھی پتا بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ طور سینین کا تعلق حضرت موسیٰؑ سے اور البلد الارض یعنی مکہ معظمہ کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ظاہر ہے۔

میں اس وقت یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ کوہ تین یا کوہ زیتون کا جو نشان اور پتہ مظلوم مولوی نے دیا ہے، یہ کس حد تک صحیح ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ بجائے نباتاتی اشیاء کے نبوت کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے مقامات کی تعبیر ان الفاظ کو قرار دینا، اور بائبل کے حوالوں سے اس راہ میں استفادہ، یہ آواز پہلی دفعہ ان ہی کی اٹھائی ہوئی ہے۔

کچھ بھی ہو قرآن اور بائبل کے تقابلی مطالعہ میں پرانے مذاق کے اس پرانے مولوی نے غیر معمولی جانکاہیوں اور جگر کاویوں سے کام لیا ہے۔ قدیم وجدید عہد ناموں کی ایک ایک کتاب کا معلوم ہوتا ہے کہ حرف حرف ان کی نظروں سے گذرا ہوا ہے اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا، نتائج پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان کے نکالے ہوئے بعض نتیجے تو آدمی کی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ یہی جمعہ، اتوار، سنیچر کے احترام وتقدیس کا مسئلہ جو مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں کے دین کا مشہور اختلافی جز یہ ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے یہ تنقیح قائم کر کے کائنات کی آفرینش وتحقیق کے سلسلہ میں "سبت" کا یعنی فراغت کا دن کون سا ہے؟ اصلی سوال یہی ہے، پھر انہوں نے یوحنا کی انجیل کی فصل ۱۹ آیت ۳۱ کے اس فقرہ کو پیش کر کے حضرت مسیح علیہ السلام کو جس دن سولی دی گئی تھی، وہ سبت کا دن تھا اور جیسا کہ ان ہی انجیلوں میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے گرفتار ہونے سے پہلے

Marfat.com

حواریوں سے کہہ دیا تھا:

''ضرور ہے کہ ابنِ آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جائے اور مصلوب ہو، اور تیسرے دن جی اٹھے''۔

یہ اور اس کے سوا انجیلوں ہی کے دوسرے بیانوں کی روشنی میں ہمارے مظلوم مولوی نے دعویٰ کیا ہے کہ مسیح علیہ السلام عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق:

''شب سبت، شب شنبہ و شب اتوار قبر میں رہے اور اتوار کی آخر شب میں قبر سے نکالے گئے''۔(۶۳)

اسی کو پیش کر کے انہوں نے لکھا ہے:

''اس حساب سے روز سبت جمعہ ہوا''۔(۶۴)

واقعہ یہ ہے کہ اتنی کھلی ہوئی واضح بات ہے کہ کم از کم انجیل پر ایمان رکھنے والے عیسائی اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ سبت کا دن دراصل جمعہ ہی کا دن تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک یہودی بھی جمعہ ہی کے دن کو سبت کا دن مانتے تھے، پھر خدا ہی جانتا ہے کہ بجائے جمعہ کے سنیچر کے دن کے احترام پر کس نے ان کو مجبور کیا، اور عیسائیوں کے متعلق تو معلوم ہی ہے کہ رومی بت پرستوں نے دین عیسوی جب قبول کیا تو اپنے آبائی اور موروثی دین کی چند خصوصیات کو عیسائی مذہب میں انہوں نے شریک کر لیا تھا جن میں ایک (Sunday) یا یوم الشمس کا یہ دن اتوار بھی ہے۔ رومی متھر یا مہر یعنی آفتاب کو پوجتے تھے اور اسی تعلق سے آفتاب کا یہ دن ان کے ہاں محترم و مقدس سمجھا جاتا تھا (ح)۔

کچھ بھی ہو، بائبل کے مطالعہ کا والہانہ ذوق اور قرآنی آیات کی بائبل کے مضامین میں سے تشریح و تفسیر کے اس شوق میں جہاں بہت سے کارآمد اور مفید نتیجوں تک وہ پہنچے ہیں وہیں افسوس کے ساتھ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مزادلت و ممارست

Marfat.com

کی کثرت وشدت کی سہولت موجودہ بائبل کے مضامین ومشتملات کی بے جاوکالت وحمایت میں ان کا قدم اغراق وغلو کے حدود سے بھی جہاں تک میرا خیال ہے آگے نکل گیا ہے، یوں جب وہ محو ہوش کی حالت میں رہتے ہیں، تو اقرار کرتے ہیں:

''میں یہ نہیں کہتا کہ کتب مذکورہ (یعنی بائبل کے مجموعہ میں جو کتابیں شریک ہیں) ان میں تحریف وتبدیلی نہیں ہوئی ہے''۔(۶۵)

''حق'' کے ساتھ ''باطل'' کی تائید وحمایت کی یہی مثالیں ہیں، اس باب میں ان کا غلو یقیناً ظلم کے حدود تک پہنچا ہوا ہے اسی سلسلہ میں میں تو حیران ہوکر رہ گیا جب سینٹ پال جیسی ذات بزرگ کے متعلق پہلی دفعہ ان کی کتاب میں مدح وستائش کے یہ الفاظ پڑھے:

''پولوس مقدس درحقیقت بڑا مجتہد عظیم الشان شخص ہے''

اور یہ کہ وہ: ''بڑے زبردست عالم یہودی تھے، ان کا حال یوحنا کا سا ہے کہ پہلے سخت نصاری، مسلمانوں کے دشمن تھے، پھر ایمان لاکر کیسے کیسے امور نمایاں کیے ویسے ہی پولوس یہودی تھے اور نصاریٰ کے پہلے دشمن تھے پھر کیسے کیسے امور ان سے نمایاں ہوئے''۔

اور یہ بھی پولوس ہی کے متعلق آپ کی رائے ہے:

''ان کے نامہ (خطوط) ہر چند وحی کے طور پر نہیں ..... پر بڑے باریک ہیں''۔(۶۶)

گو اسی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف دبے لفظوں میں کیا ہے کہ ان کے بزرگ سینٹ پال مجتہد اعظم:

''بعض مقام پر خطاء اجتہادی کے خطا بھی کرتے ہیں، لیکن متنبہ بھی ہوتے گئے ہیں''

سینٹ پال کے واقعی حالات سے جو آگاہ ہیں، وہیں سمجھ سکتے کہ اس مظلوم مولوی کا یہ کتنا ظالمانہ فیصلہ ہے۔

واقعہ یہ ہے (ط) حضرت مسیح علیہ السلام کی خالص توجیہ کو تثلیث اور باپ بیٹے کا جھگڑا، نیز کفارہ کا عقیدہ پھیلا کر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے مطالعہ کے غیر معمولی ذوق کی وجہ سے پادریوں سے ان کا میل جول زیادہ بڑھ گیا تھا اور شعوری وغیر شعوری طور پر اس قسم کے فکری جراثیم ان ہی کی صحبتوں، باہمی مکالموں میں پیدا ہو گئے۔ واللہ اعلم

میں خیال کرتا ہوں کہ مظلوم مولوی کو ان کے عیب و ہنر دونوں قسم کے صفات کے ساتھ روشناس کرنے کے لیے اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔ اپنی علمی جدوجہد، تلاش وجستجو کے سلسلہ میں وہ جن جن نتیجوں تک پہنچے ہیں ان کی تفصیلی علم کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کا مطالعہ کیا جائے، شاید میں نے پہلے بھی کہیں اشارہ کیا ہے کہ اصل تفسیر میں جیسا کہ چاہیے تھا ایسی کوئی خاص چیز نہیں ملتی جو ان کے بلند آہنگ دعووں کا اقتضا ہے۔ جہاں جہاں قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح میں بائبل کے حوالوں سے مدد مل سکتی تھی وہاں وہ رکے ضرور ہیں۔ لیکن زیادہ تر وہ ایسی باتیں ہیں کہ ان سے واقعی ان آیتوں کے سمجھنے میں کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا، ہاں کچھ اشارے ضرور مل جاتے ہیں اور ان اشاروں کی مدد سے کوئی آگے بڑھنا چاہے تو شاید بڑھ سکتا ہے۔

برخلاف اس کے ان کی تفسیر کا مقدمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ پست سے پست چیزوں کے ساتھ کافی بلند نتائج پر بھی مشتمل ہے۔ ان کے خاص طریقہ بیان سے اپنے آپ کو مانوس بنا لینے کے بعد چاہا جائے تو کافی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، خصوصاً قرآن کی آیت: ﴿النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی

Marfat.com

التورات والانجیل﴾ (٦٧)

''النبی الامی جسے وہ یعنی اہل کتاب اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے متعلق تورات وانجیل میں جو پیشینگوئیاں درج تھیں اور کسی نہ کسی شکل میں اب بھی پائی جاتی ہیں، ان کی تحقیق وتفتیش میں کافی محنت اٹھائی ہے۔ دوسرا مسئلہ ''یاجوج وماجوج'' نامی قوموں کا ہے، جن کا ذکر قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں پایا جاتا ہے۔

پہلی بات تو ظاہر ہے کہ کسی خاص عہد اور زمانہ سے کوئی خصوصی تعلق نہیں رکھتی لیکن دوسرا مسئلہ عہد حاضر کے مسلمانوں بلکہ چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عام انسانی نسلوں کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہے اور آئندہ ہم ان ہی دونوں چیزوں کے متعلق مظلوم مولوی کے افادات کو پیش کریں گے (ان شاء اللہ)

اور یہ بھی ایک حد تک درست ہے جیسا کہ وہ خود ہی لکھتے ہیں:

''بہت سے مقامات پر میں نے بتایا کہ وہاں پر تحریف وتبدیلی ہوئی ہے'' (٦٨)

جس کی ایک مثال وہی یوم السبت والی تحریف بھی ہوسکتی ہے کہ جمعہ کے دن کو سنیچر اور اتوار سے بدل لیا گیا۔ وہ اس قسم کی اسرائیلی روایات جو مسلمانون میں مشہور ہوگئی تھیں، مثلاً عوج بن عنق عملیقی فلسطین کے قریب علاقہ بسن کا جو راجہ تھا یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عوج غیر معمولی ڈیل ڈول والا ضرور تھا لیکن یہ:

''سمندر سے مچھلی پکڑ کر سورج سے سینکتا تھا'' (٦٩)

مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ اس قسم کی باتوں کا چرچا کر کے اہل عقل کی نگاہوں میں وہ سبک ہوتے ہیں مولوی صاحب نے پوچھا ہے:

''اوپر میں سردی ہوتی ہے یا گرمی؟''

Marfat.com

اس کی بھی خبر گپ اڑانے والوں کو نہ تھی'

لیکن باایں ہمہ موجودہ بائبل کے عشق کے نشہ میں جب وہ سرشار ہوئے تو ان کے قلم سے سکر کی اس کیفیت میں ایسی باتیں نکل پڑی ہیں، جنہیں پڑھ کر بجائے مظلوم کے ظالم قرار پانے کے شاید وہ زیادہ مستحق ہوجاتے ہیں اور تو اور بے جاوکالت کے خبط کی یہ آخری حد ہوسکتی ہے کہ حضرت لوط علی النبی الصلوۃ والسلام کا قصہ جسے قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر دہرایا گیا ہے اور کتاب پیدائش میں بھی یہی قصہ پایا جاتا ہے لیکن اس اضافہ کے ساتھ کہ العیاذ باللہ حضرت والا کی لڑکیوں نے شراب پلا کر ان سے نسل حاصل کی، دماغ جس کے تصور کو برداشت نہیں کرسکتا، خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر برحق پر یہ الزام ایک ایسی کتاب میں کیسے منسوب کر دیا گیا ہے۔ جسے ماننے والے خدا کی کتاب مانتے تھے۔ حالانکہ قرآن میں صراحتہً یا کنایتہً کسی قسم کا کوئی ہلکا سا اشارہ بھی اس حد سے زیادہ مکروہ اور گندے بہتان کی طرف نہیں کیا گیا۔ اس کے بے بنیاد ہونے کے لیے یہی بات کافی تھی۔ لیکن بے جا پاسداری کے نشہ کا زور دیکھیے کہ ہمارا مظلوم مولوی اس ظالمانہ توجیہ کے پیش کرنے میں کسی قسم کی جھجھک نہیں محسوس کرتا، اسی تہمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''درصورت فرض صحت قصہ کے جو سب نسخوں مختلفہ تورات میں پایا جاوے، ہوسکتا ہے کہ شراب ان کے ہاں جائز ہو اور حالت نشہ میں اجراء کلمہ کفر لازم نہیں آتا جو سخت کبیرہ ہے۔ پس جن کے ہاں شراب جائز ہو ان سے حالتِ نشہ میں جو فعل صادر ہو زنا نہ ہوا'' (۷۰)

آگے لکھتے ہیں:

''پس اس میں نبی پر قصور عائد نہیں ہوتا، قصور کا دارومدار عقل پر ہے اور

کتاب میں (یعنی تورات میں) تصریح ہے کہ لوط نے نہ پہچانا، پس قصور اس میں لڑکیوں کا ہے، نہ کہ لوط کا"

حقیقت یہ ہے کہ اس توجیہ کو پڑھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ غلط سے غلط بات اور بد سے بدترین فعل تک کی توجیہ پر آدمی کا منطقی دماغ اگر آمادہ ہو جائے تو کوئی نہ کوئی صورت توجیہ کی نکال ہی لیتا ہے۔ حالانکہ قصہ لوط میں التزاماً قرآن اس جزء کو جو حذف کرتا چلا گیا تھا (ی)، اسی سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ آسمانی کتابوں کی تصحیح کے لیے آخری ایڈیشن کی شکل میں جو کتاب قدرت کی طرف سے بنی آدم کو ملی ہے اس نے موجودہ تورات کے اس اضافہ کو مسترد کر دیا ہے۔

اور اب اس کتاب کے ان ہی دونوں محوری مسئلوں یعنی گذشتہ آسمانی و مذہبی نوشتوں میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیاں جو پائی جاتی ہیں، اور دنیا کے مستقبل کی تاریخ سے یاجوج و ماجوج کی قرآنی اصطلاحوں کا جو تعلق ہے، ان ہی دو باتوں کے متعلق ہم اپنے مظلوم مولوی کے خیالات و احساسات کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی بات یعنی آنحضرت ﷺ کے متعلق گذشتہ کتابوں میں جو تذکرے ملتے ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ اس دعویٰ کا اعلان خود قرآن میں کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "النبی الامی کے ذکر کو وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں" (۷۳) اسی لیے ابتدائے اسلام سے اہلِ علم کا ایک طبقہ اس قرآنی دعویٰ کے ثبوت میں تورات و انجیل میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئی کو ڈھونڈھتا رہا ہے اور سچ پوچھیے تو تلاش و تحقیق کا سلسلہ اس راہ میں اب تک جاری ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مظلوم مولوی کا یہ کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے، البتہ چند خاص تمہیدی مقدمات کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ "عہد عتیق" کے نام سے بائبل میں چالیس صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب ہیں، ان میں سے "ہر ایک کتاب میں ہنوز

Marfat.com

بہ تصریح واشارہ وکنایہ حضور ﷺ کا ذکر خیر موجود ہے''۔(۷۲)

اوران چالیس صحیفوں ہی کی حد تک نہیں بلکہ عہد جدید کا مجموعہ جوانجیل کے نام سے موسوم ہے جن میں چھوٹی بڑی اکیس کتابیں پائی جاتی ہیں، ان میں بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کا تذکرہ کسی نہ کسی رنگ میں آج تک موجود ہے۔مجموعی حیثیت سے ہمارے مظلوم مولوی کا یہ دعویٰ ایک ایسا دعویٰ ہے جو شاید ان کی طرف سے پہلی دفعہ پیش کیا گیا ہے اور جیسا کہ وہی کہتے ہیں، اگر واقعہ کی یہی صورت ہے تو:

''منصف مزاج باوجود قصد حصولِ ایمان کے اس قدر پیش گوئی دیکھیے وہ مشرف باسلام بالضرور ہو''(۷۳)

لیکن جن کتابوں کا حال یہ ہو کہ ہر جدید ایڈیشن میں ترمیم وتحریف کرنے والے ان میں مسلسل ترمیم وتحریف کے عادی ہوں، انہی کے متعلق غریب مولوی کی ہنوز کے لفظ کے ساتھ یہ توقع کہ فلاں فلاں باتیں ان میں پائی جاتی ہیں، بے جا توقع کیساتھ اور کیا ہے۔کنایے اور اشارے والی باتوں کو جانے دیجیے، اس قسم کی پیشینگوئیاں مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ایک کتاب جس کا نام غزل الغزلات یا تسبیحات سلیمان بھی ہے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے مظلوم مولوی نے لکھا ہے کہ اس کتاب کے ''درس ہشتم سے ذکر حضور ﷺ مع نامِ مبارک محمد وحلیہ شریف کے ساتھ ہے''۔

پھر اسی فصل کے مختلف فقروں کو نقل کرتے ہوئے آخری فقرہ درس ۱۶ کے الفاظ انہوں نے یہ درج کیے ہیں:

''اس کا منہ شیریں ہے، ہاں سراپا محمد عظیم ہے، اے یروشلم کی بیٹیو! یہ ہے مرا پیارا، مرا جانی''۔

اس اردو ترجمہ کے ساتھ اصل عبرانی زبان کا فقرہ جس کا مذکور بالا ترجمہ

Marfat.com

اردو زبان میں کیا گیا ہے مظلوم مولوی نے اس کو بھی بایں الفاظ نقل کیا ہے یہ لکھ کر:

''چنانچہ اصل عبرانی درس ۱۶ یہ ہے''۔

وہی نقل کرتے ہیں: ''ھکودیکونو محمدیم''

محمد کے ساتھ یم کے حروف عبرانی عبارت میں جو پائے جاتے ہیں، اس کے متعلق وہی لکھتے ہیں: ''بم محمدیم میں گو کلمہ مفید جمعیت ہے، لیکن یہاں بے نظیر تعظیم ہے، جیسے الوہیم''

اور قرینہ یہ پیش کرتے ہیں: ''حرف ربط بعد لفظ محمدیم کے واحد ہے، پس لابد ہے کہ لفظ یم تعظیم کے لیے ہے''۔(۷۴)

اسی طرح حضرت داؤد کی طرف زبور نامی جو کتاب بائبل کے مجموعہ میں منسوب ہے، اس کے مزبور ۹۶ کے ذکر کرتے ہوئے مظلوم مولوی نے تیسرا درس اسی مزبور کا بایں الفاظ درج کیا ہے:

''امتوں کے درمیان اس کے جلال کی، اور سارے خاندانوں کے بیچ اس کے عجائب قدرتوں کو بیان کرو کیونکہ خداوند بزرگ اور ''محمد'' ہے''۔

پھر خود لکھتے ہیں، اسی اسم گرامی ''محمد'' کا لفظی ترجمہ اردو زبان میں ''ستایش کیا گیا'' درج کر دیا گیا ہے۔

مظلوم مولوی کے زمانہ میں پھر بھی جو ترجمہ کیا گیا تھا، غنیمت تھا۔ اب تو ہم زبور میں اسی ''محمد'' کی جگہ ''نہایت ستائش کے لائق ہے'' کے الفاظ پاتے ہیں، نام یا علم کا ترجمہ کر کے حقیقت کو ظاہر ہے کہ بآسانی دبا دیا جا سکتا ہے اور یہی کرتب بائبل کے ترجموں میں پہلے بھی دکھایا گیا ہے اور آج تک دکھایا جا رہا ہے جسے دیکھ دیکھ کر بے ساختہ قرآن کی آیت: ﴿ولا تزال تطلع علی خائنة منهم﴾(۷۵)

''اور تم ہمیشہ مطلع ہوتے رہو گے اہل کتاب کی خیانتوں پر'' کی یاد تازہ ہو

Marfat.com

جاتی ہے۔(ک)

اسی سلسلہ میں ہمارے مظلوم مولوی نے بائبل کی ان ہی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے مولد اور ہجرت گاہ عرب کے جس قبیلہ سے آپ کا تعلق تھا، آپ کے آباو اجداد تک کے اسماء وصفات الغرض اسی نوعیت کے بیسیوں امور کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے، لیکن سب سے زیادہ جس چیز پر انہوں نے زور دیا ہے، وہ النبی السعبتی'' کا دعویٰ ہے۔ یہ بڑا طول طویل قصہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ہی نہیں، بلکہ دنیا میں انسانی نسل کی ابتداء وانتہا کے متعلق ان کا خیال جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

''وجود ایک لاکھ آدمیوں کا بقول شیخ محی الدین شیخ اکبر ثابت ہے''(۷۶)

اسی لیے ان کے نزدیک:

''بست لکھ سالہ سے اہل اسلام و اہل کتاب پر اعتراض نہیں ہوتا جو علم بیالوجی سے حکماء حال ظاہر کرتے ہیں''

مطلب اس کا وہی ہے جس کا ذکر شیخ اکبر نے اپنی کتاب فتوحات میں مختلف مقامات میں کیا ہے مثلاً اسی کتاب کی پہلی جلد میں ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:

"ولم یتحقق مبدء آدم و کم له من السنین و کم بقی الی انقضاء الدنیا و فناء البشر عن ظهرها و انقلابهم الی الدارا لآخرة و لیس هذا بمذهب الراسخین من العلماء الحکماء وانما قال به شر ذمة لایعتد بقولها"(۷۷)

''آدم کی ابتداء کب سے ہوئی، آج تک نہ یہی متعین ہوا، اور نہ کوئی یہی کہہ سکتا ہے کہ کتنی مدت نسل انسانی پر گذری اور دنیا کب فنا ہوگی اور زمین کے کرے سے منتقل ہو کر نسل انسانی دوسرے عالم (یعنی عالم آخرت) میں کب منتقل ہوگی، علماء جو حکما ہیں اور علم میں جن کے قدم راسخ ہیں، ان کے

Marfat.com

نزدیک کوئی معین جواب ان سوالوں کا نہیں ہے، خاص مدت ان امور کی صرف ایک مختصر گروہ کے نزدیک ہے جن کا خیال قابل توجہ نہیں ہے"

الغرض عام نسلِ انسانی کے متعلق شیخ اکبر کے اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے مظلوم مولوی نے یہودیوں کے اس خیال کو مان لیا ہے کہ آخری آدم جسے خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تھا، ان کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی، جس کے حساب سے رسول اللہ ﷺ کا ظہور ساتویں ہزارے یا ہزار ہفتم میں ہوا۔ اس مسئلہ پر انہوں نے بائبل کے حوالوں سے بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ دنوں کے متعلق دنیا کی تمام قوموں میں جو یہ حساب پایا جاتا ہے کہ بجائے کسی اور عدد کے پہلا مجموعہ دنوں کا ہفتہ مان لیا گیا ہے۔ پس بقول ان کے:

"ہفتے کے سات روز اور سات روز کی تعداد زمان آدم سے چلی آتی ہے"

اسی لیے ساری نسل انسانی میں ایام کی یہ تقسیم عمومی طور پر پھیلی ہوئی ہے، ان کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے:

"ساتویں ہزار میں حضور ﷺ رونق افروز اس جہان کے ہوئے" (۷۸)

اپنے اسی نظریہ کو بنیاد بنا کر اور اسی کے ساتھ یہود کی قومی تاریخ میں چند جوہری انقلابات جو آئے، یعنی بابل و نینوا کے فاتحوں میں جن میں بخت نصر کا نام زیادہ مشہور ہے، انہوں نے اس قوم کو تتر بتر کیا، پھر میدیا کے سلاطین نے دوبارہ فلسطین میں آباد ہونے کی آسانیاں یہود کے لیے فراہم کیں۔ اس کے بعد آدمیوں کے ہاتھوں یہود دوبارہ برباد اور تباہ ہوئے۔ یروشلم اور سلیمان کے ہیکل پر بت پرستوں کی طرف سے زیادتیاں ہوئیں۔ آخر میں رومیوں کے ہاتھوں سے ارضِ مقدس کو نکال کر مسلمانوں نے پھر اس کے احترام و تقدس کو زندہ کیا۔ ان تاریخی واقعات کی روشنی میں بائبل کے قدیم و جدید صحیفوں کے معموں کو سلجھانے کی

Marfat.com

کوشش کی ہے جس سے ضمناً النبی الامی کے زمانے کی پیشینگوئیاں بھی مستنبط ہوئی ہیں۔ ان کی تفسیر کے مقدمہ کا یہ حصہ مستحق توجہ ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو بائبل کے ساتھ ساتھ یہود کی تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے ''مظلوم مولوی کی یا بس باتوں کے ساتھ ساتھ ان کو بعض رطب اور مفید چیزیں بھی ہاتھ آئیں گی۔

کچھ بھی ہو، بائبل میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیوں کا مسئلہ بذاتِ خود ان کی کتاب کا کوئی خصوصی مسئلہ نہیں ہے، پہلوں نے بھی اس پر بہت کچھ لکھا ہے، اور پچھلوں نے بھی اس پر کام کیا ہے، لیکن انہی پیشینگوئیوں کے سلسلہ میں جو خاص چیز ان کی کتاب میں پائی جاتی ہے، گو کبھی کبھی بطور گرمی بزم لوگ اس کا بھی چرچا کرتے رہتے ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے عوام تک اس قصے کے پہنچانے میں دوسروں کے ساتھ زیادہ دخل ہمارے مظلوم ہی کی کتاب کو ہے۔ لیکن افسوس ہے، مسئلہ جس توجہ اور اہمیت کا مستحق تھا اس سے وہ پہلے بھی محروم رہا، اور آج تک اس کی محرومی کا حال یہی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ یوں تو بطور خاتہ پری کے مظلوم مولوی نے یہی دعویٰ کر دیا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی کتابوں اور نوشتوں میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر اس وقت تک پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے مصر، یونان، روما، ایران وغیرہ قدیم ممالک کی قوموں کا بھی نام لیا ہے، لیکن انصاف کی بات ہے کہ بجز دور از کار اشاروں کے کوئی خاص چیز ان کو نہیں مل سکی ہے۔

ایرانیوں کے متعلق بھی ساسانیوں کی طرف منسوبہ بعض تحریروں کا تذکرہ انہوں نے کیا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان تحریروں کی تاریخی وثاقت بہت زیادہ مشتبہ ہے۔ بلکہ ساسان کی طرف ان کا انتساب بھی اس کو مشکوک و مشتبہ کر

Marfat.com

دینے کے لیے کافی ہے۔

البتہ اسی سلسلہ میں ہندوستان کے قدیم نوشتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ہمارے مظلوم مولوی نے ایک سے زیادہ شہادتوں کو اس ملک کی علمی و مذہبی زبان سنسکرت ہی کے الفاظ میں جو درج کیا ہے اور ان ہی کے ساتھ جن باتوں کا تذکرہ ہمیں ان کی کتاب میں ملتا ہے، کچھ تو اس لیے کہ ان کا تعلق ہمارے خاص وطن سے ہے اور اس لیے بھی کہ ان کی تحقیق و تفتیش کے ساز و سامان کی کمی نہیں ہے، ان ہی خصوصیتوں نے ان کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، سب کا نقل کرنا اور دہرانا تو دشوار ہے۔ تفصیل کے لیے تو مناسب ہوگا کہ ان کی اصل کتاب کا مطالعہ کیا جائے لیکن ان کے لیے جو سنسکرت زبان اور ان کی کتابوں سے تعلق رکھتے ہیں، میں ان کے کلام کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

غرض یہ ہے کہ جاننے والے بتائیں کہ آخر جن چیزوں کا تذکرہ ہمارے مظلوم مولوی نے کیا ہے ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ خود فقیر نہ سنسکرت ہی سے واقف ہے اور نہ میری رائے اس باب میں نفیاً یا اثباتاً قابل قبول ہو سکتی ہے۔ حیثیت میری صرف ناقل کی ہے، چاہتا ہوں کہ یہ بحث علمی و تحقیقی دائرے میں لائی جائے، فالعھدۃ علی الراوی کہتے ہوئے اس داستان کو اہل علم کے حلقہ میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

ہند کے قدیم نوشتوں میں رسول اللہ ﷺ کی پیشینگوئیاں

اس سلسلہ میں مولوی صاحب نے تین کتابوں کا نام لیا ہے جن میں پہلی کتاب تو وید ہی کا ایک حصہ ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وید کی چوتھی کتاب جو اتھرون وید کے نام سے مشہور ہے اور اب تک اتھرون وید کا کامل نسخہ طبع ہو کر شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ وہی لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

اتھرون وید کے اسی غیر مطبوعہ حصہ میں ایک عبارت پائی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے سنسکرت کے لغت کی دو مشہور کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نام اتھرون وید کے اس حصہ کا ''اللہ سکتہ'' ہے ان کے اپنے الفاظ میں:

''واچپتی لغت سنسکرت کو ''ال'' کے لفظ کے ذیل میں اللہ سکتہ کو اتھرون وید کے سکتہ مشہور کر کے لکھا ہے اور لغت سنسکرت مسمی کلپ ورم مصنفہ راجہ رادھا کانت دیو بہادر میں بھی اللہ سکتہ لکھی ہے'' (۷۹)

مطلب یہی ہوا کہ اتھرون وید کی یہ عبارت یا فقروں کا مجموعہ جو اللہ سکتہ کے نام سے موسوم و مشہور ہے اس کا ذکر سنسکرت کی لغت کی دو مطبوعہ کتابوں میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ ایسا ہے جس کی تحقیق و تنقیح میں چاہیے تو یہی کہ کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہ آئے، سنسکرت کے عام کتب خانوں میں لغت کی یہ دونوں مطبوعہ کتابیں بآسانی مل سکتی ہیں، جن میں دیکھا جا سکتا ہے اور پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ مظلوم مولوی کی اطلاع کس حد تک واقعہ کے مطابق ہے۔

بہر حال مولوی صاحب نے راجہ رادھا کانت بہادر کی کتاب کلپ ورم کا حوالہ دیتے ہوئے خطِ نسخ (عربی خط) سنسکرت زبان کی اس عبارت کو درج کیا ہے۔ ان کے مقدمہ کے بعض نسخوں میں یہی عبارت سنسکرت حروف میں بھی نقل کی گئی ہے۔ پوری عبارت کا معائنہ تو ان کی کتاب ہی میں کرنا چاہیے یہ دس شعروں کی ایک طویل نظم ہے، اردو ترجمہ بھی ہر شعر کے نیچے درج کرتے چلے گئے ہیں۔ جن میں خالقِ کائنات کی تعریف بڑے بلیغ پیرائے میں کی گئی ہے۔ بظاہر اس نظم کے ہر شعر میں لام کے حروف کی کثرت نظر آتی ہے۔ اسی کے آخری شعر میں حروف کا ایک مجموعہ ہے۔ اصل سنسکرت سے، عرض کر چکا ہوں میں قطعاً نا آشنا ہوں لیکن خط نسخ میں وہی حروف جیسا کہ مولوی صاحب نے نقل کیا ہے، ان کی صورت یہ ہے۔

Marfat.com

"رُسُلَہ مُحَمَّد رَہ کَنرَشنیَّ"

اعراب یعنی ان حروف پر زیر زبر پیش وغیرہ بھی مولوی صاحب کے لگائے ہوئے ہیں اسی کے نیچے انہوں نے اردو ترجمہ یہ درج کیا ہے:

''رسول اللہ محمد زور آور کا نام سے جن کے برابر کا کون ہے''۔

مولوی صاحب نے راجہ رادھا کانٹ بہادر کی کتاب سے اسی کو نقل کرتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ اس کتاب میں اس کی تصریح بھی کی گئی ہے کہ:

''یہ سکتہ اتھرون وید ہے''

اور یہ بھی لکھا ہے کہ کلپ ورم کے مصنف نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کے نزدیک یہ جعلی اور بنائی ہوئی عبارت ہے۔ اگرچہ اعتراض نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ کلپ ورم کے مصنف کو اس عبارت کے غیر جعلی ہونے کا یقین تھا۔ لیکن عام حالات کے لحاظ سے چاہیے تھا کہ علمائے سنسکرت کے نزدیک اگر یہ عبارت جعلی اور مصنوعی سمجھی جاتی تھی، تو اس کی تصریح کر دیتے۔

خیر یہ تو پہلی کتاب اتھرون وید کی عبارت کی داستان تھی۔ دوسری کتاب جس کا ذکر اسی سلسلہ میں مولوی صاحب نے کیا ہے وہ ''اپنشد'' کے سلسلہ کی ایک کتاب ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، وید سے کلامی اور صوفیانہ عقائد و خیالات جو پیدا کیے گئے ہیں ان ہی کی تعبیر ''اپنشد'' سے کی جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے یہی لکھا ہے کہ عموماً اپنشد کی تعداد باون (۵۲) بتائی جاتی ہے اور بعض ایک سو آٹھ (۱۰۸) بھی کہتے ہیں۔ پھر یہ لکھ کر کہ داراشکوہ نے فارسی زبان میں پچاس اپنشدوں کا ترجمہ کرایا تھا، ان اپنشدوں میں تو ان کی یہ عبارت نہیں ملی اور نہ اس اپنشد ہی کا نام ملا، جس میں لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے اسم مبارک کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا بیان

Marfat.com

ہے کہ ''الوپ اپنشد'' کے نام سے یہ اپنشد موسوم ہے اور اس کا اقرار کرتے ہوئے پروفیسر میکس مولر نے اپنشدوں کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں بھی ''الوپ اپنشد'' کا نام شریک نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ وہی لکھتے ہیں:

''بخلاف فرانس کی فہرست کے کہ اس میں لکھا ہے'' (۸۰)

یعنی اپنشدوں کے ناموں کی جو فہرست فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی ہے، اس میں ''الوپ اپنشد'' کا نام بھی پایا جاتا ہے، ان تفصیلات کا اقتضاء ہے کہ اپنی حد تک مولوی صاحب نے تحقیق و تفتیش میں پوری کوشش کی ہے۔ داراشکوہ کے ترجمہ کرائے ہوئے اپنشدوں کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا۔ میکس مولر نے سنسکرت زبان کی کتابوں کی جو فہرست تیار کی تھی اس میں ڈھونڈھا اور علمائے فرانس کی شائع کردہ فہرست کا بھی معائنہ کیا تھا۔ اپنی ان کوششوں کے بعد اسی ''اپنشد'' سے جس کا نام وہ الوپ اپنشد بتاتے ہیں، اسی سے سنسکرت زبان کی ایک طویل عبارت خطِ نسخ میں مولوی صاحب نے نقل کی ہے جس کی آخری سطر میں: ''الورسول محمد رہ کنبر شم لی'' کے حروف بھی ان کی نقل کردہ عبارت میں پائے جاتے ہیں، انہوں نے اتھرین وید والی عبارت کا تو ترجمہ بھی اردو میں کر دیا ہے اور ہر حرف پر اعراب بھی لگے ہوئے ہیں۔ لیکن جس عبارت کو ''الوپ اپنشد'' کی طرف انہوں نے منسوب کیا ہے نہ اس کا ترجمہ ہی کیا اور نہ ان کے حروف پر زیر و زبر و پیش وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ تاہم آخری سطر میں خط نسخ کی مذکورۂ بالا حروف کی شکل میں وہی الفاظ ہیں جو آپ کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب اُس فقرہ کا صحیح ترجمہ کیا ہو سکتا ہے۔ اتنی بات تو یقینی ہے کہ خط نسخ میں حروف کی جن شکلوں کو ہم یہاں پا رہے ہیں، اصل سنسکرت زبان کے حروف کی شکلیں بھی یہی ہوں یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں سنسکرت زبان میں عربی زبان کے حلقی حروف مثلاً ح ع وغیرہ

Marfat.com

شاید نہیں پائے جاتے ۔ایسی صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ مثلاً محمد کے تلفظ کی شکل سنسکرت زبان میں بھی یہی ہوگی؟ اوزاسی قسم کے اشتباہات دوسرے حروف کے متعلق بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو، اصل واقعہ کیا ہے اس کا جواب تو اہل تحقیق ہی دے سکتے ہیں لیکن اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مظلوم مولوی نے ان عبارتوں کو صرف سنی سنائی زبانی روایتوں ہی کی بنیاد پر نقل نہیں کر دیا ہے بلکہ اپنی بساط کے مطابق جتنی کاوش وکوشش سے وہ کام لے سکتے تھے، اس میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ سنسکرت زبان کی کتابوں کی جو فہرست انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ان کے زمانے میں شائع ہو چکی تھی اور بھی دوسرے طریقوں سے وہ جو کچھ پتہ چلا سکتے تھے سب ہی سے کام لیا ہے اب یہ آئندہ نسلوں کا کام ہے کہ تلاش وجستجو کے سلسلہ کو جاری رکھیں اور آخری فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فقروں کے متعلق یہ شبہہ بھی کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں یہ جعلی فقرے بنا کر ان کتابوں میں شریک کر دیئے گئے ہیں، واللہ اعلم کس ذریعہ سے یہ خبر ان تک پہنچی تھی:

''راجہ ٹوڈرمل نے شیخ جیون قوم برہمن کو اللہ سکتہ پڑھتے سنا تو تعصب مذہبی سے اودے پور کے راجہ کو لکھا کہ ایک شخص ایسی عبارت وید سے پڑھتا ہے جس میں لام بکثرت ہیں، اس کا دفعیہ لازم ہے'' (۸۱)

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ راجہ ٹوڈرمل کی اسی تحریک کو بنیاد بنا کر یہ خیال پھیلا دیا گیا ہے کہ یہ جعلی عبارتیں اکبر کے وقت بنالی گئی ہیں۔

جواب میں سکھوں کے بابا گرونانک شاہ کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی صاحب نے دعویٰ کیا ہے:

''اللہ سکتہ کی تسلیم نانک کو بھی تھی جو شاہان ترک دہلی کے اوائل میں قبل از زمانہ اکبر جلال الدین سے زمانہ بابر میں ہوا ہے'' (۸۲)

لیکن افسوس ہے کہ گرونانک کے نہ اس کلام ہی کا ذکر مولوی صاحب نے کیا اور نہ اس کا پتہ دیا ہے کہ گرونانک کے اس قول کو انہوں نے کس کتاب میں پایا تھا۔

یہ اور اس کے سوا دوسری بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے مظلوم مولوی کا دعویٰ تشنہ تحقیق ہی نہیں کہا جا سکتا کہ تحقیق سے کیا ثابت ہو، لیکن اتنی بات تو بہر حال سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں پر ہندوؤں کے متعلق یہ الزام جو لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ان کو ادنیٰ درجے کے وحشی بت پرستوں سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی، کم از کم اس الزام کے بے بنیاد ہونے کے دوسرے اسباب و وجود کے ساتھ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی مذہبی اور دینی کتابوں میں اپنے پیغمبر حق کے ذکر کو وہ تلاش کرتے رہے۔ اسی طرح تلاش کرتے رہے، جیسے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں بھی آنحضرت ﷺ کے تذکرہ کو ڈھونڈتے رہے ہیں، جس کا مآل اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہندو دھرم اور برہمنی مت کی بھی ان کی نگاہوں میں تقریباً وہی اہمیت تھی جو اہمیت اہل کتاب کے مذہب و ادیان اور ان کی دینی کتابوں کی ہے اور آسمانی صداقتوں کی تلاش جیسے اہل کتاب کی کتابوں میں وہ کرتے رہے ہیں، ہندوستان پہنچ کر یہی طرزِ عمل ہندوؤں کی دینی کتابوں کے ساتھ بھی انہوں نے اختیار کیا۔

پس اصل مسئلہ یعنی ہندوؤں کے قدیم نوشتوں میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیاں خواہ ملیں یا نہ ملیں، اور جن عبارتوں کی نشان دہی مذکورہ بالا کتابوں میں کی گئی ہے، ان میں وہ عبارتیں موجود ہوں یا موجود نہ ہوں یا موجود ہونے کے بعد یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ الحاقی عبارتیں ہیں، ان تمام امور سے قطع نظر بھی کر لیا

Marfat.com

جائے، پھر بھی یہی نتیجہ کیا کم قیمتی ہے کہ مسلمانوں کی طرف منسوب کرنے والوں نے ہندو مذہب کے متعلق جن بے جا اور بے بنیاد بدگمانیوں کو منسوب کر دیا ہے، ان کا تو ازالہ ہو جاتا ہے۔ اتنی بات تو بہر حال ثابت ہو جاتی ہے کہ دنیا کے ادیان و مذاہب کے ساتھ توہین و تحقیر کا تعلق مسلمانوں نے کبھی نہیں رکھا، بلکہ جس احترام و اکرام کے جو مذاہب مستحق تھے، اپنے طرز عمل سے ہر ایک کے جائز استحقاق کا وہ اعتراف ہی کرتے رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندو مذہب کی کتابوں میں اپنے پیغمبر کی پیشینگوئیوں کا ان کے دل میں کیا خطرہ بھی گذر سکتا تھا۔

بہر کیف ان دو کتابوں کے سوا جن میں ایک کا تعلق وید سے اور دوسرے کا اپنشد سے ہے، مظلوم مولوی نے اس سلسلہ میں ہندو دھرم کی جس تیسری کتاب کا ذکر کیا ہے اس کا نام ہندوؤں کے ہاں وہی کہتے ہیں کہ ''کلکی پران'' ہے۔

یہ بتاتے ہوئے کہ ''ویدا'' اور ''اپنشدا'' کے بعد ہندوؤں میں خاص قسم کی کتابوں کے لکھنے کا رواج ہوا، جن کی عام تعبیر ''پران'' کے لفظ سے کی جاتی ہے، پھر پرانوں کے سلسلہ کی کتابوں کی تعداد بتاتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مخفی نہ رہے کہ ہنود کے کتب میں اٹھارہ پران جو زمانہ مختلف میں لکھے گئے ہیں''

ان ہی اٹھارہ پرانوں میں ان کا بیان ہے کہ ایک پران ہندوؤں میں ''کلکی پران'' کے نام سے موسوم ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''کلکی اوتار'' کا تذکرہ ملتا ہے، افسوس ہے کہ جیسے انہوں نے اتھروں وید اور الوپ اپنشد سے اصل سنسکرت زبان کی عبارت خطِ نسخ میں نقل کی ہے، کلکی پران کی عبارتوں کے ساتھ اپنے اس طرزِ عمل کو انہوں نے جاری نہیں رکھا بلکہ نمبر وار، اس کتاب کے فقرے اردو زبان میں ترجمہ کر کے درج کرتے چلے گئے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اس کا خلاصہ

Marfat.com

بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ان کا بیان ہے کہ اسی کتاب ''کلکی پران'' میں لکھا ہے کہ:

''کلکی اوتار کلک و بت پرستی کو دور کریں گے''(۸۳)

گویا ''کلکی اوتار'' کو کلکی کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ بھی ہے کہ دنیا سے بت پرستی کو وہ مٹا دیں گے۔آگے وہی لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں ''کلکی اوتار'' کی پیدائش کا زائچہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بارہویں چاند سدی ماہ بیساکھ میں نچھتر ہرشن بالب نام کرن میں کلکی اوتار پیدا ہوں گے''۔

مولوی صاحب کا بیان ہے کہ کلکی پران میں سنسکرت زبان کا یہ شعر جو پایا جاتا ہے۔

دواوشی شام شکل پک شیشی مامن مادھوم ہست وہی ہرشن جوکی کرنی بال باہوے

انہوں نے سنسکرت کے حروف کو خط نستعلیق میں لکھا ہے کہ اسی کی بعینہٖ نقل میں نے اتار دی ہے۔نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک حروف اپنی شکل کے مطابق لکھے جا سکتے ہیں۔بہر حال مولوی صاحب کا بیان ہے کہ زائچہ کی اردو عبارت کلکی پران کے اسی شعر کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔واللہ اعلم بالصواب

ان امور کے ذکر کے بعد مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''حضور ﷺ پیر کے روز بارہویں چاند سدی ماہ بیساکھ میں دو گھڑی دن چڑھے رونق افروز ہوئے''(۸۴)

پھر ''کلکی اوتار'' کا اپنے خاص طریقہ سے زائچہ کا جو نقشہ برہمنوں نے کھینچا ہے اسی کی نقل بایں شکل مولوی صاحب نے درج کی ہے۔

زہرہ حوت میں	عطارد و مشتری ثور میں	
دلو	آفتاب حمل میں	راس جوزاء میں
مریخ جدی میں	:	قمر سرطان میں
ذنب قوس میں	زحل میزان میں	اسد
عقرب	سنبلہ	

اور یہ لکھتے ہوئے کہ:

''اور زائچہ کتب ہنود میں جو لکھا ہے ''مطابق زائچہ ابو معشر (فلکی) کے ہے''(۸۵)

جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مشہور ماہر فلکیات و نجوم ابو معشر نے رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت جو جو زائچہ بنایا ہے ''کلکی اوتار'' کی ولادت کا زائچہ بھی ہندوستان کے جوتشیوں نے وہی تیار کیا تھا، مولوی صاحب نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے:

''کسی صاحب کو اگر تردد واقع ہو، وہ اس وقت حساب کر لیں کہ آفتاب و ماہتاب حساب کے لیے ہیں، ان کا حساب غلط نہیں ہوتا''

ولادت کے وقت اس زائچہ کے سوا مولوی صاحب نے اسی کتاب ''کلکی پران'' کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا ہے کہ علاوہ وحدت زائچہ کے ''کلکی اوتار'' کے متعلق حسب ذیل خصوصیتیں اس کتاب میں بیان کی گی ہیں مثلاً ''کلکی پران'' میں لکھا ہے:

''کلکی اوتار کے والد کا نام وشنو یس ہوگا''

مولوی صاحب نے اس کو درج کر کے لکھا ہے:

''وشنو اللہ کو دیس عبد (بندہ) کو کہتے ہیں اور عبد اللہ حضور ﷺ کے والد کا نام تھا''۔

اسی طرح وہی لکھتے ہیں کی کلکی اوتار کی ''والدہ ماجدہ کا نام سومتی لکھا ہے''۔

Marfat.com

سومتی کے لفظ کا ترجمہ مولوی صاحب نے سنسکرت کے لغت کی کتاب کے حوالہ سے ''امانت دار'' بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''والدہ ماجدہ حضور ﷺ کا نام آمنہ ہے''۔

آگے وہی راوی ہیں کہ کلکی اوتار کے متعلق کلکی پران میں بیان کیا گیا ہے کہ ''پہلے پہاڑ کے غار میں تپشیا یعنی عبادت کریں گے''۔

پھر خود لکھتے ہیں:

چنانچہ غار حرا میں رسول اللہ ﷺ نے عبادت کی۔

اسی کتاب کلکی پران میں ان ہی کے بیان کے مطابق یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ: ''وہ (کلکی اوتار) شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے''۔

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کا کوہستان جو مکہ معظمہ سے بجانب شمال واقع ہے حضور انور ﷺ نے ہجرت بھی فرمائی ان ہی کا بیان ہے کہ اسی کتاب میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ کلکی اوتار ''پہاڑ کے کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے''۔

پرش رام کی تشریح کرتے ہوئے مولوی صاحب نے لکھا ہے:

''پرش بمعنی روح رام بمعنی خدا یعنی روح اللہ جبرئیل' اس سے مراد ہے۔

یہ بھی اسی کتاب کلکی پران میں ہے کہ:

''سواری کلکی اوتار کی ایسی ہوگی کہ جہاں پر اس کی نظر پڑے وہیں اس کا قدم پڑے''۔

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ یہی صفت براق کی حدیث کی عام کتابوں میں بیان کی گئی ہے، ایک خصوصیت کلکی اوتار کی کلکی پران میں یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

''سارے اوتاروں کو اچھا کہیں گے''۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ﴿مصدقا لما معکم﴾ ﴿مصدقالما بین یدیہ﴾ یعنی تمام انبیاء ورسل کی تصدیق واحترام کا اعلان خود فرمایا اور اپنی امت کو بھی سکھایا کہ رسولوں میں فرق نہ کریں اور قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ ان ساری کتابوں کو مانیں جو اس سے پہلے نازل ہوئیں، ان ہی باتوں کو پیش کر کے اس کا مصداق بھی آپ ہی کی ذاتِ مبارک کو ٹھہرایا ہے۔

میں اس سے ناواقف ہوں کہ ''کلکی پران'' اس وقت تک چھپ کر شائع بھی ہوئی ہے یا نہیں، لیکن قلمی نسخے جہاں تک میں نے سنا ہے سنسکرت کے بعض پرانے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ جاننے والوں سے چاہتا ہوں کہ جن امور کی نشان دہی ہمارے مظلوم مولوی نے کی ہے، بتائیں کہ واقعی اس کتاب میں وہ ملتے بھی ہیں یا نہیں اور ملتے ہیں تو جن الفاظ کی لغوی تشریح مولوی صاحب نے کی ہے، ان کی یہ تشریح کس حد تک صحیح ہے۔

بہر حال یوں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی جو تصدیق کی ہے اور اس پر ایمان لانے کی دولت سے جو وہ سرفراز ہیں، اس میں اس قسم کی پیشینگوئیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ گو نہ اس نوعیت کی چیزوں سے ان کی ایمانی طمانیت ومسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نہ ماننے والوں کو بھی مجبور نہیں کر سکتے، خصوصاً جنہوں نے طے ہی کر لیا ہے کہ جو سب کا، ساری بنی آدم کا آخری رسول ہے، اس کو مسلمان نامی قوم ہی کے رسول قرار دینے پر اصرار کرتے رہیں گے۔ لیکن علمی حیثیت سے غالباً کوئی حرج نہیں ہے کہ اس قسم کی مبہم مبہم باتیں قوموں میں جو مشہور ہیں، یک سوئی کے ساتھ تحقیقی فیصلہ کر کے عوام کو اس سے آگاہ کر دیا جائے، میرا مقصد مظلوم مولوی کی کتاب کے اس حصہ کے نقل کرنے سے یہی ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

Marfat.com

حواشی

الف۔ مثلاً ابوالفضل کی آئین اکبری ہی میں ''می فرمودند'' کے ابتدائی الفاظ سے اکبر کی طرف جو فقرے منسوب کیے گئے ہیں، یا مجدد الف ثانیؒ کے مکاتیب طیبہ میں منتشر طور پر ان کا ذکر پایا جاتا ہے ان سے ملا عبدالقادر کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

ب۔ ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ، (مترجم)، ویبر، الفرڈ، مترجم، خلیفہ عبدالحکیم، حیدرآباد دکن، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۸ء

ج۔ نبوت کبریٰ کے ہزار سال بعد دوسرے ہزارے یعنی الف ثانی کے متعلق ارباب کشف والہام کے رمزی اشارے قوموں میں منتقل ہوتے چلے آتے تھے، جن کا ذکر اس مضمون میں انشاء اللہ آئے گا۔ اکبر کے کانوں تک بھی ان کی بھنک پہنچی تھی جن کی وجہ سے بعض غلط فہمیوں کا وہ بھی شکار ہو گیا تھا۔ الفی سکہ الفی تاریخ وغیرہ جیسی چیزوں کا ذکر مورخین اکبر کے حالات میں جو کرتے ہیں، ان کا تعلق انہی غلط فہمیوں سے تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدید کو الف ثانی کی طرف منسوب کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ خاکسار نے اپنے بعض مقالات میں اس پر بحث کی ہے۔

د۔ خافی خان نے گودہ بندر کے پرتگالی گورنر جنرل کی یہ درخواست اپنی تاریخ میں نقل کی ہے۔ قصہ تو طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ بمبئی کے قریب دمن بسی نامی جزیرے بہادر شاہ گجراتی سے فرنگیوں نے مانگ لیا تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے چالیس پچاس میل طولاً اور میل دو میل عرضاً پہاڑوں کے دامن فرنگیوں کے قبضے میں تھے، جہاں انہوں نے قلعے بھی بنائے تھے اور ناریل اور چھالیا اور اناناس کے باغ لگا کر آمدنی حاصل کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے چند دیہات بھی آباد کر لیے اور مغل علاقہ کے باشندوں کو ستانے لگے۔ یہ عالمگیر کا زمانہ تھا ملک کے فوجدار معتبر خان نائتی کو حکم ہوا کہ ان پہاڑی علاقوں سے فرنگیوں کو نکال دیا جائے۔ معتبر خان نے فرنگی گڑھیوں پر حملہ کر دیا۔ خافی خان نے لکھا ہے کہ مغل فوجدار کے مقابلہ میں فرنگی اس لیے ٹھہر نہ سکے کہ سوائے بندوق و شمشیر کے بصورت داران کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ ان بھگوڑے فرنگیوں نے گودہ کے گورنر کو اپنے حال زار سے مطلع کیا تب وہی درخواست عالمگیر کی خدمت میں

Marfat.com

پیش ہوئی۔ بادشاہ نے معتبر خان کو حکم دیا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ بمبئی والے انہی فرنگیوں نے شاہی جہاز گنج سوائی نامی پر سمندر میں حملہ کر دیا۔ جب حاجیوں کو لے کر سورت سے وہ عرب جارہا تھا۔ جس کے بعد طویل قصے پیش آئے۔ خافی خان خود بھی گویا گرفتار ہو کر قلعہ بمبئی میں انگریزوں کے افسر اعلیٰ سے ملا تھا۔ انگریزوں کی شان وشوکت کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھا ہے سب سے پہلے تیرہ چودہ سال سبزہ آغاز انگریز سپاہیوں کا پرا تھا، جن کے کندھوں پر بندوقیں تھیں اور زرق برق لباس سے آراستہ تھے۔ پھر داڑھی رکھنے والوں کی صفوں سے گذرا آخر میں انگریز افسروں کو دیکھا جو کلاہ پوش تھے ان کی (ہیٹ) پر موتیوں کا لچھا تھا۔ اس علاقے میں وہ اپنا سکہ چلاتے تھے۔ خافی خان نے آخر میں لکھا ہے کہ انگریز بظاہر تاجروں کی شکل میں تھے لیکن اصل مقصد ان کا زون وتاراج نمودن راہ کعبۃ اللہ است سال دوسال میں جب موقع ملتا ہے تو جاسوسوں سے پتہ چلانے کے بعد جس جہاز میں زیادہ مال ملنے کی امید ہوتی ہے یہ حملہ کر کے اس کو لوٹ لیتے ہیں اور یہی ان کا اصلی پیشہ ہے۔

(منتخب اللباب، ۲/۴۲۷، خافی خان، کلکتہ، 1925, Badtistmission Press.

ھ۔ روسی علوم وادب کا ذکر انیسویں صدی میں انگریزی کے مقابلہ میں ممکن ہے، موجب حیرت ہو لیکن مولوی صاحب نے خاص نظریہ کے تحت اس کا تذکرہ کیا ہے۔ آج بیسویں صدی میں وہی نظریہ مشاہد ہو چکا ہے، اس خاص نظریہ کا ذکر آگے آئے گا۔

و۔ اپنی ان اصلاحوں کی تشریح انہوں نے یہ کی ہے کہ دار سولی کو کہتے ہیں، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دار پر چڑھ کر مسیح ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ اس لیے میں عیسائیوں کو داریہ کہتا ہوں اور ناریہ سے وہ ساری قومیں مراد ہیں جو آخرت میں نار (آگ) کی مستحق ہوں گی، لکھا ہے کہ آریہ ایک نیا فرقہ ہمارے زمانہ میں پیدا ہوا ہے، جو دیانند جی کے پیرو ہیں۔

ز۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفہ میں عناصر اربعہ (آب وآتش خاک وباد) کو بجائے مرکب کے بسیط جو مانا جاتا تھا، وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور عناصر کی ترکیب کا جو جدید نظریہ ہے اسی کے قائل ہو گئے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ نے فتوحات میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ ہوا میں پانی کا لطیف حصہ اگر شریک نہ ہو تو ہوا جل اٹھے گی،

Marfat.com

ان کے اپنے عربی الفاظ ہیں کہ ان الھوء ان لم یکن فیہ مائیۃ احرق (فتوحات، ۵۷۳۲، ابن عربی، محی الدین ابوبکر، مصر، مطبع میریہ، س ن) بظاہر اس سے بھی جدید نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ح۔ حضرت آدم کے اسی الشجرہ کے متعلق قرآن ہی میں دوسری جگہ یہ بات ملتی ہے کہ اس کو الخلد کے لفظ کی طرف شیطان نے منسوب اور مضاف کیا تھا۔ الخلد کے معنی نعمت میں دوام اور ہمیشگی کے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ہی کی سورہ الھمزہ میں فرمایا گیا ہے کہ یحسب ان مالہ اخلدہ (سرمایہ کے متعلق خیال کرتا ہے کہ وہ خلود یعنی دوام وہمیشگی بخشتا ہے) یوں بھی عام انسانی فطرت میں مال یا سرمایہ کے متعلق خلود بخشی کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ راسخ ہے، سمجھا جاتا ہے کہ سرمایہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے اپنے اسٹیٹس یا حیثیت کو آدمی قائم رکھ سکتا ہے مگر دوسری طرف اسی کا نتیجہ ہے کہ بجائے خدا کے سرمایہ دار کے دل کا سارا تعلق سرمایہ ہی میں مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنی ہر ضرورت میں بجائے خدا کے سرمایہ ہی کے خیال سے تسلی حاصل کرتا ہے اور آدمی کے بس میں نہیں ہے کہ آج جو کچھ مل جائے، حیوانوں کی طرح اس سے مستفید ہو کر کل کے خیال سے لاپروا ہو جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج آدم کی اولاد کے سامنے جو چیز سرمایہ کی شکل میں پیش ہوئی ہے، دوسرے عالم میں وہی کسی نباتی وجود کی شکل میں پایا جاتا تھا۔ الغرض اجمال کی تفصیل میں بکثرت احتمالات دماغ میں آنے لگتے ہیں۔ پس احتیاط کا تقاضا ان امور میں یہی ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کو مجمل حالت میں چھوڑ دیا ہے ہم بھی اس کو مجمل ہی رہنے دیں۔

ط۔ مذہب کی ضرورت کو ختم کر دینا، ختنہ کا قانون جو حضرت مسیح اور حواریوں کا موروثی قانون تھا، اور بہیمی قوت کو نقطہ اعتدال سے قریب رکھنے کی عملی تدبیر تھی۔ اس سے یورپ کی گوشت خور اور شراب نوش قوم کو مستثنیٰ کر دینا۔ یہ سارے جرائم سینٹ پال ہی کے پیدا کیے ہیں، ابن حزم نے اپنی ملل ونحل والی کتاب میں براہ راست بعض یہودی علماء کی زبانی یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے جو اخیار علماء تھے، انہوں نے سینٹ پال کو رشوت دے کر آمادہ کیا کہ مصنوعی طور پر عیسائی بن کر مسیح کے دین کو بگاڑ دے اور مسیح خدا کے بیٹے تھے، ان میں لاہوتی عنصر پیوست ہو گیا تھا۔ ان باتوں کو پھیلائے اخیار یہود نے اس کی ذمہ داری بھی لی تھی کہ جو کچھ گناہ ہوگا اس کا وبال ہم اپنے سروں پر لے لیں گے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ علماء یہود کی یہ متفقہ روایت ہے اور بغیر کسی شرم وحیا کے

Marfat.com

اپنے بزرگوں کی طرف چالبازی کے اس فعل کو منسوب کرتے ہیں۔ اسلام میں یہودیوں نے رخنہ اندازی اسی راہ سے کی اور عبداللہ بن سبا جو ایک یمنی یہودی تھا، اس مشن کے ساتھ مسلمانوں میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ کھڑا کیا گیا تھا، اور اس قسم کے فرقے جو حضرت علیؓ کو خدا مانتے ہیں، یا باطنی عقائد رکھتے ہیں یا صحابہ کا احترام جن کے دلوں میں نہیں ہے سب کے سب اسی یہودی فریب کے نتائج ہیں۔ (الفصل، ۱/۱۶۴، ابن حزم، علی بن احمد، مصر مطبعۃ الادبیۃ، ۱۳۱۷ھ)

ی۔ یہود جو اپنے آپ کو ابناء اللہ (خدا کے بیٹے) واحباءہ (خدا کے دوست) سمجھتے تھے، ان کی نسلی برتری کے زعم کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا، انہوں نے بنی اسماعیل اپنے چچازاد بھائیوں کا نام ہی سارا قین (یعنی سارہ کے غلام) رکھ چھوڑا تھا۔ سارا قین آج تک مسلمانوں کو اسی بنیاد پر یورپ میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل کی والدہ ہاجرہ کو حضرت ابراہیم کی دوسری بیوی سارہ کی لونڈی قرار دیتے تھے۔ حضرت لوط، حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ جو نسل حضرت لوط سے پھیلی اس کو بدنام کرنے کے لیے یہ لطیفہ تراشا گیا اور اسی لطیفہ کو کسی زمانہ میں تورات میں شریک کر دیا گیا۔

ک۔ اہل جستجو و تلاش کے لیے جہاں تک میرا خیال ہے قرآن کی مذکورہ بالا اطلاع یعنی اہل کتاب کی خیانتوں سے تم ہمیشہ آگاہ ہوتے رہو گے، ایک بہترین اور کافی لذیذ موضوع ومشغلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خاکسار نے شاید ۱۹۱۴ء سے بائبل کا مطالعہ شروع کیا ہے، اس محدود زمانہ میں بھی میرے بعض شخصی تجربات اس سلسلہ میں آدمی کو مبہوت بنانے کے لیے کافی ہیں۔ تورات کی کتاب استثناء کی مشہور پیشینگوئی جس میں سینا اور دس ہزار فاران کا ذکر ہے اس میں برابر یہی پڑھتا رہا کہ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ۔ فاران یعنی مکہ کی پہاڑیوں میں آنحضرت ﷺ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابیوں کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ صحابیوں کی تعداد دس ہزار بخاری شریف کی حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ (بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب غزوۃ الفتح فی رمضان: ۴۰۲۷، دمشق، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ)

مگر اسی استثناء کا ترجمہ جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے اسی مقام کو اٹھا کر دیکھا تو دس ہزار کی جگہ لاکھوں قدوسیوں کے الفاظ ملے۔ رسول اللہ کے جد اعلیٰ حضرت اسماعیل بن ابراہیم کے ذکر میں ہمیشہ کتاب پیدائش میں یہ الفاظ پائے جاتے تھے۔ ''وہ عربی ہوگا''

Marfat.com

لیکن اچانک عربی کی جگہ وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا، ترجمہ چھپنے لگا۔ ۱۹۳۵ء میں بھی یہی آخری الفاظ ہیں، زبور فصل ۸۴ میں بکہ کے لفظ کے ساتھ مکہ کا ذکر کیا گیا تھا لیکن میں نے اسی بکہ کے لفظ کو زبور ہی کے دوسرے مطبوعہ نسخوں میں ''وادی بقاء'' کبھی ''وادی بکاء'' کی شکلوں میں پایا اور اس کی ایک طویل فہرست میرے پاس ہے۔ چند سالوں کے اندر جس کتاب میں اتنی اہم تبدیلیاں مسلسل کی گئی ہوں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نزول توراۃ کے عہد میں جس پر تخمیناً ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مدت گذر چکی ہے تحریفی عجوبہ طرازیوں کی کتنی طویل داستان اسی کے متعلق تیار ہو سکتی ہے۔ کاش اسی کو مطالعہ کا موضوع خاص بنا کر کام کرنیوالے کام کرتے۔

حوالہ جات

۱۔ منتخب التواریخ، ۲/۲۱۴، بدایونی، عبدالقادر، ملا، کلکتہ، کالج پریس، ۱۸۶۵ء

۲۔ ایضاً، ۲/۲۹۱ ۳۔ منتخب التواریخ، ۲/۲۹۱

۴۔ منتخب التواریخ، ۲/۲۹۹ ۵۔ محولہ بالا

۶۔ منتخب التواریخ، ۲/۲۵۶ ۷۔ ایضاً، ۲/۲۷۳

۸۔ ایضاً، ۲/۳۴۹ ۹۔ ایضاً، ۲/۳۱۶

۱۰۔ تاریخ فلسفہ، (مترجم) ص ۲۴۲، ویبر، الفرڈ، مترجم، خلیفہ عبدالحکیم، حیدرآباد دکن، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۸ء

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۴۳ ۱۲۔ تاریخ فلسفہ، ص ۲۴۳

۱۳۔ محولہ بالا ۱۴۔ محولہ بالا

۱۵۔ منتخب التواریخ، ۲/۳۲

۱۶۔ منتخب اللباب، ۱/۴۶۹، خافی خان، کلکتہ 1925,Badtistmission, Press,

۱۷۔ ایضاً، ۲/۴۰۳

۱۸۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند، ص ۱۲۳، سرسید احمد خان، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲ ۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۲۹ ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔۱۲۹

Marfat.com

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰ ۲۴۔ محولہ بالا

۲۵۔ مقدمہ تفسیر، ص ۱۲، محمد حسن امروہی جن کے بارے میں یہ مضمون ترتیب دیا گیا ہے ان کی یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۹ ۲۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۳ ۳۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۴ ۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۶ ۳۴۔ ایضاً، ص ۴۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۷۳ ۳۶۔ ایضاً، ص ۳

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۱ ۳۸۔ مقدمہ، ص ۲۰۱

۳۹۔ محولہ بالا ۴۰۔ محولہ بالا

۴۱۔ ایضاً، ص ۷۳ ۴۲۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۳۔ مقدمہ تفسیر، ص ۴۶ ۴۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۴۵۔ الفتوحات المکیہ، ۱/۲۴۸، ابن عربی، محی الدین، ابوبکر، مصر، مطبع بولاق، س ن

۴۶۔ محولہ بالا ۴۷۔ محولہ بالا

۴۸۔ محولہ بالا ۴۹۔ ق/۱۸

۵۰۔ مقدمہ، ص ۶۲ ۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۲۔ حم سجدہ/۱۱ ۵۳۔ مقدمہ، ص ۶۲

۵۴۔ مقدمہ، ص ۶۶ ۵۵۔ محولہ بالا

۵۶۔ مقدمہ، ص ۶۲ ۵۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۳ ۵۹۔ ایضاً، ص ۷۹

۶۰۔ ایضاً، ص ۹ ۶۱۔ ایضاً، ص ۶۹

۶۱ الف۔ الاعراف/۲۲ ۶۱ ب۔ الاعراف/۲۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۴۵ ۶۳۔ مقدمہ، ص ۱۶۳

Marfat.com

۶۴۔ محولہ بالا
۶۵۔ مقدمہ، ص ۱۸۴
۶۶۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۶۷۔ الاعراف/ ۱۵۷
۶۸۔ مقدمہ، ص ۱۸۴
۶۹۔ ایضاً، ص ۴۲
۷۰۔ ایضاً، ص ۸۱
۷۱۔ الاعراف/ ۱۵۷
۷۲۔ مقدمہ، ص ۱۰۶
۷۳۔ ایضاً، ص ۸۷
۷۴۔ ایضاً، ص ۱۲۵
۷۵۔ المائدہ/ ۱۳
۷۶۔ مقدمہ، ص ۶۷
۷۷۔ الفتوحات المکیہ، ۱/ ۱۷۱
۷۸۔ مقدمہ، ص ۱۸۷
۷۹۔ مقدمہ، ص ۱۸۹
۸۰۔ محولہ بالا
۸۱۔ محولہ بالا
۸۲۔ محولہ بالا
۸۳۔ مقدمہ، ص ۱۹۱
۸۴۔ محولہ بالا
۸۵۔ محولہ بالا

Marfat.com

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنوں میں اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آرگن اور مجلّہ شہریہ الندوۃ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوۃ کی ترتیب و ادارت میں مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہیں۔ راجپوتانہ کی دور افتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک میں قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لیے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ میں نکل جاتا تھا۔

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دیکھا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب و نزدیکی کا ایسا مقام زندگی میں میسر آئے گا۔ جسے اب بھی سوچتا ہوں تو ''ظلِ پدر'' یا ''پدری شفقت'' کے سوا تشبیہ کے لیے کوئی دوسری چیز سمجھ میں نہیں آتی، آہ۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

مقادیر کی گردشوں نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچایا۔ ٹھیک ان ہی دنوں میں پہنچایا جب مرحوم ہی کے محاورے میں ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی۔ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاذ السلطان کی وفات کی وجہ سے حکومتِ آصفیہ کی جدید قائم کردہ وزارت (معین المہامی)

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں دسمبر ۱۹۵۰ء کو شائع ہوا۔

Marfat.com

مذہبی کی جگہ خالی ہوگئی۔ ملک کے طول وعرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ عہدے کے شایانِ شان بہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو بھیکم پور ضلع علی گڑھ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے اور سیدنا استاذ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے۔ قلم بھی ان کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیوں، درباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ

الغرض حکومتِ آصفیہ کے وزیر مذہبی کے لیے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ: جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

اباً عن جد پشتہا پشت سے جس کے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آ رہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے۔ تلغرافی پیام حیدرآباد سے ان کے نام وصول ہوا۔ فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے۔ تار میں غالباً ''ناظم امور مذہبی'' کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا۔ نظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریاں اس کے سپرد ہوتی ہیں اور اختیارات جو ملے ہیں ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ''نوکری'' کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعاً منافی ہیں، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجومِ خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا۔ دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمینِ ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست

Marfat.com

کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے، اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے، لوگ بلائے جارہے ہیں، میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے:

''میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہے کہ اس موقع سے تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لیے اعراض کیا''

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے میں جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا گیا اور حسب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظ ''ناظم'' کی وجہ سے شروع میں مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی مگر بارگاہِ خسروی سے جب تصریح ہوگئی کہ ''صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی'' اس منصب کا سرکاری نام ہوگا، جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، پھٹ کر صاف ہوگیا۔ ''ناظم امور مذہبی'' کا عہدہ ان کے تحت کر دیا گیا۔ جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار جنگ، مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم ان کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہوگئے۔

نواب موید الملک سر علی امام مرحوم نے جب ''باب حکومت'' کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو بابِ حکومت کے صدر کا نام صدر اعظم اور اراکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے بعد کیا ہوئی اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم ہوگیا۔ (الف)

خیر میں کن باتوں میں مشغول ہوگیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا تو اس وقت حیدرآباد کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والا صفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو

Marfat.com

ختم ہو چکا تھا۔لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنوں میں چونکہ شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے سن وسال وضع وقطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی۔تھوڑی دیر کے لیے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا لیکن دراصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے جب دوسری دفعہ درِ دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا۔ایک انگریز کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی۔اسی میں مقیم تھے وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی۔باہر برآمدے میں کرسیوں پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ان میں اونچے نیچے سرکاری، غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے۔ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے میں بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس میں صورت کی شناخت بھی دوسروں کے لیے دشوار ہوتی ہے، مگر سنیے ان کی نظر چلمن کی تیلیوں سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے ان پر پڑتی ہے اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں اندر سے آتی ہے:

''مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہیں ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجیے''۔

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرما دیا گیا اور آپ کا خاص خادم ''محبوب مرحوم'' باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں، حاضر ہو گیا پاس بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت وعطوفت کے ساتھ فرمانے لگے کہ:

''آپ کے لیے اجازت وغیرہ کے قصوں کی ضرورت نہیں، جب آنا ہو، بے تکلف چلمن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجیے''۔

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ میں حضرۃ الاستاذ

Marfat.com

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ہمرکابی میں خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لیے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لیے اورنگ آباد ہی میں قیام فرما تھے۔ خلد آباد بھی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع میں استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں وطن (اعظم گڑھ) جارہا ہوں، خاکسار کا نام لے کر فرمایا کہ ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپ کی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔ حضرۃ الاستاذ وہیں سے اعظم گڑھ کے ارادہ سے روانہ ہوگئے اور رفاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے۔ اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دارالامارہ میں مقیم تھا حکم دیا گیا کہ شہر میں گھوم گھوم کر قلمی کتابوں کا پتہ چلاؤں، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ نواب صاحب کے منشاء کو پاکر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی۔ اس سفر میں بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت میں حیدر آباد واپسی ہوئی اورنگ آباد ہی میں فقیر بھی ان سے مانوس ہوگیا اور ان کے لطف وکرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا ہی رہا۔ امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کردیا۔

کم وبیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت ان کے زیر سایہ حیدر آباد کی زندگی گذری اس عرصہ میں سرکاری غیر سرکاری شعبوں میں ان کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لیے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہاں سرسری طور پر بعض نمایاں خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہیں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

جس وقت نواب صاحبؒ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ میلادی مجلسوں کا حیدرآباد میں جو رواج تھا، ان میں عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیاں بنائے ہوئے تھے۔ میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیوں میں سے کسی ٹولی کو دعوت دے دیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والوں کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہنچ جاتی اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے ایک خاص لہجہ میں پڑھتے رہتے، تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانوں کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع میں حیدرآباد کے مسلمانوں کے گھروں میں میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانوں تک پہنچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ بھجن گایا جا رہا ہے۔ کچھ ایسے لب ولہجہ میں یہ لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے کہ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانوں کی ان ٹولیوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں منسوب کرتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب

لیکن سنی سنائی باتوں سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہاں کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی۔

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسوں کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلوں میں تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا۔ لیکن اصلاحی اقدامات میں عملی شرکت کے لیے کوئی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ نواب صاحب نے اس کا خیال کیے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو۔ سیرتِ طیبہ کے متعلق ان کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان وخطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ معلومات ان کے

Marfat.com

نکھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے۔ جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے ''سیرت طیبہ'' کے مختلف پہلوؤں پر مسلسل پر مغز، مؤثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگوں کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسوں کے اجتماعی مجلسوں کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ یہ ہے کہ بھلائے نہیں جاسکتے۔

جلسہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسوں کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کروں، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ میں پہلا نمونہ قائم کیا۔ پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلوں اور بستیوں میں شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی ایسی بستی باقی رہ گئی جس میں سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم و انتظام، فرش و فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو۔ اور نہ نواب صاحب اس عرصہ میں بیان کرنے سے کبھی تھکے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی تقریروں کے سننے والوں میں مجھے اکتا جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ ان کی تقریریں موضوع جعلی حدیثوں، جھوٹے تراشیدہ افسانوں، بلکہ شعر و نغمہ کی دل چسپیوں سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھیں۔ بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، رواں ہوتا تھا مگر قرآنی آیتوں سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثوں اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی میں اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسروں کی تقریر یا وعظ سننے کے لیے آمادہ ہوتی تھی۔ رئیس آدمی تھے، راحت و آرام کی زندگی کے قدرۃً عادی تھے۔ لیکن میلادی مجلسوں کے لیے نہ وقت کا سوال ان کے لیے باقی رہتا تھا اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بارہ بارہ بجے تک کبھی واپسی ہوتی، لیکن میں نے کبھی

Marfat.com

ان کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہیں پائی۔(ب)

غلط عقائد، بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم ورواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی ان کی عالمانہ تقریروں سے ہوتی چلی جاتی تھی۔لیکن مجھے یاد نہیں ہے کہ کسی کو کسی زمانہ میں ان کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ وفساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا، لیکن تلخی ان کے بیان سے کبھی پیدا نہیں ہوئی۔فہمائش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا، جس کی نظیر اپنے تجربہ میں تو نہیں ملی۔ دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت، وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ میں حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے اور اپنے فیصلوں پر ان کو کافی اصرار تھا، تقریروں میں وہ اپنے فیصلوں کے حدود سے سرمو متجاوز نہ ہوتے تھے۔مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والوں میں بھی ان کی باتوں سے کسی قسم کی گرانی پیدا نہ ہوتی تھی اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان مختلف جتھوں کے افراد کے قلوب میں غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ ان کے متعلق پایا جاتا تھا۔اس راہ میں تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائروں میں بھی ان کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا۔''امور مذہبی'' کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے میں مسلمانوں کے مساجد ومقابر اور دوسرے مآثر کے ساتھ ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں کے مذہبی ودینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے۔اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمائندے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے درد دکھ کے قصے سناتے، ہر ایک کی بات سنتے اور حسن سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال میں میں نے تو کسی دین وملت کے ہیرو کو آپ سے شاکی نہ پایا۔حالانکہ اپنی اسلامی ودینی زندگی میں ان کا اصرار تصلب کے

Marfat.com

درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ مگر ان کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود میں اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ خلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی۔ شروانی صاحب اس باب میں غیر معمولی کردار کے حامل تھے، ان کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ اور ان کے خلفاء جانشینوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحب دل درویشوں میں ایک بڑے درویش وہ بھی ہیں، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی و مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگوں سے ان کی راہ و رسم لوگوں کے لیے باعثِ حیرت کبھی بن جاتی ہے۔ مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے اور حسن و خوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا ہر ایک میں فضل و کمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ ان کا اعتراف ان کی عجیب و غریب خصوصیت تھی۔ ایک ہی مجلس میں ان سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خاں بریلوی میں جو علمی اور عملی خوبیاں ان کے علم میں پائی جاتی تھیں ان کا بھی ذکر فرماتے۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے اور اس آتشیں مجلس کی بھپتی اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی ان کی دوستی تھی۔

حیدرآباد جس زمانہ میں فقیر پہنچایا گیا تھا، عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہیں ہوئی تھی، چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ ''جامعہ'' کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر

Marfat.com

مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی میں اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائیں گے اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے، عوام میں پھیل جائیں گے۔

حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق میں بن گئی تھی۔ نیچے سے اوپر اتنی طاقت کسی میں نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، ان کی وفات کے بعد جب شروانی صاحب ان کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہوں وہ صدر الصدور کے توسط اور معائنہ کے بعد پیش ہوں۔

شروانی صاحب نے اس سلسلہ میں بلیغ کوشش کی اور مولانا انوار اللہؒ کی رائے کا اثر سرکار والا تبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ میں کامیاب ہوئے۔ یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمان مبارک کی رو سے مقرر ہوئے۔

ابتداء میں تو ان لوگوں کو جو جدید یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیتہً مشرق میں مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہیں۔ اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دیں گے بلکہ ایکٹ میں حصہ بھی لیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

چارٹر تو منظور ہوگیا، چارٹر ہی میں شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرالیا کہ مغربی علوم وفنون کے ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشو ونما کا کام بھی اس جامعہ سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہیں، عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کر کے رکھ دیا جائے گا۔

Marfat.com

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ واری نصاب جب بننے لگا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جنب شروانی صاحب نے علاوہ شعبہ دینیات کے (جو مرحوم دارالعلوم کالج) کا جانشین اور اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی ان کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون دینیات کا بھی لزوماً لینا پڑے گا۔ ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ ''مضمون'' کی حیثیت سے نصاب میں دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا۔ مطالبہ کے لیے کچھ کتابوں کی سفارش بھی کر دی جائے گی۔ لیکن یونیورسٹی کے کلاسوں میں اس کی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ خدا خدا کر کے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون میں طلبہ کا امتحان نہ ہوگا۔ مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے۔ کہ تعلیم بھی اور امتحان بھی ہوگا۔ وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک جبری عنصر جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب میں باہر سے بزور داخل کرا دیا گیا تھا، اسی لیے دباؤ کے ہٹتے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا۔ جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سیکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا، جس کا ظہور اب ہوا ہے۔

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے قصوں میں جو پیش آیا وہ شعبہ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی ان کی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کر کے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے۔

اس کامل ایک جگ یا قرن میں اور اور کیا کیا قصے پیش آئے، انہیں کہاں

Marfat.com

تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر غایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے جو ہر موقع پر ان کے قدم کا رخ بدل دینا چاہتی تھی۔

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے۔ ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزاموں کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو، یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشست گاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابوحنیفہ ''ابتلیت بہ فصبرت'' انہوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر ان کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں ''نہیں'' کا جواب سن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا:

''اپنی بیویوں کو آپ لوگ اپنی ذات کے لیے مختص سمجھتے ہیں''

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے ہنس کر چپ ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحب نے عجیب بات پوچھی۔

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لیے بھی بھیج دیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی مداحی میں ایک مقالہ ایک خاص نقطہ نظر کے پروفیسر کی نگرانی میں کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی اور مذہبی نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے ان کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دل چسپ تھے۔

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقوں کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک

بسا اوقات پہنچائی جاتی ہیں کہ ''نیرو مائنڈ'' کا عیب اس شخص میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند میں تو اسی کو سمجھتا ہوں۔

مگر ایک پہلو ان کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہیں بیسیوں مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویوں کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے۔ لیکن ان کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی اسی پر عمل کرتے۔ جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبہ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا۔ قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ میں بھی انگریزی ادب کی تعلیم طلبہ کے لیے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں معیار ان کے نصاب کا پست تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے میں شعبہ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا لیکن انگریزی آپ لوگوں کو نہیں آتی۔ اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے۔ خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی کہ شعبہ دینیات کی انگریزی فنون و سائنس کے مساوی کر دیجائے۔ بلکہ انگریزی ادب کی تعلیم و امتحان تینوں شعبوں کی چاہیے کہ مشترک ہو۔ قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف میں غالب تھی اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالاں تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبہ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبوں کے مساوی کر دی جائے۔ بالآخر اسی کو طے کر کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

قدامت و جدت کا امتزاج ان کے اندر کچھ عجیب و غریب طریقہ سے ہوا تھا۔ ایک طرف کوٹھی کے پائیں باغ میں ورد و وظائف و تلاوت میں بھی مشغول پائے جاتے اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی

انگریزی روزنامہ کے مطالعہ میں مشغولیت بھی ان کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہیں تھے لیکن کریم النفس، فیاض امیر باذل ہونے میں بھی شک نہ تھا۔ حیدرآباد میں ان کو دو ہزار ماہوار کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی۔ لیکن جہاں تک فقیر جانتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لیے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آ جاتی تھی ان کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند ان کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتوں کا سلسلہ موسم سرما میں مہینوں جاری رہتا، ہر شب میں ایک ایک ٹولی ہم مذاقوں کی مدعو ہوتی۔ آج بھی ان کی شب دیگی دعوتوں کا ذکر کام و دہن میں یاروں کے ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

میں اس سلسلہ میں دوسروں کا ذکر کیا کروں، ملازمت کے ابتدائی سالوں میں مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی میں تھا، میں تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی اس سے مطلع کیا۔ جواب میں صرف استمزاج کا خط ہی نہیں آیا بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی۔ خط میں میرے بھائی کو انہوں نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج میں مصارف کا خیال نہ کرنا جتنے روپے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمد للہ نہ ہوئی لیکن ان کے شریفانہ برتاؤ کی یاد دل میں جب کبھی آ جاتی ہے، چشم پرآب ہو جاتا ہوں۔ اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگوں کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہاں پائیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے ان کی صحبت و رفاقت میں خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ میں رچ گئے۔ انہوں نے انسانی زندگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگاموں

Marfat.com

سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے۔ یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والوں کی بے قدریوں کا عام دکھڑا ان کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ میں دستور ہے ہو رہا تھا۔ سنتے رہے پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپ کے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے آپ کے امام ابو حنیفہ جیل میں کب گئے تھے اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلاوطنی کی سزا کیا ان ہی دنوں میں بھگتنی نہیں پڑی تھی جب دنیا پر مسلمانوں ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ سمجھاتے کہ آپ کے بزرگوں نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہیں رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہو لے۔ مولویوں کے لیے بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کے دروازے کھل جائیں، تب کام کریں گے۔

اس دن کچھ ایسے انداز میں تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں میں نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا اس کا نقطہ نظر ہی بدل گیا۔

حیدر آباد کی مسجد چوک میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ شروانی صاحب نے اس جلسہ میں تقریر کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجدد کی خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا۔ مجدد سے پہلے مغلوں کے تخت پر اکبر و جہانگیر اور مجدد کے بعد شاہ جہاں و عالمگیر ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر میں کیا بتاؤں کہ اس سلسلہ میں انہوں نے معلومات کے کن خزینوں کو وقف عام فرمایا۔ بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطہ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا تو اس مقالے کے لکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

ان کی خانگی مجلسیں بھی علم و ادب کی مجلسیں تھیں۔ معلومات کا غیر معمولی

Marfat.com

ذخیرہ ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گویا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو ان سے مجھے نہیں ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہیں مجھے اس پر فخر ہے، ان سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے، تفصیل کے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

وہ بڑے صاف ستھرے اجلی زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی میں مشکل ہی سے حیدرآباد میں کوئی دوسرا آدمی ان کا مدمقابل بن سکتا تھا ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی۔ کوٹھی بھی ان کی سول لائن سوا جی گوڑہ کی کوٹھیوں میں ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، بعضوں میں ان کے اس طرزِ عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی مگر یہ جو کچھ تھا صرف ظاہر میں تھا باطن میں ان کے کچھ نہ تھا۔ خیال آتا ہے کہ سفر حج کا عزم جب فرمالیا گیا تو فقیر کو علی گڑھ طلب کیا گیا، پہنچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو۔ بسر و چشم قبول کیا گیا۔ منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہنچے یہاں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمدؒ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شروانی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظہ کے نہاں خانہ میں

Marfat.com

گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا ان کے ساتھ ہم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے۔

''بارالہٰا! یہ حبیب الرحمٰن شروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

بارالہٰا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے،

بارالہٰا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال اور جب گور کے خلوت خانہ میں حبیب الرحمٰن خاں کو لوگ رکھ کر واپس آ جائیں اور غریب وہاں تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال و جواب میں یہ بے چارہ ثابت قدم رہے۔

بارالہٰا! جب حشر کا میدان قائم ہو اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہوں تو اس بے چارے حبیب الرحمٰن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہوں کو بخش دے اور بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لے جائیں''۔

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے، یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہ ان کے الفاظ تھے لیکن بہت سے الفاظ ان کی زبان سے نکلے ہوئے اس میں محفوظ ہیں، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہیں، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، سارا مجمع مجسم گریہ و بکا بنا ہوا تھا آخر میں فرمایا کہ

''اے اللہ اس غریب پر اس کے حج و زیارت کے سفر کو آسان فرما''

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتوں کی تصویر مرد عاقبت بین کے سامنے تھی وہ ہم سب کے سامنے بھی آجائے گی ان پر ان کا ناگزیر وقت آ گیا اب وہ تنہا اس عالم میں ہیں، جہاں ان کے اعزہ ہیں نہ اقرباء، نہ احباب ہیں اور نہ

Marfat.com

دوست ،نئی دنیا ہے، نئے رفقاء ہوں گے، نئے حالات ہوں گے، آدمی خواب میں بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچے گیا اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہوکر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے، اپنے حقیقی مرقد (خواب گاہ) میں کچھ یہی صورت ان لوگوں کے سامنے پیش آتی ہے جو اس دنیا والوں سے تو الگ ہو جاتے ہیں لیکن نئی دنیا میں نئی ولادت ان کی ہوتی ہے۔

فاللهم اغفرله و ارحمه كن اللهم انيسه واجعل له من الملائكة والانبياء والاولياء رفيقا.

قلم ہاتھ میں آ گیا ہے قصداً اس کو اگر نہیں روکتا ہوں تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرؤالقیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر:

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آ جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لیے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر میں ان ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

''مجلس مذاکرات علمیہ'' ان ہی کی سرپرستی میں ایک علمی مجلس قائم تھی، جس میں شہر کے ممتاز اہل علم وادب جن کا علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس میں اپنی زبان مبارک سے اردو کی یہ غزل سنائی تھی۔ اس کا کیف واثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، ''تیری'' کی خطابی ضمیر سے کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انہوں نے لکھی تھی، دل اس خطاب کے رخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کر کے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا:

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری
خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

Marfat.com

رہینِ صحنِ گلستان نہیں دل افزائی
شمیم لطف دل وفزا ہے کو بکو تیری

اس کو بکو سے ذہن اس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہاں آج کل یہ فقیر کچھ دنوں سے مقیم ہے۔ انہوں نے بہار کے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آ جاتا ہے اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے:

ہنوز دشتِ ختن نافہ زار عالم ہے
کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے:

فرشتہ اجل آئے پری کے قالب میں
بوقت مرگ جو صورت (ج) ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاءاللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا

خیالِ لطف سے حسرت ہے باغ رضوان میں
سنا ہے جب سے کہ لطف وکرم ہے خو تیری

اب ان کا ''شنیدہ'' انشاء اللہ الملک الکریم الجواد ''دیدہ'' بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ و طاب ثراہ.

Marfat.com

حواشی

الف۔ قیام بابِ حکومت کے بعد زیادہ منظم شکل میں اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائریکٹر) اور ناظم کا معتمد (سیکرٹری) ہوتا تھا جس کی معتمدی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک بابِ حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیراعظم کا نام مدارالمہام اور اس کے رفقائے کار وزراء کو معین المہام کہتے تھے۔ بابِ حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدرالمہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی میں صدرالصدور کی حیثیت کیا ہوگی۔ سرعلی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا کہ صدرالصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی جس کا رتبہ صدراعظم اور وزرائے کابینہ سے بھی بلند تر ہے۔ اسی لیے شروانی صاحب کو بابِ حکومت کا رکن نہیں بنایا گیا اور محکمہ مذہبی کی نمائندگی کے لیے بابِ حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغوں کے ساتھ اس صیغہ کی نمائندگی بھی ضم کر دی گئی۔ ابتداء میں اس عجیب وغریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا۔ لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھیے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی، جس کی تفصیل اب غیرضروری ہے۔ تلک امة قد خلت لها ما کسبت ولکم ما کسبتم یغفرالله و لهم اجمعین.

ب۔ خاکسار بھی ان میلادی مجالس میں اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریباً لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنوں سے تو خون جاری نہیں ہوا اور آپ کے دانت نہیں توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے، شرم سے گردن جھک گئی۔

ج۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والوں سے پہلی بات یہ پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی هذا الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو) یہ رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، سوختہ سامانوں کا سارا سامان اسی بشارت میں پوشیدہ ہے۔

Marfat.com

حضرت حکیم سید مولانا برکات احمد صاحب ٹونکیؒ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی خبر جس وقت دکن پہنچی اسی زمانہ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کا یہ گرامی نامہ خاکسار کے نام شرف صدور لایا۔

مکرمی مولوی سید مناظر احسن، السلام علیکم، مولانا برکات احمد صاحب مرحوم کے حالات میں ایک اچھا سا مضمون معارف کے لیے لکھ دیجیے۔ حالاتِ زندگی، خاندان، تحصیل علم، ٹونک کا تعلق، خصوصاً تدریس کا شغف اور طرزِ تعلیم زیادہ وضاحت سے تحریر ہو، نیز یہ کہ کس کس علم سے خاص مناسبت تھی۔ اخلاقی و ذاتی اوصاف، ممتاز تلامذہ، وغیر ذلک ما یناسب، پراگندہ خاطر پراگندہ قلم سے صرف فرمان کی تعمیل کی جاتی ہے۔ بھولے بسرے خیالات کو جس طرح ممکن ہوا جمع کر دیا گیا ہے۔ واللہ یقول الحق و ھو یھدی السبیل

آبائی وطن (بہار)

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ مشہور ٹونکی نسبت سے ہیں۔ لیکن آپ کا وطن اور آپ کے والد مرحوم کا مولد و منشاء، شیرازِ ہند (الف) کا وہی علاقہ ہے جس کے ایک فرزند بلند طالع نے عہدِ اسلام کے مشرقی عقلیات کے سمندر موّاج کو سلم و مسلم کے کاغذی کوزہ میں نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور جس نے بقول علامہ شبلی مرحوم ایک صدی سے زیادہ زمانہ تک اسلامی مدارس کے نصاب کے نصف حصہ کو ہندوستان سے بخارا

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں مارچ و اپریل ۱۹۲۹ء کو تین اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

تک اپنے پنجے میں دبا لیا تھا۔ مشرقی ممالک کے علمائے اسلام کا کمال اس عہد میں صرف اس سے وابستہ تھا کہ ملا محب اللہ بہاری مرحوم کی اس ایجازی انشاء کی نادرہ کاریوں کی تشریح وتحشیہ کرسکیں۔ دہر کی ان عجوبہ طرازیوں کو کیا کہیے کہ ہندوستان کی قدیم ہندو منطق کی بنیاد علم ومعرفت کے اسی دھار (ب) (بہار) کے علاقہ ترہت میں گوتم رشی (ج) نے ڈالی جو بنائے شاستر کے نام سے اس وقت تک مشہور ہے اور پھر مشرق کی قدیم آزاد تعلیم کے آخری علم بردار حضرت مولانا سید برکات احمدؒ کی خمیر بھی اسی صوبہ کی مٹی سے تیار کی گئی۔ ہندو جس منطق کو اپنے علمی دور میں پڑھاتے تھے، اس کا بانی بھی بہاری تھا اور مسلمان جس منطق وحکمت کا درس ہندوستان میں دیتے تھے دیکھو تو کہ اس کا خاتمہ بھی ایک ایسے فرد پر ہوا جو نزیلا نہ سہی لیکن وطناً بہاری تھا۔

میرنگر ضلع (پٹنہ)

دریائے گنگا بہار کے جگر کو سیراب کرتی ہوئی بنگال میں پہنچتی ہے اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار کے اضلاع پٹنہ ومونگیر کا وہ حصہ جو گنگا کے جنوبی ساحل سے ملا ہوا ہے اپنی زرعی خصوصیات کے لحاظ سے صوبہ کا ارض ریف (د) (ٹال) سمجھا جاتا ہے۔ اسی ٹال میں سرمیرار جس کے ایک شہباز (ھ) نے اکبرآباد کے کشکول قلندری کو اردو ادب کے آسمان کا نیر درخشاں بنا دیا سے متصل زیدی واسطی سادات کی ایک چھوٹی سی بستی میرنگر کے نام سے آباد ہے۔ غالباً اشرافِ عرب کے شرفِ انتساب وسکونت نے اس کو یہ نام دیا کیونکہ اسلام کے مشرقی ممالک میں فاطمی امیروں اور حسنی وحسینی شریفوں کے اسمائے گرامی سے پہلے میر کا لفظ تعظیماً وکراماً عموماً بڑھا دیا جاتا ہے جو غالباً لفظ امیر کا مخفف ہے۔ مشہور علمائے سادات سید شریف جرجانی اور سید زاہد ہروی میر ہی کے نام سے اسلامی ادبیات

Marfat.com

میں یاد کیے جاتے ہیں اور اول الذکر کے متعدد حواشی تو صرف لفظ میر سے موسوم ہیں۔ شرحِ مطالع اور قطبی دونوں کے ساتھ کسی زمانہ میں میر نامی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ بہر حال حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے آبائی وطن ہونے کی سعادت صوبہ بہار کے اسی گاؤں میر نگر کو حاصل ہے جو ضلع عظیم آباد پٹنہ کے علاقہ میں واقع ہے۔

میر نگر کی امّیت

اگرچہ بہار کے اضلاع پٹنہ، مونگیر، گیا، آرہ اور بھنگر، مظفر پور وغیرہ میں متعدد مقامات پر سیدوں کی علم ریز، جواہر خیز بستیاں ہیں۔ قدیم وجدید ہر دور میں صوبہ کا علمی اور دماغی پرچم شہروں سے زیادہ ان ہی دہقانی خانوادوں کے اولوالعزم افراد کے ہاتھوں میں رہا اور اس وقت تک ہے لیکن عجیب بات ہے کہ امیت کی عربی شان سادات کی بستیوں میں سے جس بستی پر بہت زیادہ نمایاں ہے وہ صوبہ کے دارالخلافت پٹنہ کا یہی قریہ میر نگر ہے۔ شرافت نسبی کی وجہ سے گردونواح کے سادات کی برادریوں کا سلسلہ میر نگر والوں سے ہمیشہ سے جاری ہے۔ لیکن اس میل جول کے باوجود کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ کیوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ میر نگر والے اپنی قدیم امیت (ناخواندگی) کے نقطہ سے اس وقت تک بہت کم ہٹے ہیں الا ماشاء اللہ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ افسونِ فرنگ سحر مغرب کے طلسم کدہ کی تعمیر میں، فاتح خیبر کے ان بچوں کے کاسہ سر دل وجگر سے بہت کام لیا گیا، بہت مشکل سے چند نفوس اس گاؤں میں ایسے ملیں گے جو کالجوں اور اسکولوں میں نہیں کونسلوں اور اسمبلیوں میں نہیں بلکہ صرف معمولی کچہریوں میں سرکاری احکام کی تعمیل کے لیے مقرر ہوں۔ حالانکہ ان ہی کے برادری والے جو دوسری بستیوں میں آباد ہیں ان میں وہ سب کچھ ہے جس کا نام عہد دجل میں ترقی وعروج ہے۔ بہر حال غریب میر نگر ایک قریہ امیہ ہے، امیوں کی آبادی ہے۔

Marfat.com

لیکن کیا کیا جائے کہ معماروں نے جس پتھر کو روکا تھا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ پیمانوں کے صغر و کبر کا اگر خیال نہ کیا جائے تو دنیا تاریخ کے ان اعادوں پر ہمیشہ حیرت کرتی ہوئی نظر آئے گی اور کرتی رہے گی۔

یہ شاعری اور مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسی قریہ امیہ کی تاریکیوں میں وہ آفتاب چمکا جس کی درسی اور علمی شعاعیں صرف ہندوستان کے لیے نہیں، مشرق کے لیے نہیں، بلکہ سچ پوچھو تو عالمِ اسلام کی قدیم عقلیات اور آزاد تعلیم کی واپسیں اور آخری شعاعیں تھیں امام الحرمین، غزالی، رازی، طوسی، قطب شیرازی، قطب رازی، سید سند، دوانی، قطب سہالی، ملا نظام الدین فرنگی محلی، علامہ بحر العلوم، خاندان خیر آبادی نے مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور عقلی ارتقاء کے لیے تعلیم کا جو نظام قائم کیا تھا، دیکھو! کہ وہ ۱۳۴۷ء کی یکم ربیع الاول کو غروب ہوگیا، اب کیا پھر مشرق کے افق سے علم کے اس آفتاب کے طلوع ہونے کی کوئی امید کرسکتا ہے۔ کیا دہلی لکھنؤ، کابل، بخارا، سمرقند، قسطنطنیہ، شیراز، قاہرہ، تیونس، کے مرحوم مدارس انگورہ، طہران جدید قاہرہ وغیرہ میں اپنی پچھلی خصوصیتوں کے ساتھ زندگی حاصل کرسکتے ہیں؟ جہاں انہیں ہمیشہ کے لیے دفن کردیا گیا۔ اچھا ہوا، یا برا ہوا، اس سے بحث نہیں۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کے جس نظام پر بربادی آئی کیا یہ اس کی آخری بربادی نہیں تھی۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ اس قدیم نظام کے درس کو اپنی ظاہری و معنوی خصوصیتوں کے ساتھ اس آخری دور میں صرف حضرت الاستاذ قدس سرہٗ نے قائم کر رکھا تھا اور اسی لیے ان کو تعلیم کے اس نظام کا آخری علم بردار خیال کرتا ہوں۔ فما ھو بقول شاعر

خاندان

میرنگر کے متعلق عرض کرچکا ہوں کہ وہاں زید سادات کا خاندان آباد ہے۔

حضرت قدس سرہٗ العزیز کا خاندانی تعلق بھی اس خانوادہ سے تھا۔ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم حاجی سید شاہ دائم علی نور اللہ مرقدہ (الخاطب بخان ریاست ٹونک) میرنگر ہی میں پیدا ہوئے۔ میرنگر اس وقت تک قریۃ الامین ہے۔ اس سے زیادہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی پہلے اس کا کیا حال ہوگا، جبکہ نہ شہروں میں کالجوں کا اور دیہاتوں میں اسکولوں کا جال اس طرح بچھا ہوا تھا جیسا کہ اس وقت ہے۔ حکیم دائم علی مرحوم اسی ماحول میں پیدا ہوئے، بڑھے، اور عمر کے ایک معقول حصہ تک وہ نوشت وخواند سے قطعاً عاری تھے۔ خدا جانے یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن میرنگر کے ایک پیرانہ سال بزرگ مجھ سے ذکر کرتے تھے کہ حکیم صاحب کھیت میں گوبر کی ہنڈیا پٹک کر بھاگے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کچھ بھی ہو بعض نامعلوم اسباب کی بنیاد پر حکیم دائم علی صاحبؒ کے دل میں طلب علم کا شوق اور داعیہ پیدا ہوا۔ میرنگر سے چند میل بجانب مغرب ان ہی سیدوں کی ایک بستی گیلانی ہے اس زمانہ میں وہاں کسی سرخ وسفید عمارت میں نہیں، ہزاروں روپے کے فرنیچروں کے درمیان نہیں بلکہ ایک خام مسجد کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے کھلے ہوئے تخت پر گذشتہ خاک نشینوں کی ایک یادگار، صرف حاضری کے رجسٹروں کی تکمیل نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ایک طرف ھدایہ اور تلویح، دوسری طرف چغمنی اور افق المبین جیسی سنگلاخ کتابوں سے لطیف حقائق، دقیق نکات ومسائل کے جھرنے جاری کر رہا تھا۔ وہ کسی وقت اگر منطق و مابعد الطبعیات کے رموز، اور پیچیدہ غوامض پر شستہ تقریر کرتا تھا، تو دوسرے وقت قاضی بیضاوی کے تفسیری اسرار اور تفتازانی کے بیانی وبدیعی نظریات کو مفت بانٹ رہا تھا۔ ان کا نام مولانا محمد احسن گیلانیؒ تھا جو اپنے وقت میں صوبہ کے سرآمد روزگار فضلاء میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور جن کی تہذیب وتدوین تحشیہ وتصحیح سے طوسی کے اقلیدس کا پہلا مقالہ عربی مدارس میں اس وقت تک

پڑھایا جاتا ہے۔

حکیم دائم علی صاحب کے طلب علم کی پہلی منزل طبعی طور پر گیلانی کو ہونا چاہیے تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ مولانا محمد احسن مرحوم سے آپ کی رشتہ داری بھی تھی، اور یہی ہوا کہ میر نگر کا وہی لڑکا جو صبح کو کسی کھیت میں تھا شام کو گیلانی کے اس شجرِ معرفت کے نیچے دیکھا گیا، گیلانی میں اس وقت صرف بہار ہی کے طلبہ نہیں پڑھتے تھے، بلکہ بالائی ہند حتی کہ سرحد کی پہاڑیوں سے طلبہ کی ایک جماعت علم کے چشمہ شیریں کے آگے مصروف استفادہ تھی۔ حکیم دائم علی صاحب بھی طلبہ کی اس جماعت میں داخل ہو گئے۔ صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے ابتدائی منازل انہوں نے حسب دستور قدیم کسی اعلیٰ جماعت کے طالب العلم کے ذریعہ سے طے کیے اور بالآخر درس نظامیہ کا ایک بڑا حصہ انہوں نے اسی گاؤں میں ختم کیا۔ اس منزل کے بعد ان کے علمی سفر کے منازل اور کہاں کہاں طے ہوئے مجھے اس کا تفصیلی علم نہیں۔ تاہم گیلانی کے عہدِ طلب میں ان کا جو خطاب تھا اس کی اطلاع مجھے اس وقت ہوئی جب ابتداً پڑھنے کی غرض سے میں ٹونک میں حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں اپنے وطن گیلانی، صوبہ بہار سے حاضر ہوا تھا۔

میں ٹونک اپنے عم مغفور و مرحوم مولانا حکیم حاجی حافظ سید محمد ابو النصر گیلانی نور اللہ ضریحہ ابن مولانا محمد احسن گیلانی کے ساتھ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک اچھا مجمع تھا جس میں مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کے شاگرد مولوی محمد اسماعیل مرحوم سابق مینجر صغریٰ وقف اسٹیٹ (بہار) بھی تھے۔ ہم لوگ بعد مغرب ٹونک پہنچے ہیں اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کروں بیجا نہ ہوگا، کہ ان بزرگوں کی معیت کے طفیل میں مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی تھی کہ حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد صاحبؒ ٹونک سے تقریباً دو میل آگے نکل کر بناس ندی کے کنارے ہمارے استقبال کے لیے

موجود تھے، مطلوب کی یہ شانِ طالبیت عجیب تھی۔

حضرت الاستاذ نے ان لوگوں سے اپنے والد ماجد کی طرف سے یہ عذر پیش کیا کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے وہ یہاں تک نہ آسکے۔ بہر حال مغرب کے بعد ہم لوگ حضرت حکیم صاحب کے در دولت پر پہنچے، حکیم دائم علی صاحب ہمارے انتظار میں تھے۔ مولوی اسماعیل صاحب نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میرا تعارف حکیم صاحب سے کوئی نہ کرائے۔ دیکھوں کہ اتنی مدت کے بعد وہ مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں؟ الغرض حکیم دائم علی صاحب مرحوم جب سامنے آئے اور ایک ایک سے گلے ملنے لگے، جب مولوی اسماعیل صاحب کی باری آئی تو چند سیکنڈ کے غور کے بعد یکا یک یہ عجیب منظر آنکھوں نے دیکھا کہ جوانی کے بچھڑے ہوئے دو سفید ریش بزرگ ایک دوسرے کے سینے سے لپٹے ہوئے تھے، لبوں پر ہنسی تھی اور آنکھوں میں آنسو، رقت کے ساتھ حکیم دائم علی صاحب نے فرمایا کہ کہو یار شیخ الاشراق اچھے ہو۔ مولوی اسماعیل نے اس کے جواب میں فرمایا فرمایئے صوفی صاحب آپ تو بعافیت رہے۔ (او کما قال) بہر حال اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ برگد کے درخت کے نیچے ایک شیخ الاشراق اور دوسرا صوفی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مولوی اسماعیل صاحب کی اشرافیت کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن حکیم دائم علی صاحبؒ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں نہ حکیم تھے اور نہ عالم، بلکہ صرف صوفی تھے۔ حضرت سیدنا الامام مرشد العلماء حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرید و خلیفہ ہوئے اور عمر کا پچھلا حصہ انہوں نے صرف صوفیانہ مجاہدات باطنی ریاضات میں بسر کر دیا۔ بہر حال میں موضوع سے کچھ دور ہو گیا۔ ذکر حکیم دائم علی صاحب مرحوم کا تھا۔ گیلانی کی تحصیل کے بعد حضرت حکیم صاحب مختلف درس گاہوں کی سیر کرتے ہوئے لکھنؤ رامپور کو دیکھتے ہوئے علم حدیث کی تکمیل غالباً مولانا عالم علی صاحبؒ مراد آبادی نگینوی سے کی اس کے بعد

اجمیر شریف پہنچے ، اجمیر شریف سے فن طب کی تکمیل کے لیے ٹونک آئے اس زمانہ میں والی ٹونک کے جو طبیب خاص تھے ان سے پڑھنا شروع کیا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ٹونک میں حضرت حکیم صاحب کی طالب العلمی کا زمانہ نہایت سخت تھا۔ عسرت اپنے انتہائی مدارج کو پہنچ چکی تھی کہ ایک دن خواب میں انہوں نے اجمیر کے خواجہ اور ہندوستان کے سلطان الاولیاءؒ کو دیکھا، فرماتے ہیں کہ میاں سید گھبراؤ نہیں ، خدا تمہاری مشکلات کو آسان کر دے گا اور یہ فرما کر کچھ صندل اور غالباً چند پیسے انہوں نے حکیم صاحب کے حوالہ کیے غالباً اس زمانہ میں ایسی باتیں افسانہ سمجھی جائیں ۔لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ بیداری مین صندل وغیرہ تو نہیں مگر ایک پیسہ حکیم صاحب کے ہاتھ میں موجود تھا۔ میں نے اس پیسہ کی خود زیارت نہیں کی لیکن مسند برکاتی کے جانشین مولانا حکیم محمد احمد صاحب جو حضرت الاستاذؒ کے خلف الرشید ہیں ، ان سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ یہ عجیب وغریب پیسہ ان کے خاندان میں اس وقت تک موجود ہے؟ وسواسین اس ذریعہ سے اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں ۔اس عجیب وغریب رویا کے بعد، صبح کو یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ حکیم صاحب کے استاذ حسب معمول نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اس وقت ریاست کے والی نواب محمد علی خاں مغفور تھے جن کو بعض خاص اسباب کی بنیاد پر برٹش گورنمنٹ نے بنارس میں نظر بند کر دیا تھا، نواب صاحب نے اپنے معالج سے فرمایا کہ حکیم صاحب مجھے اپنے ولی عہد کے لیے ایک ایسے اتالیق کی ضرورت ہے جو شریف ہو، عالم ہو، متقی ہو، اور طبیب بھی ہو، حکیم صاحب نواب صاحب کی اس فرمائش کو سن کر چلے آئے ۔اور دل میں اسی شخصیت کا خیال آتا جو اجمیر کے آستانہ سے برکت حاصل کر چکی تھی ۔آتے ہی حکیم دائم علی صاحب کو بلوا کر ماجرا سنایا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر تم آمادہ ہو تو میں تمہارا نام پیش کرتا ہوں ، ضرورت موجود تھی ، اقرار کر لیا گیا، اور اسی

Marfat.com

کے بعد میر نگر کا غریب سید ٹونک کے ولی عہد کا اتالیق مقرر ہو گیا۔

اتالیقی کے چند ہی دن بعد نواب صاحب مرحوم کی نظر بندی کا واقعہ پیش آ گیا اور ہز ہائینس نواب حافظ ابراہیم علی خاں خلیل خلد اللہ ملکہ، فرمانروائے حال، تخت نشین ہوئے۔ نواب صاحب حکیم دائم علی صاحب سے مانوس ہو چکے تھے، رفتہ رفتہ ان کے اعزاز کو بڑھانا شروع کیا، پہلے وہ طبیب خاص مقرر ہوئے، اور آخر میں غالباً وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچے۔

نواب ابراہیم علی خاں بہادر کے دربار سے حکیم دائم علی صاحب پر جو دو کرم کی جو بارش مختلف اوقات میں ہوتی رہی، ٹونک کی پرانی صحبتوں میں اس کی گرمی اس وقت تک موجود ہے۔ اسی زمانہ میں معلوم نہیں کیا اسباب و ذرائع پیش آئے کہ حکیم دائم علی صاحب کی شادی ضلع مظفر نگر کے مشہور قصبہ پھلت کے اس شریف گھرانے میں ہو گئی، جس کا خاندانی تعلق حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ سے تھا، اور ان ہی بیوی صاحبہ کے بطن سے، اللہ نے حکیم دائم علی صاحب کو سب سے پہلی اولاد وہ دی جس کے علم و درس کے فیوض سے ہندوکابل، بلکہ، بخارا، سمرقند، خیوا، اور کاشغر کے طلبہ بھی سیراب ہوئے۔ حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد صاحب، حکیم دائم علی صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، آپ کی ولادت بمقام ٹونک ۱۲۸۰ھ میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم

حضرت الاستاذؒ کی ابتدائی تعلیم کا حال تفصیلی طور پر مجھے معلوم نہیں تاہم معمولی نوشت و خواند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد، شوق کا اندازہ کرنے کے بعد آپ کے والد بزرگوار نے اپنے ایک قدیم دوست اور صوبہ بہار کے مشہور عالم مولانا لطف علی صاحب دھنچھو ہوی مرحوم کو اپنے وطن سے ٹونک محض اپنے بچے کی تعلیم

Marfat.com

کے لیے بلوا لیا ، اور حمد اللہ تک معقولات کی کتابیں ، آپ نے گھر ہی پر مولوی صاحب موصوف سے پڑھیں ۔ خدا جانے اسی زمانہ میں یا کب ، لیکن حضرت بیان فرماتے تھے کہ مولانا لطف علی صاحب کے سوا ٹونک کے ایک اور عالم فقیہ مولانا محمد حسن صاحب مرحوم جو محلہ چھونی میں رہتے تھے ، ان سے آپ نے ہدایہ بھی پڑھی تھی ۔ مولانا لطف علی صاحب مرحوم پوری توجہ اور محنت کے ساتھ آپ کی تعلیم میں مصروف تھے اور یہ ان ہی کی تعلیمی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شوق و ولولہ کے جذبات میں رفتہ رفتہ ایک ایسی ہلچل پیدا ہوئی کہ ٹونک کا علمی صحرا آپ کی جستجو و تلاش کے لیے تنگ ہو گیا ۔ ادھر مولوی صاحب بھی کسی وجہ سے بہار روانہ ہو گئے ، شوق بے پروا کے شعلے بھڑک چکے تھے ، صبر کا دامن چھوٹ گیا اور بالآخر آپ کی بیتابیوں کو دیکھ کر وہی باپ جو ایک دن کے لیے اپنے سعید و ہونہار بچے کو آنکھوں سے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لیے ایک بیش تر تنخواہ پر ایک مستقل عالم کو گھر پر رکھ لیا تھا ، اجازت دے دی ، کہ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو ، اور یوں اللہ نے آپ کے لیے علم کی قدیم سنت رحلت کی راہیں درست کیں ۔

خود حکیم دائم علی صاحب اور مولانا لطف علی صاحب دونوں پر منقولات و سمعیات سے زیادہ عقلیات کا اثر تھا ، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت الاستاذؒ بھی زیادہ تر علم کے اسی شعبہ کی طرف مائل تھے ۔ تلاشِ علم کے لیے ہندوستان کے طول و عرض کی طرف نگاہ اٹھی تو سب سے پہلے اسی حلقہ درس پر نظر انتخاب پڑی ، جو اس زمانہ میں عقلی علوم کا اگر مرکز وحید نہیں تو سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں مرجع تھا ۔ میری مراد مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادیؒ کے دائرہ افادہ سے ہے ۔ خیر آبادی دراست کے شعبہ عقلیات کی امامت اس عہد میں مولانا ہی کی ذات گرامی پر ختم ہوئی تھی ۔ یہ وہ وقت تھا کہ نواب کلب علی خاں مرحوم مغفور کی مشہور عالم قدر شناسیوں

Marfat.com

اور معارف نوازیوں نے رامپور کو محط العلم اور مرجع الکملاء بنادیا تھا۔ جس فن، جس ہنر، جس علم میں ہندوستان کے کسی گوشہ سے کسی نے سر اٹھایا۔ بالآخر وہ کسی نہ کسی طرح رامپور کے بانسواڑے میں محصور ہو جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب مرحوم کی نازک تدبیروں کی ایک طویل داستان ہے لیکن ان کی علمی ناز برداریوں کا سب سے زیادہ روشن اور زریں کارنامہ یہ شمار کیا جاتا ہے کہ خیرآباد کی سبک روح بھی محض نواب صاحب کی فطری چابکدستیوں کی بدولت رامپور کے نورتن میں آخر وقت تک شریک رہی۔

بہرحال خیرآباد کا یہ علمی دریا بجائے اودھ کے اندنوں، روہیل کھنڈ کے اسی شہر رامپور کے کنارے درساً و انشاء طوفان برپا کیے ہوئے تھا اور اسی لیے حضرت الاستاذؒ ٹونک سے روانہ ہو کر سیدھے رامپور پہنچے۔ اور خیرآباد کے آستانے پر کچھ اس طرح گرے کہ چرخ نیلوفری کی گردشوں نے خیرآبادی جلال کا نسلی طور پر خاتمہ کر دیا لیکن خیرآبادیت کو ختم ہونے سے آپ نے بچالیا۔ خیرآباد صدیوں کا معہد علم و عقل خیرآباد، علمی سطوت کے لحاظ سے گویا مٹ چکا تھا لیکن اسی آہنی ارادہ نے زمانہ کی سخت کوشیوں کے باوجود خیرآبادیت کو آخر دم تک مٹنے نہ دیا۔

حضرتؒ کی طلبِ علم کی یہ مدت بہت طویل تھی، کہہ چکا ہوں کہ نظامی نصاب کے متوسطات آپ ٹونک ہی میں پڑھ چکے تھے اس سے زیادہ پڑھ چکے تھے، جتنا کہ اس زمانہ کا فارغ التحصیل عالم بھی نہیں پڑھتا۔ لیکن علم پیشہ جہل کے اقرار کو مانگتا ہے جو برتن خالی نہیں کیا جائے گا وہ بھرا بھی نہیں جائے گا، ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کے علم کی راہ کا پہلا زینہ یہی ہے۔ حضرت کی طلب صادق تھی، تشنگی سچی تھی، جو مانگا گیا، سب دیا اور بے پروائی سے دیا، دل کھول کر دیا، علمی غیرت کی پشت پر یہ کتنا وزنی بوجھ تھا کہ حمد اللہ کا فارغ شدہ طالب العلم ایساغوجی اور میزان منطق کے درجہ کی

کتابوں میں نئے سرے سے شریک ہوگیا اور جو کچھ پڑھا ہوا تھا سب کو بے پڑھا ہوا بنا دیا گیا۔

طلب وتلاش کے اس طویل ومبارک عہد میں کیا کیا واقعات پیش آئے۔ وہ ایک مستقل دفتر کا مواد ہے، ان شاء اللہ آپ کی سوانح حیات کے مستقل تذکرہ میں ان کی تفصیل کی جائے گی۔ لیکن ان میں سے دو واقعوں کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اس سے استاذ وتلمیذ کے باہمی تعلقات کا ایک عجیب وغریب مرقع سامنے آجاتا ہے۔

پہلا واقعہ

خاکسار جب حضرت الاستاذؒ سے شرح ہدایۃ الحکمۃ خیرآبادی پڑھتا تھا تو کتاب میں کسی فقرہ کا ایک جزء تقتضی الطبیعۃ الرد الیہ بھی تھا، میں جب عبارت پڑھتا ہوا اس جزء پر پہنچا تو حضرت مسکرانے لگے، میں بھی رک گیا، اس کے بعد ایک خاص انداز سے فرمانے لگے کہ میں جب اس کتاب کو مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی سے پڑھتا تھا تو خدا جانے کس بدخیالی میں مبتلا تھا کہ الرد الیہ کے دال کو واوٗ مشدد خیال کر کے روّالیہ پڑھ دیا۔ فرماتے تھے کہ ادھر منہ سے روّالیہ نکلا اور دوسری طرف میری کتاب دور پھینکی ہوئی تھی، مولانا عبدالحق آپے سے باہر ہوگئے، غصہ سے بدحواس ہورہے تھے، اور جو جی میں آیا، فرمارہے تھے، یہاں تک کہ آخری حکم ہوا کہ میرے درس سے تم ابھی اٹھ جاؤ، میں ایسے کم سوادوں کو قطعاً نہیں پڑھا سکتا۔ اندازِ طبیعت سے اپنے استاد کے حکیم صاحب واقف تھے، خاموشی کے ساتھ اٹھے اور باہر چلے آئے، چند دن کی روپوشی کے بعد حاضری کی اجازت چاہی گئی لیکن صاف جواب ملا، ہر قسم کی کوشش اور سفارش بہم پہنچائی گئی لیکن جو گرایا گیا تھا اس کا اٹھانے والا کوئی نہ تھا، بالآخر دو تین مہینہ کی جدوجہد کے بعد بصد حسرت ویاس، حضرت الاستاذ ٹونک اپنے وطن چلے آئے۔ حالانکہ ہندوستان کے متعدد شہروں میں

Marfat.com

اس وقت بڑے بڑے اساتذہ کرام موجود تھے لیکن

پرسی کہ کراخواہی از خیل بتاں جامی: چشمے ست مرا اخر غیر از تو کراخواہم

کے سوا آپ کے دل و زبان پر کچھ نہ تھا، وقفہ سے چند مہینوں کے بعد پلٹ پلٹ کر رامپور آتے۔ سعی و سفارش کی تمام زنجیروں کو ہلاتے لیکن روٹھے ہوئے کا منانا آسان نہ تھا وہ جو بھولے بسرے، برے بھلے دن گذر گئے کون اندازہ کرسکتا ہے کہ کبھی علم کے کوچہ میں بھی استاد کی بے نیازیوں اور شاگرد کی نیاز مندیوں کا سلسلہ مہینہ دو مہینہ نہیں پورے دو سال تک جاری رہا اف اب کہاں سے لائیں وہ دشتِ جنوں پرور جہاں رقص میں لیلی رہی لیلی کے دیوانے رہے شوق یہ ہے کہ طلب کی سچی پیاس اسی کا نام ہے جن قوموں کی پیشانیوں پر بلندی کا ستارہ چمکتا ہے ان کے یہاں اس قسم کی قربانیاں نادر نہیں ہوتیں۔ قصہ تو بہت طویل ہے، خلاصہ یہ ہے، بالآخر مولانا کے خدمتگار نے حضرت الاستاذؒ سے ایک بیش قرار رقم لینے کے بعد، کچھ ایسے موقعہ سے سفارش کی کہ پورے دو سال کے بعد پھر علم کے اس دیوان خانہ میں باریابی کا موقعہ ملا۔ جہاں سے آپ ہمیشہ کے لیے جدا کر دیئے گئے تھے۔

علم کی وہ عزت کہ اس کی ایک غلطی نے ایک ہونہار شاگرد کو دو سال کی عقوبت کا مستحق قرار دیا، اور انسانوں پر وہ شفقت کہ ادنیٰ خادم کی التجا پر اتنی قدیم خفگی زائل ہو جاتی ہے، یہ مولانا عبدالحق خیر آبادی کی شاہانہ اور فقیرانہ طبیعت کے امتزاجی آثار کا عجیب و غریب نتیجہ تھا، مولانا عبدالحق کی زندگی اس قسم کے متضاد آثار و نتائج سے بالکل معمور تھی۔ حضرت الاستاذ کثرت سے ان واقعات کا ذکر فرماتے تھے کہ حضرت کی ذہنی بیداری کا یہ حال تھا کہ نواب کلب علی خاں کا دربار ہی کیوں نہ ہو، کسی قسم کے لوگ کیوں نہ ہوں، لیکن لطیف سے لطیف نکتہ آپ کے دماغ کی گرفت سے باہر نہیں ہوسکتا۔ اور دلیری یہ تھی کہ دماغ میں جو خیال آتا کچھ ہی ہو،

Marfat.com

جائے، زبان پر اس کا آنا ضرور تھا، واقعات تو بہت ہیں، لیکن ایک خاص واقعہ اس سلسلہ میں یاد آیا، فرماتے تھے نواب مولانا سے اشارۃً کبھی کبھی مذاق بھی کرلیا کرتے تھے، خصوصاً مولانا کی ذہانت اور حاضر جوابی سے لذت گیر ہونے کے لیے کوئی اس قسم کا واقعہ قصداً کرادیتے تھے کہ مولانا کی زبان سے ایسی باتیں بے اختیار نکلنے لگیں، ایک دن مولانا نواب کے دسترخوان پر تھے، نواب صاحب نے خادم کو اشارہ کیا کہ ہڈیوں کو کسی رکابی میں جمع کر کے مولانا کے سامنے رکھ دو، رکابی مولانا کے سامنے آئی اور زبان پر یہ جملہ جاری تھا، خدمت گار سے فرمارہے ہیں ''تم غالباً مستحق کو نہیں پہنچانتے ہو، اس رکابی کو ان ہی کے آگے رکھو''۔ نواب کے نام کا پہلا جز کلب تھا (کتا) اس کی طرف اشارہ تھا، نواب اس قسم کے لطائف کے منتظر رہتے تھے، ندامت میں ڈوبی ہوئی تحسین کرتے رہے۔

بہرحال نواب کے دربار میں جرأت و دلیری، حاضر طبعی، ذہنی بیداری کا یہ حال تھا لیکن غریبوں بے کسوں کے ساتھ آپ کی مسامحت اور سہل انگاری کی یہ حد تھی کہ حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ میں ایک زمانہ میں مولانا کے باورچی خانہ کا حساب لکھا کرتا تھا۔ نوکر نے پہلے دن حساب لکھاتے ہوئے ایک جگہ کہا کہ لکھیے، پان ایک آنہ کے، پھر اور چند چیزوں کے بعد بولا کہ پنواڑی ایک آنہ، میں نے کہا کہ پنواڑی سے آخر پان ہی لینے گئے ہوں گے۔ پھر یہ ایک آنے کیسے، بولا یہاں کا حساب تو یوں ہی لکھا جاتا ہے، میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور شکایت کی، نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ تم بڑے نادان ہو، حکمت کی بنیاد صرف حیثیات اور عبارات پر قائم ہے، بحیثیت پان کے اس نے ایک آنہ لیا، اور بحیثیت پنواڑی کے کیا دوسرا آنہ نہ لیتا، لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ، فلسفہ کا عام اصول ہے، اسی نوکر نے مولانا عبدالحق خیرآبادی کو یہ باور کرادیا تھا کہ بگلے بٹیروں کو نگل گئے

اور مولانا ہر آنے والے سے اس کے بعد اس واقعہ کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ فلاسفہ تداخل کو محال سمجھتے ہیں لیکن میرے نوکر کا یہ مشاہدہ ہے کہ بیٹرے بگلوں میں کچھ اس طرح سے در آئیں کہ بگلوں کا نہ حجم بڑھا، نہ اس کے حیز میں کوئی تبدیلی ہوئی، باخبری کے ساتھ بے خبری کے یہ عجیب نظائر ہیں، بہار کے مخدوم حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ اپنے مکتوبات میں کسی ''گم گشتہ'' جماعت کا حال ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''گفتند و نہ گفتند، شنوند و نہ شنوند، رفتند و نہ رفتند، نشستند و نہ نشستند، در بود ایشاں بود نہ بود، در گفت ایشاں گفت نہ بود، گوئند گانِ گنگ بودند، در شنود ایشاں شنود نہ بود، شنوندگان کر بودند''۔

اور کسی زمانے میں ایسے محیر العقول نفوس کی مسلمانوں میں کمی نہیں تھی، خیر ان واقعات کا کہاں تک ذکر کیا جائے، میں تو حضرت الاستاذ کے عہد طلب کے واقعات بیان کر رہا تھا جن میں سے ایک گذر گیا، دوسرا واقعہ اسی کے بالمقابل یہ ہے کہ رامپور میں کسی طالب العلم نے جرم قتل کا ارتکاب کیا، پولیس نے شبہ میں جن جن لوگوں کو پکڑنا چاہا، اس میں بدقسمتی سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ حضرت الاستاذ کا نام بھی درج ہو گیا، آپ کو جب اپنے متعلق پولیس کے اس اشتباہ کی خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی، سیدھے مولانا عبدالحق کی خدمت میں پہنچ گئے مولانا نے آپ کو سراسیمہ پا کر دریافت کیا، واقعات بیان کیے، سننے کے بعد خیر آباد کے عالم جری کی زبان پر یہ الفاظ کڑک رہے تھے:

''کس کی مجال ہے کہ تم پر کوئی ہاتھ ڈالے اطمینان کے ساتھ یہاں بیٹھو، دیکھوں کوتوال تمہیں کس طرح گرفتار کرتا ہے''۔

ابھی مولانا یہ فرما رہے تھے کہ کوتوال شہر مولانا برکات احمد صاحب کی جستجو

Marfat.com

میں حضرت کے مکان کا ارادہ کر کے اپنی دوڑ کے ساتھ جھروکے کے سامنے نمودار ہوا، چہرہ پر نگاہ پڑی اور اس کے بعد بدترین گالیوں، اور توہینی الفاظ کا ایک سمندر تھا، جوابل پڑا۔ نہ صرف کوتوال ڈانٹا جارہا تھا بلکہ کوتوال سے زیادہ نواب کلب علی خاں کے نام سے صلواتیں ہورہی تھیں، فرماتے جاتے کہ تو خود کیوں آیا ہے اپنے نواب کو کیوں ساتھ نہیں لایا۔ کوتوال حیرت سے کھڑا، حضرت کا منہ تاک رہا تھا اور الٹے پاؤں غصہ میں کانپتا ہوا سیدھے نواب صاحب کی ڈیوڑھی پہنچا، اور ساری داستان من وعن نواب صاحب کو سنائی، سب کچھ سننے کے بعد نواب مرحوم نے اس کے بعد جو جملہ فرمایا وہ علم و دولت کے باہمی توازن کا ایک عجیب وغریب اعترافی فیصلہ تھا، فرمانے لگے۔

''بھائی! غلطی تو تمہاری تھی کہ تم نے ایک ایسے شخص کے مکان پر حملہ کر دیا جو کلب علی کو بھی گالیاں دے سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے اگر میری کوئی فضیحت ہوئی بھی ہے تو اس کے بانی تم ہو، نہ مولانا، تم نہ وہاں جاتے، نہ یہ باتیں سنائی جاتیں''۔

خونی تیمور کے متعلق تاریخوں میں پڑھا تھا کہ تقتازانی کے قلم کے آگے اس نے اپنی بے پناہ تلوار کو بھی یہ کہہ کر نیام میں رکھ لیا تھا کہ ''افسوس کہ جن جن ممالک کو میری تلوار نے فتح کیا ہے تقتازانی کا قلم مجھ سے پہلے ان کو فتح کر چکا تھا''۔

لیکن کیا نواب کلب علی خاں کا علمی شکوہ کے آگے، اپنی حکومت کی پیشانی کا ٹیک دینا تیمور کے واقعہ سے کسی طرح کم ہے۔ گذر گیا اور وہ زمانہ ابھی گذرا کہ عالم اسلامی کا خلیفہ اکبر، یورپ وایشیا کا مطلق العنان حاکم ایک ہندی (و)، کے آگے جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ علم جب جسم کے لیے نہیں، بلکہ علم کے لیے تھا، اس وقت اگر جسم علم سے دبا ہوا تھا تو یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

بہر حال حضرت الاستاذؒ کے عہد طلب وتعلم کے واقعات جنہیں اکثر میں

Marfat.com

نے ان کی زبانِ مبارک سے سنا، اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کے لیے حضرت کے مستقل تذکرہ کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس وقت ان دو واقعات کے پیش کرنے سے بھی میرا مقصد فقط اس قدر تھا کہ علم کے اس تجارتی عہد میں لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ کسی وقت بدقسمت ہندوستان میں بھی قلم کا پھریرا عزت کی کتنی بلند چوٹیوں پر لہرا رہا تھا۔

استاذ کے ان لامحدود حقوق مسلمہ کا کوئی اندازہ کر سکتا کہ کسی سبق سے غیر حاضری نہیں، کسی درس سے غفلت نہیں، بلکہ عمر بھر ایک لفظ کی غیر متوقع جہالت طالب العلم کو دو سال کی سزا کی مستوجب بنا دیتی ہے اور سعادت مند شاگرد اپنی کشادہ پیشانی کے ساتھ استاذ کی سزا کو جھیل لیتا ہے، جس دور میں طلبہ کے لیے استاذ کی سو باتوں میں سے صرف تینتیس (۳۳) باتوں کا سننا ضروری قرار دیا گیا ہو اپنے کو بازار میں بیچنے کے لیے، کسی عالم کے درس کی صرف پچھتر فی صدی حاضری اور وہ بھی فرضی حاضری ان علمی ساہوکاروں کو

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

کی دقیق ذمہ داریوں سے کون واقف بنا سکتا ہے۔ طالب العلمانہ نزاکتوں کا ایک نظارہ تو یہ تھا۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ساتھ استاذانہ شفقت اور فرائض کی کوئی انتہا ہے کہ ایک معمولی طالب العلم کی عزت کا معلم کو اتنا پاس ہے کہ وہ حکومت سے ٹکراتا ہے، دولت سے ٹکراتا ہے، اپنے رزق سے ٹکراتا ہے، الغرض طالب العلم کو بچانے کے لیے ہر چیز کے بچانے سے استاذ دست بردار ہو جاتا ہے، یہی وہ تعلقات تھے کہ رفتہ رفتہ استاذ باپ اور شاگرد بیٹے کے درجہ تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن طالب العلم نہیں، بلکہ طالب سند، شاگردوں سے سند دینے والے نہیں، بلکہ صرف تنخواہ کے لینے والے اساتذہ کیا توقع رکھتے ہیں۔

Marfat.com

الغرض شوق ومحنت، ولولہ وعزم کے متلاطم جذبات میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے حضرت الاستاذ نے تقریباً دس گیارہ سال کا زمانہ خیرآبادی چوکھٹ جبیں سائی میں گذار دیا۔ علمی حرص و بے قناعتی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک کتاب مولانا عبدالحق کی خدمت میں حضرت نے متعدد بار پڑھی۔ حمداللہ کے متعلق مجھ سے فرماتے تھے کہ تین دفعہ اس کو سمعاً وقراۃً پڑھا اور سنا۔ اس زمانہ میں عام طلبہ درس نظامیہ کی کتابوں کا ختم کر لینا، فراغت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن حضرت الاستاذ کے بلند حوصلہ کے سامنے، درس نظامیہ قطعاً ناکافی تھا۔ اصرار کر کے آپ نے مولانا عبدالحق سے خارج از نصاب کتابیں پڑھیں۔ جن میں بعض تو خود مولانا عبدالحق کی تالیف سے تھیں۔ مثلاً جواہر غالیہ، شرح ہدایت الحکمۃ، وغیرہ اوز یادہ ایران اور خراسان کے ان فلاسفہ اور مناطقہ کی کتابیں تھیں، جو مدت ہوئی تھی کہ ہندوستانی نصاب سے خارج ہو چکی تھیں، ان کتابوں میں شفاء ابن سینا، شرح اشارات طوسی، افق المبین، حواشی دوانی، حواشی مرزا جان، وخوانساری، مؤلفات قوشجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کا ایک تیسرا حصہ اس وقت تک مخطوط اور غیر مطبوع ہے اور یوں تقریباً ایک قرن کا زمانہ عقلیات کی تحصیل میں بسر کر کے

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید

حدیثِ نبوی کی جستجو

رامپور کا دور جس وقت ختم ہوا، تو اس وقت حضرت کو تنبیہ ہوئی، کہ دماغی محاصل کا تو ذخیرہ فراہم ہو گیا، لیکن لا ہوتی معارف کا کوئی حصہ ہاتھ نہیں آیا، اب نبوت کی روشنی میں جو علم پیدا ہوا تھا، اس کی تلاش پیدا ہوئی۔ آپ کے ساتھ مولانا ماجد علی سابق صدر مدرس عالیہ کلکتہ بھی عقلیات کے درس سے فارغ ہوئے تھے۔ دونوں کی بے چینی ایک تھی، یہ دونوں حدیث پڑھنا چاہتے تھے لیکن یہاں ایک سخت

پیچیدہ سوال تھا۔

عموماً اس زمانہ میں ہندوستان کے علم حدیث کے درس وافادہ کی ریاست یا تو شمس العلماء میاں نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم پر ختم ہوتی تھی اور چونکہ میاں صاحبؒ بھی وطناً بہاری تھے اس لیے طبعاً حضرت کا رجحان اسی طرف ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میاں صاحب اہل الحدیث والا لفاظ تھے اور یہاں الفاظ حدیث کے ساتھ ساتھ معانی وحقائق کا بھی مطالبہ تھا۔ جس کی توقع دہلوی کے درس میں بہت کم تھی، یا کم از کم حضرت الاستاذ کا یہی خیال تھا۔

میاں صاحب مرحوم کے سوا حنفی علماء میں اس فن کے اس زمانہ میں مرجع الکل رحلۃ الطلبہ کل دو حضرات تھے۔ ایک مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ ناشر و محشی بخاری اور دوسرے مولانا رشید احمد صاحب چشتی گنگوہیؒ تھے۔

الفاظ نہیں، بلکہ معانی آثار و حدیث کے طلبہ یا یوں کہیے کہ حلقہ بگوشانِ امام الائمہ ابوحنیفہؒ زیادہ تر ان ہی دو محدثوں میں سے کسی ایک کے پاس اس فن کی تکمیل وتحصیل کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان دونوں حضرات کا تعلق بھی جماعت علمائے دیوبند سے تھا، جس سے خیرآبادی درس کے علم کی معاصرانہ چشمک مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے زمانہ سے جاری تھی، یہ دونوں حضرات احیاء اسلام میں تھے۔ دین کے دونوں فدائی سبیل اللہ کے مجاہد تھے اور اسی ملی اور دینی جوش کا وہ خونیں نظارہ تھا کہ دلی کا علامہ تحریر پنجاب کے میدانوں میں سکھوں کی تلواروں کے نیچے خاک وخون میں تڑپ رہا تھا لیکن اگر دلی کا شہید، مرکر اس طرح زندہ ہو رہتا ہے تو کیا یہ غلط ہے کہ خیرآباد کا یلمعی بھی اسلام کے عشق کا مجرم قرار پاکر، قید فرنگ کی زنجیروں کو پٹکتا ہوا، انڈمان کے ساحل سے نور کی دنیا کی طرف روانہ ہوا۔ ان پاک طینت عاشقوں میں لوگوں کو رقابت نظر

Marfat.com

آتی ہے، ہوسکتا ہے مجھ سے کہو کہ ان بزرگوں کو یاد کروں اور یہ پڑھتا رہوں

بناء کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بایھم اقتدیتم اھتدیتم اوراب تو دونوں کی اقتداء گمراہی قرار دی گئی۔

علمائے سوء، رسم کی پابندیوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی پوچھ سکتا ہے کہ پابندی صرف مناظرہ ومجادلہ کے لیے ضروری ہے۔ ''خاک وخوں'' کی غلطیدن کی رسم کا زندہ کرنے والا بھی تم میں سے کوئی ہے؟

بہرحال دہلوی سلسلہ علم اور خیر آبادی خاندان والوں میں ایک علمی منافرت ضرور تھی جس کی بڑی وجہ وہی ''معاصرت'' ہوتی تھی اوراب بھی ہوتی ہے۔ لوگ مذہب کو بدنام کرتے ہیں، حالانکہ جو مذہب نہیں رکھتے ہیں کیا ان میں معاصرانہ منافرتوں کی کمی ہے۔ علم سیاست، آخر کس میدان میں اس کے گرد وغبار نہیں اڑ رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ لڑتا تو انسان ہے اور بدنام ہوتا ہے مذہب۔ یہ دنیا کی اگر بڑی بڑی لڑائیوں کو نہیں سوچتے، عظیم محاربون پر غور نہیں کرتے، تو کیا ان کے سامنے امیر وداغ کی منافرت، انیس ودبیر کی باہمی رقابت شبلی کے مداحوں اور حالی کے بادخوانوں کی منافستہ بھی نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی غریب مذہب کی دراندازی ہوئی ہے۔ جن جذبات پر ان منافرتوں کی بنیاد ہے، اس کے اشتعال پذیر ہونے کے لیے صرف انسان ہونا شرط ہے، انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں اس تصادم سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس میں ایک مذہب بھی ہے، مذہبی جماعت ہو یا غیر مذہبی، پارٹیوں سے کیا کوئی خالی ہے؟ اور واقعہ یہ ہے کہ دہلوی وخیر آبادی منافرت جو بعد کو دیوبند اور خیر آبادی منافرت سے بدل گئی، اس کا تعلق بجائے مذہب کے زیادہ تر علم سے، یا بجائے دل کے دماغ سے ہے۔ مذہب کے غیر ضروری

Marfat.com

درازودور جزئیات بعیدہ کو لے کر صرف ذہنی کرتبوں کے کمالات دکھائے گئے ہیں۔

بہر حال ظاہر ہے کہ حضرت الاستاذ کی علمی تعمیر میں بالکلیہ خیرآبادی مواد ومصالحہ خرچ ہوا تھا، ایسی صورت میں مشکل تھا کہ آپ دیوبند کے کسی عالم کے آگے زانوے تلمذتہ کریں، جانتے تھے کہ علم حدیث ان ہی لوگوں کی ملکیت ہے۔ لیکن علمی غیرت اجازت نہیں دیتی تھی اور غیر سے زیادہ مولانا عبدالحق خیرآبادی کی حمیت علمی کے لیے یہ واقعہ ہیجان انگیز ہوتا۔ حضرت کو اس کا بھی خوف تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے رفیق درس مولانا ماجد علی نے تو ننگ و ناموس کو خیرآباد کہہ کر ماثر نبوت کے عشق میں گنگوہ کی راہ لی، لیکن حضرت سے یہ نہ ہوسکا، تاہم

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

کے متراجم کشاکش میں مہینوں بے چین رہے، اور آخر میں ایک غیر معروف لیکن معتبر و مستند محدث، مولانا قاضی ایوب صاحب پھلتیؒ کی خدمت میں مولانا خیرآبادی سے اجازت لے کر حاضر ہوگئے۔ قاضی صاحب کا بھی نسبی اور علمی تعلق دہلوی خاندان سے تھا۔ لیکن دیوبندیوں کی طرح شاہ ولی اللہ کے گھرانے کی علم برداری میں خیرآباد میں وہ بدنام نہ تھے، بھوپال میں عہدہ قضاء سے سرفراز تھے اور ہمارے حضرت الاستاذؒ کے وہ حقیقی خالو بھی تھے۔

اب رامپور کا فلسفی بھوپال میں صرف چشمہ وحی ونبوت سے سیر ہونے میں مشغول ہوگیا۔ بھوپال کے یہ چند دن بھی حضرت کی زندگی میں عجیب تھے، یہ سچ ہے کہ اب بھوپال کے اس وقت تک طالب علم تھے۔ لیکن خیرآباد کے تو ایک سربرآوردہ عالم ہوچکے تھے۔ خود بھی پڑھانے کا شوق ابتداء سے تھا۔ رامپور میں بھی اگر خود بڑی کتابیں پڑھتے تھے، تو چھوٹی کتابیں دوسروں کو پڑھاتے تھے اور

Marfat.com

قدیم نظام تعلیم جسے میں ''آزاد تعلیم'' کہتا ہوں، اس کی بہت سی خصوصیتوں میں ایک اہم اور مفید ترین خصوصیت یہ تھی کہ اعلیٰ جماعت کے طلبہ، ادنیٰ جماعتوں کے مدرس العلم ہوتے تھے، اس طرح پڑھی ہوئی کتابیں، ایامِ تحصیل ہی میں، علماء کو مشق ہو جاتی تھیں، عموماً فراغت کے وقت یہ حال ہوتا تھا کہ بجز اوپر کی چند کتابوں کے اکثر کتابوں کے درس سے بھی فارغ ہو چکے ہوتے تھے۔

حضرت الاستاذ جب بھوپال پہنچے تو ٹونک سے طلبہ کی بھی ایک جماعت آپ کے ساتھ آئی۔ خود بھوپال میں بھی تلامذہ کی ایک جماعت آپ پر جمع ہوگئی۔ درسِ حدیث سے جو وقت بچ جاتا تھا وہ عام درسی کتابوں کے پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ طالب علمی کے ساتھ تعلیم دینا کوئی نئی بات تو نہیں تھی لیکن بھوپال میں حضرت نے جس قسم کا درس دیا تھا وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے یقیناً بہت ممتاز تھا۔ اسی عہدِ طالب العلمی میں آپ نے چند آدمی تیار کیے جن میں ایک مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے صدر مدرس مولانا نصیر احمد اور دوسرے محکمہ شرعیہ ٹونک کے مفتی مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، تیسرے کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر، شیخ الفقہ مولانا عبدالواسع صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس طرح شاید ایک سال سے زیادہ زمانہ آپ نے بھوپال میں گذارا۔ تحصیل سے فراغت کے بعد آپ کی طالب العلمی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اور اب اشاعتِ علم، نشر معارف، تبلیغ دین کے ولولہ سے معمور ہو کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔

میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت لیکن عہد تعلم کے ان ہی دنوں میں آپ نے کچھ تو اپنے والد مرحوم سے اور کچھ دہلی کے اس خاندان میں جس کے نمائندہ حکیم رضی الدین مرحوم تھے، آپ نے فن طب کی بھی تکمیل کر لی تھی۔

اسی طرح غالباً طالب العلمی ہی کے زمانہ میں رامپور کے ایک بزرگ

Marfat.com

صاحب دل سے آپ مرید بھی ہو گئے تھے۔ اور ان ہی ایام میں منزلی زندگی کے مرحلہ ازدواج بھی آپ ختم کر چکے تھے۔ تحصیل طب وحصول بیعت کے متعلق مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں لیکن ایک اہم نتیجہ خیز تاریخی حقیقت کو میں قطعاً چھوڑ دوں گا، اگر حضرت کے نکاح اول کی بعض خصوصیات کو یہاں بیان نہ کروں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت الاستاذ کے والد ماجد حکیم دائم علی صاحب مرحوم میرنگر (صوبہ بہار) کے ایک غیر مستطیع امی خاندان کے سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ٹونک پہنچ کر معز مطلق نے ان کو ریاست کے جلیل عہدوں اور رفیع مناصب تک پہنچایا۔ اب وہ میرنگر کے ایک مسکین سید نہیں، بلکہ ہندوستان کی ایک مشہور ریاست کے امیر کبیر تھے۔ کون خیال کر سکتا ہے کہ ٹونک کے ان قصور وایوانوں میں حکیم دائم علی صاحب کے حافظہ میں میرنگر کے خس پوش و شکستہ جھونپڑیوں کے ارتسامات زندہ ہوں گے۔

لیکن ابراہیمؑ کو اپنے بچے اسحاقؑ کے لیے جب دولہن کی ضرورت ہوئی تو فلسطین کے رئیس نے عراق کے دور دست علاقے سے لڑکی منگوائی پھر دیکھو! کہ ہزار ہا سال بعد اسی ابراہیمی نسل کے ایک سردار کو راجپوتانہ کے صحراء میں اپنے لڑکے کے لیے بیوی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ہزار ہا میل دور بہار کے ایک گاؤں میں اپنی بہو کو ڈھونڈھتا ہے، جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جن کے نسب کی صحت پر اسے اعتماد تھا۔ ٹونک سے ریاست کے ایک سربرآوردہ عہدہ دار کے لڑکے کی بارات روانہ ہوئی۔ سنگین محل سراؤں سے روانہ ہوئی۔ اونچے دروازوں سے روانہ ہوئی، اور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک ایسے جھونپڑے کے سامنے کھڑی ہوئی جس کے متعلق بزرگوں سے میں نے سنا تھا کہ اس کی دیوار بھی کچی تھی، اور اس پر چھپر بھی صرف پھونس کا تھا۔ حکیم دائم علی صاحبؒ نے حضرت الاستاذؒ کا پہلا

نکاح بڑے ذوق شوق سے اپنے قدیم گاؤں میرنگر کے ایک غریب سید کی لڑکی سے کیا تھا، کیا اس واقعہ میں ان باطنی چشمکوں اور اندرونی بدگمانیوں کے سکون کا کچھ سامان ڈھونڈھا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے سادات کے متعلق بعض دلوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ آج انساب کی طہارت، نسل کی سعادت کو دولت کی کالی دیوی پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے، کیا قربانیوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری تھا۔ میرنگر میں ایک ہاشمی قربان کر رہا تھا، کیا دولت پر نسل کو قربان کر رہا تھا، یا دولت، عزت، شہرت بلکہ معاشرتی سہولت، قرب مسافت میں سے ہر ایک چیز کو چن چن کر اس نے ذبح کر دیا۔ تاکہ اس کے نسب کی پاکی اور خاندان کی بزرگی، باقی رہے اور ایک حکیم دائم علی صاحب مرحوم نہیں بلکہ فاطمہؓ کے گھرانے والوں میں اس صدی سے پہلے ''خون'' کی تلافی، زندگی کے کسی شعبہ سے نہیں ہو سکتی تھی، پھر اگر ہندوستان کے طول و عرض میں اور اقوام کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں حسینؓ یا حسنؓ کے خاندان والے پائے جاتے تھے، یا اب بھی پائے جاتے ہیں تو دلوں میں وسوسہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اور اب تو زمانہ نے جو کروٹ لی ہے، سونے اور چاندی کے دیوتاؤں کی پرستش کا جو زور ہو رہا ہے، افسوس ہے کہ یہ وسوسے واقعات بن رہے ہیں اور شاید وہ تو بن بھی چکے۔ لیکن جہاں آج تاریکی ہے، نہ کہو کہ وہاں ہمیشہ یہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

ملازمت

الغرض حضرت الاستاذؒ کے کسب کمال کا عہد بھی ختم ہو چکا دین و دنیا کے متعلق جتنے علوم متداولہ سیکھنے تھے، سیکھ چکے، عالم ہوئے، حکیم ہوئے، مرید ہوئے، متاہل ہوئے، سب کچھ ہوئے، اب ایک مرحلہ معاش کا باقی تھا۔ حضرت کے ساتھ خدائے مہربان تھا، اس نے آپ کو ایک شفیق باپ عطا فرمایا تھا، جس وقت آپ فارغ التحصیل ہو کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے تھے۔ اس وقت حکیم دائم صاحب

Marfat.com

کی عمر کو پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن قوی مضبوط تھے۔ نواب صاحب ٹونک ان پر صرف اعتماد ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ انکے تقویٰ اور پارسائی نے نواب میں ان کی جانب سے حسن اعتقاد بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ ان کو اپنا صرف معالج جسمانی ہی نہیں خیال کرتے تھے، بلکہ ان کی دوا سے زیادہ ان کی دعاء میں اپنی صحت و تندرستی کی ضمانت محسوس کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ نواب کی یہ عقیدت اس درجہ کو پہنچی ہوئی تھی کہ طبیعت خراب ہے، حکیم دائم علی صاحب بلائے گئے ہیں، نذر باغ جہاں نواب صاحب رہتے ہیں، اس کے دروازہ پر حکیم صاحب پہنچے اور وہ اپنی بیماری میں خفت محسوس کرتے تھے۔

اقتدار و جاہ، اختیارات و اعزاز کی خواہش جن دلوں کو مسخ کر دیتی ہے وہ اپنی آخری سانس تک اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے۔ حکیم دائم علی صاحب بھی چاہتے تو ان کو ملازمت سے جدا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن باوجود شدید تعلقات کے حکیم دائم علی صاحب مرحوم اپنے عہدِ ملازمت میں دنیا پر خود چھائے رہے۔ اس کو اپنے اوپر کبھی چھانے نہ دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اب میرا لڑکا ہر طرح سے میرے فرائض کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا کر چکا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی دن کے وہ منتظر تھے، سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا، کہ نواب صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور ریاست کے تمام تعلقات سے استعفیٰ دے کر صرف اتنا عرض کیا کہ میرے منصب طبابت پر آپ اب میرے بیٹے کو مقرر کر لیجیے۔ اصرار سخت تھا، نواب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور یوں بغیر کسی تگ و دو کے حضرت الاستاذ پر اللہ تعالیٰ نے فراخی رزق کے دروازے کھول دیے۔ حکیم دائم علی صاحبؒ کو میں نے دیکھا تھا، آخر عمر میں ان کا شغل ﴿یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً وعلیٰ جنوبھم﴾ (القرآن: ۳/۱۹۱) رہ گیا تھا۔ فرائض و مکتوبات کے سوا روزانہ ہٹو کی مسجد میں سو رکعتیں نفل ادا کرتے،

Marfat.com

رات بھر ذکر وفکر مراقبہ ومجاہدہ میں گذارتے اور دن اللہ والوں کے خطوط ، و ملفوظات ،وحالات کے پڑھنے میں بسر کرتے تھے ،زیادہ سے زیادہ اگر کبھی شوق تھا تو اپنے سعادت مند جوان بخت فرزند سعید کی درس گاہ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گذر جاتے ،کون کہہ سکتا ہے کہ اس دانش مند انسان نے دنیا اور دین کی لذتوں کا کتنا سرمایہ اپنے سینے میں جمع کرلیا تھا اور جو فطرت کی راہ پر چلتا ہے ، قدرت اس کی مسرتوں کے اضافہ میں کبھی کوئی کمی نہیں کرتی ،وہ

﴿من اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکاً ﴾(القرآن/۲۰/۱۲۴)

''جو میری یاد سے کترایا تو ضرور اس کے لیے گھٹی ہوئی زندگی ہے''

اور ﴿من عمل صالحا من ذکر اوانثیٰ و هو مومن فلنحیینه حیوة طیبة﴾ (القرآن/۱۶/۹۷)

''مرد عورت میں سے جس کسی نے اچھے کام کیے اور وہ ماننے والوں میں بھی ہے تو ہم اسے جلاتے ہیں ، پاکیزہ زندگی کے ساتھ''۔

کے اصول پر قوت کے ساتھ جمے ہوئے تھے اور اس کے برکات سے دنیا میں بھی دنیا کے بعد متمتع ہوتے رہے ،ہوتے رہیں گے۔

عام انسانوں کی زندگی کے چند ہی مراحل ہیں ۔خصوصاً شرفاء کے خاندانوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکا پڑھ لکھ لے اس کی شادی ہو جائے ،کہیں نوکر ہو جائے ،ان مراحل کے بعد زندگی کی جدوجہد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی یہی تھا اور اب تو بقول اکبر مرحوم

کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے ،نوکر ہوئے ،پنشن ملی پھر مر گئے

سے زیادہ اپنی حیات کے سوانح کو مشکل ہی سے کوئی چھوڑتا ہے ، ہزار ہا انسان ہیں ،

جن کی زندگی کی تفسیر شعر مذکور کے مصرعہ ثانی سے زیادہ نہیں۔

لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں قدرت اپنے لیے بناتی ہے، یا یوں کہو کہ جو کمانے کے لیے نہیں جیتے ہیں، بلکہ جینے کے لیے کماتے ہیں۔ جدو جہد کے جن نقاط پر عوام کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، ان نفوس عالیہ کی زندگی ان ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دیکھو! کہ حضرت الاستاذؒ تمام شریفانہ فرائض سے فارغ ہونے کے بعد ایک والی ملک کے طبی مشیر کے عہدہ سے سرفراز ہو چکے تھے، تنخواہ معقول تھی، جاگیر تھی، جائداد تھی، عزت تھی، جاہ تھا، ماسوا اس کے چونکہ آپ طبیب تھے تو یہ بھی ممکن تھا کہ علاوہ تنخواہ کے اپنے قیمتی اوقات کو روپیہ بٹورنے میں صرف کر دیتے۔ چاہتے تو ہر شہر کے ہر ہر گھر سے فیس اور دوا فروشی کے بہانے سے درہم و دینار کے سیلاب کو اپنی جیب میں بھر لیتے۔ کچھ ماحول بھی چنداں مناسب نہ تھا۔ آپ ایک رئیس کے لڑکے تھے۔ امیرانہ چاؤ مان سے پالے گئے تھے۔ آپ کے احباب و افسران سب کے سب دنیا پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے۔ ریاست کے بڑے بڑے آفیسر آپ کے دوست تھے۔ لیکن باہمہ کے ساتھ بے ہمگی کا جو ثبوت انہوں نے پیش کیا اگر اس کو میں کسی ازلی انتخاب کا نتیجہ نہ خیال کروں تو اور کیا خیال کروں۔ کوئی مانع نہ تھا۔ اگر علاوہ طبی مشغلہ کے وہ ریاست کے کسی انتظامی اور کشوری صیغہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ خدا نے ان میں ہر قسم کی صلاحیت پیدا کی تھی، ریاست اور رئیس پر ان کا ذاتی اور خاندانی اقتدار ہر قسم کے امکانات کے لیے زمین درست کیے ہوئے تھا۔

لیکن نواب صاحب کے معالج خاص ہونے کا عہدہ انہوں نے ابتدائے عمر میں اختیار کیا اور جب دنیا سے روانہ ہوئے تو بجز طبیب خاص ہونے کے ان کے اسم گرامی کے پیچھے اور کوئی منصبی اور دنیاوی اعزاز شریک نہ تھا۔ اللہ نے ان کے سینے کو اس سے زیادہ وسیع پیدا کیا تھا کہ وہ ان چلتی پھرتی چھاؤں کے نیچے دم لیتے۔

Marfat.com

قناعت نے دل کو ٹھنڈا کر دیا اور ہمت نے تن آسانی کے گوشہ عافیت میں بیٹھنے نہ دیا۔ وہ اٹھے اور جب تک جیتے رہے علم اور دین کی خدمت میں اپنے کو مٹا دیا۔ حضرت الاستاذؒ کی زندگی کا حقیقی دور یہی دور ہے۔ اس کی تفصیل وبسط کے لیے دفتر درکار ہے۔ میں اختصار کے ساتھ کلی طور پر ان کی زندگی کے اس دور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے مضمون کو اب ختم کروں گا۔

اس زندگی کا پہلا حصہ درس وافادہ تھا، دوسرے حصہ میں آپ پر تالیف و تصنیف کا ذوق غالب ہوا اور آخر عمر میں وہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس مشغلہ میں ڈوب گئے جس میں ڈوبنے کے لیے انسان بنایا گیا ہے۔ ان کی عمر کل (٦٧) سڑسٹھ برس کی ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ یاس وناامیدی کے سن میں پہنچ کر، ریاضات دینیہ اور مجاہدات عرفانیہ میں مشغول ہوئے، کتنے غافل دل ہیں جو اس عمر کے بعد بھی نہیں چونکتے اور حضرتؒ تو سچ یہ ہے کہ بیداری کے اس جزء سے بحمداللہ کے اپنے ہر دور میں سرفراز تھے۔ لیکن جو چیز پہلے چنگاری تھی وہی آخر میں شعلہ جوالہ بن کر ان کے خرمنِ حیات پر مسلط ہوگئی۔ شروع میں وہ مدرس تھے، پھر مصنف ہوئے اور آخر میں وہ صرف ایک صوفی صافی درویش نیک اندیش تھے۔ میں ترتیب کیساتھ ان کے ہر دور کے بعض اجمالی خصوصیات کو درج کرتا ہوں۔

درس وافادہ

کہا جا چکا ہے کہ پڑھانے اور درس دینے کا شوق ان پر اس زمانہ میں بھی غالب تھا، جب وہ خود پڑھتے تھے۔ بھوپال میں طلبہ کی ایک خاصی جماعت آپ سے مستفید ہو رہی تھی، ابتداءً ان ہی طالب علموں میں سے کچھ لوگ آپ کے ساتھ ٹونک پہنچے۔ یہاں اب ایک باضابطہ درس کا آغاز شروع ہوا لیکن اس درس کے لیے کیا آپ نے اخباروں میں چندے کی اپیل کی۔ مسلمانوں کے پاس آپ نے سفراء

Marfat.com

بھیجے، کانفرنس بنائی، ریزولیشن پاس کیے، کمیٹیاں قائم کیں، نصاب بنایا، کلنڈر شائع کیے؟ کچھ نہیں، خود تھے، علم تھا، محنت تھی، اور خدا کی توفیق تھی، جو آتا گیا اس کی کتابیں شروع کرادی گئیں اور اس طرح اس مدرسہ یا جامعہ کی ابتداء ہوگئی۔ جس کے فارغین وحصلین، ہندوستان کے بڑے بڑے مدرسوں کے مدرس اور صدر مدرس ہوئے اور صرف ہند نہیں بلکہ جاوا، سرحد کے کوہستانوں میں، کابل کی پہاڑیوں میں، بخارا کے مرغزاروں میں، کوقند خیوہ، تاشقند کی مسجدوں میں، تم کو اس عجیب وغریب مدرسہ کے فارغ شدہ علماء علم ودین کی خدمت میں مصروف نظر آئیں گے۔

مدرسہ خلیلیہ

ابتداءً آپ کے حلقۂ درس میں ٹونک کے مقامی طلبہ اور کچھ بیرونی طلبہ شریک ہوئے۔ لیکن جس جانکاہی، دماغ سوزی، شفقت ومہربانی سے آپ پڑھاتے تھے رفتہ رفتہ آپ کی درسی عظمت کا احاطہ وسیع ہونے لگا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک اسلامیہ کے اقطار سے طلبہ کی جماعت آپ پر ٹوٹنے لگی۔ ان غریب الدیار، طلبہ میں ایسے بھی ہوتے جو عربی کی ابتدائی صرف ونحو سے بھی واقف نہیں ہوتے، ایک ایسا شخص جو اسلامی علوم کے ہر شعبہ کی اعلیٰ کتابیں خود پڑھاتا ہو، مشکل تھی کہ وہ ان بچوں کی تعلیم بھی اپنے ذمہ لے، کچھ دن تو نفس پر جبر بھی کیا اور ایک زمانہ آپ پر ایسا بھی گذرا ہے کہ صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل سبق پڑھاتے رہتے تھے لیکن جوں جوں طلبہ کی کثرت ہوتی گئی، کام کی سرانجامی میں دقت ہونے لگی۔ آخر اپنی معاونت کے لیے آپ نے ریاست سے محض معمولی امداد لے کر، چند مدرسین کو قلیل تنخواہوں پر نوکر رکھ لیا اور ریاست ہی نے ایک شکستہ لیکن وسیع مکان آپ کو دے دیا، جن میں یہ مدرسین نیچے درجہ کی جماعتوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس مدرسہ کی مالی حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا

Marfat.com

ہے کہ اس کے سب کے بڑے مدرس کی تنخواہ (۳۰) تیس روپے نواب شاہی (ریاست ٹونک کے سکہ) سے زائد نہ تھی۔ اس مدرسہ کا نام خلیلیہ ہے جو والی عصر کے تخلص گرامی خلیل کی طرف منسوب ہے۔ حضرت الاستاذؒ ابتداء میں مدرسین کی ہمت افزائی کے لیے چند اسباق خود مدرسہ میں جا کر پڑھایا کرتے تھے لیکن جب کام چل پڑا تو جس مدرسہ سے سینکڑوں علماء اٹھے، دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی، اس کی عمارتی وسعت صرف ایک دالان تک محدود تھی، جس پر کویلو کا چھپر پڑا ہوا تھا اور جس میں دری بھی نہیں، صرف جاجم کا فرش پڑا رہتا، اس میں حضرتؒ کے بیٹھنے کے لیے روئی کا چھوٹا سا گدا تھا، سامنے معمولی لکڑی کی ایک تپائی پڑی رہتی تھی، جس پر ایساغوجی سے لے کر شفاء تک اور نورالانوار سے توضیح وتلویح تک، شرح وقایہ سے ہدایہ تک، مشکوۃ سے بخاری تک کا وہ درس ہوتا رہا جس کا بنگال سے لے کر بخارا تک کے علمی حلقوں میں غلغلہ بلند تھا۔ حضرتؒ کا ذاتی مکان بہت وسیع تھا اور امیرانہ تھا لیکن وہ سب دوسروں کے لیے تھا۔ اپنے رہنے کے لیے آپ نے صرف ایک سائبان اور ایک حجرہ کا چھوٹا سا مکان منتخب کیا تھا، جس میں اہل وعیال کے ساتھ آپ بسر کرتے تھے اور پڑھانے کے لیے مٹی کا ایک خام دالان آپ نے باہر سے بنوالیا تھا، مدرسہ خلیلیہ تو صرف ایک اعانتی مدرسہ تھا، ورنہ ٹونک کی جس درسگاہ نے شہرت حاصل کی، اس کی تعمیری حیثیت کل اتنی تھی۔

طلبہ کے قیام وطعام کا انتظام

درسی دور کے وسط میں حضرت کے پاس بیرونی طلبہ کا ایک بڑا گروہ جمع ہوگیا تھا۔ ان میں بہار، صوبجات متحدہ، پنجاب، راجپوتانہ، سرحد، کابل، بخارا، سمرقند، ترمذ، ہرات، قفقاز ہر جگہ کے طالب علم تھے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اتنے مختلف الطبائع نفوس کے باہمی اجتماع کی شیرازہ بندی اور پھر ان کے کھانے پینے

Marfat.com

کے بندوبست کے لیے کچھ انتظام نہ کیا گیا ہوگا۔

لیکن اسباب کو جو اپنے قابو میں لینا چاہتے ہیں، تجربہ بتاتا ہے کہ اسباب ان کے قابو میں بہت کم آئے ہیں، یا آتے ہیں تو مشکل سے آتے ہیں، یہ میرا چشم دید واقعہ ہے اور برسوں دیکھتا رہا کہ ہر طرح کے طالب علم آتے تھے، لیکن ان کے انتظام کے لیے صرف دو صورتیں تھیں۔

پہلی صورت تو وہ تھی، جسے دیکھ دیکھ کر میں اس وقت بھی حیرت کرتا تھا اور اب تک میرے تعجب کا ازالہ نہیں ہوا ہے، کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت حضرت ہی کی ذاتی مہمان تھی، یہ سچ ہے کہ حضرت کو حکومت سے تقریباً چار سو روپے مہینہ تنخواہ میں ملتے تھے اور آپ کی جاگیر میں ایک گاؤں بھی تھا۔ یقیناً یہ کوئی غیر معمولی آمدنی نہیں تھی لیکن برسوں میں نے دیکھا کہ بیس بیس، پچیس پچیس طالب العلم کا کھانا دونوں وقت حضرت کے گھر سے پک کر الگ خوانچوں میں طالب العلموں کے پاس آتا تھا۔ گھر میں بجز ایک مامابریرہ کے مشکل سے اور کوئی عورت خادمہ رہتی تھی۔ لیکن میں اسے حضرت کی کرامت کہوں یا آپ کی بیوی صاحبہ کی انتھک توجہ ومحنت کہ تازہ گرم گرم چپاتیاں، بکرے کے گوشت کا سالن، صبح آٹھ بجے تک طالب العلموں کو مل جاتا تھا، اسی طرح شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر لوگ حضرت کے در دولت پر جمع ہو جاتے تھے اور اسی وقت شام کے کھانے سے فارغ کر دیئے جاتے تھے، ان طلبہ میں سے کچھ لوگ تو حضرت کے احباب کے مکان میں رہتے تھے لیکن ایک خاص مجمع خود آپ کے ایک بڑے وسیع پختہ مکان میں فروکش تھا۔ جسے بغیا کہتے تھے، آج قومی اور ملکی خدمات کرنے والے حضرات چند دن کی بھرمار سے پبلک کو زچ کیے ہوئے ہیں، لاکھوں روپے مختلف ناموں سے لیے جاتے اور بہائے جاتے ہیں۔ میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ یہ لوگ کام نہیں کرتے لیکن اس ایثار، اس قربانی کی کوئی نظیر دنیا

اب بھی پیش کرسکتی ہے، کہ صبح سے شام تک ایک شخص ہر قسم کے علوم کا درس دے رہا ہے اور کسی سے ایک حبہ نہیں لیتا اور پھر اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ اپنی جیب سے ہر مہینہ میں ایک بڑی رقم طالب العلموں کے کھانے پینے پر صرف کرتا ہے، فرض کرو کہ کوئی یہ بھی کرے، لیکن کھانے کی تیاری اور کھلانے کی ذمہ داری اپنے سر کون لینے لیے تیار ہے۔ آہ کہ قوم، ملک، وطن کے الفاظ سے ہماری پچھلی نسلیں اس طرح آشنا نہیں تھیں جیسی کہ اب ہیں لیکن ان کے حقائق ومصادیق کے ساتھ ان کے علمی کارناموں اور اولوالعزمانہ خدمتوں کو ان یحمدو بما لم یفعلوا (تعریف کی جائے ان کاموں کی جو انہوں نے نہیں کیے ہیں) کے قرن سیاہ میں ڈھونڈھنا بھی فضول ہے۔ تم میں کوئی صرف تھوڑی تنخواہ لیتا ہے یا نہیں لیتا ہے، تو اس کی مدح وستائش کے گیتوں سے گنبد گردوں میں گونج پیدا کرتے ہو، لیکن انہی قباؤں کے نیچے جو اللہ کے دوست پوشیدہ تھے، افسوس کہ ان کو تم میں سے کسی نے نہیں پہچانا، الحاصل طالب العلموں کے ایک بڑے گروہ کے قیام اور طعام کا ایک انتظام تو یہ تھا، تھوڑے ایسے بھی تھے جو مدرسہ خلیلیہ سے وظیفہ پاتے تھے اور بعض دوسرے شہروں کی طرح مساجد میں بھی رہتے تھے۔

طلبہ کے ساتھ آپ کا برتاؤ

قطع نظر اس عام سلوک کے جو بیان کیا گیا، حضرت کا اپنے طلبہ کے ساتھ عام برتاؤ حاکمانہ یا مستبدانہ قطعاً نہ تھا۔ درس میں تو مشتغلین پر ایک قدرتی رعب چھایا رہتا تھا۔ بڑے بڑے مستعد اور ذکی طالب العلموں کو سوال کی جرات کم ہوتی تھی لیکن عام صحبتوں میں وہ ہر ایک مہربان دوست سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے تھے، غیر درسی مجلسوں میں ہر قسم کے ذکر واذکار، بلکہ کبھی کبھی کسی طالب العلم سے ظرافت بھی فرمالیا کرتے۔ تواضع کا یہ حال تھا کہ اگر کسی وجہ سے کسی طالب العلم پر آپ خفا

بھی ہوتے تو تھوڑی دیر بعد آپ کو منفعلانہ افسوس ہوتا اور اس کی تلافی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما لیتے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک سرحدی طالب العلم تمام علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گشت کرتا ہوا شفاء اشارات پڑھنے کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ قد آور تھا اس لیے اس کا نام ابوالبشر رکھ دیا گیا۔ اور اس قسم کے خطابات ظرافت میں اکثر تقسیم ہوتے تھے۔ پانی پت کے ایک معمر طالب العلم کا خطاب مولوی چچا صاحب تھا۔ بدایون کے ایک ذہین طالب العلم مولوی عبدالواحد مرحوم تھے، چونکہ پست قد تھے اس لیے ان کا نام ملا مختصر رکھ دیا گیا تھا۔ بہار کے ایک طالب العلم ذرا زیادہ بولتے تھے، آستانہ استاد سے ان کو بالسٹر کا خطاب ملا تھا۔

بہر حال مولوی ابوالبشر اپنے نام ہی کی وجہ سے محل طیبت بنے ہوئے تھے ان سے اکثر چٹکیاں لی جاتی تھیں اسی وجہ سے وہ کچھ شوخ بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن درس کے وقت کچھ اس طرح الجھے کہ حضرت کا مزاج برہم ہو گیا۔ آپ نے غصہ میں کچھ ان کو بھی برا بھلا کہا، ساتھ ہی فرمایا کہ تم نے کس محصل سے تعلیم پائی ہے جو اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ سرحدی پٹھان کو اپنے استاد کی مہملیت کی وجہ سے کچھ غصہ آ گیا اور درس سے اٹھ کر وہ اپنے حجرے میں چلا آیا اس وقت تو بات یوں ہی ہو گئی۔ مغرب کے بعد میں نے تاریکی میں دیکھا کہ کوئی آدمی اس کے حجرے میں داخل ہوا اور مولوی ابوالبشر سے مراضاۃ بلکہ معافی کے کلمات کہہ رہا ہے۔ غور جو کیا تو وہ حضرت الاستاذ تھے، اس تواضع اور انکسار پر دل نے عبرتوں کا ایک سبق حاصل کیا۔ فرحمہ اللہ

طریقہ تعلیم

حضرت کا تعلیمی طریقہ زیادہ تر خیر آبادی درس کا تابع تھا، جس کی بنیاد مطالعہ، تقریر، تکرار یا اعادہ پر قائم تھی۔ مطالعہ کا مطلب یہ تھا کہ ہر طالب العلم پر

Marfat.com

لازم تھا کہ بغیر حواشی وشروح کی امداد کے روزانہ پڑھنے سے پیشتر اپنے سبق کے مطالب پر حاوی ہو کر درس میں آئے اور اس کا کبھی کبھی فجائی امتحان بھی ہوتا رہتا تھا۔ آپ کو اس کی بھنک بھی لگ جاتی تھی کہ فلاں طالب علم حواشی اور شروح کی اعانت سے کتاب کا مطلب حل کرتا ہے تو اس پر آگ بگولہ ہو جاتے، مطالعہ صرف طالب العلم ہی پر فرض نہ تھا بلکہ بغیر مطالعہ کے حضرت شیخ تہذیب وقطبی جیسی آسان ابتدائی کتابیں مشکل ہی سے پڑھاتے، فرماتے کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی کتاب کا درس جائز نہیں ہے۔ کسی دن اگر آپ رات کو کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے تو نہایت صفائی سے کہہ دیتے کہ آج اس کا سبق نہیں ہوگا۔

تقریر سے غرض ہے کہ درس کے وقت کسی طالب العلم کو کتاب کی عبارت پڑھنے کا حکم ہوتا تھا۔ عبارت کی صحت پر خاص توجہ ہوتی تھی، وہی استاد جو درس سے پیشتر ایک معمولی دوست کی حیثیت سے ملتا تھا، عبارتی اغلاط پر اس کے چہرہ کا تکدر طلبہ کے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا، تنبیہاً کبھی کبھی کتب بھی اٹھا کر پھینک دیتے تھے، جب عبارت ہو چکی تو اس مقام کا مطلب نہایت شستہ اردو میں آپ خود فرماتے، مطلب کی بنیاد جن مقدمات پر ہوتی ان کو پہلے بیان کرتے، پھر اصل مطلب کے بعد جس جماعت کا طالب العلم ہوتا، اس کی وسعت کے مطابق مصنف کے کلام پر نہایت سنجیدہ تنقید فرماتے۔

تکرار یا اعادہ قدیم درس کا ایک ضروری جزء تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ رسم عربی مدارس سے اٹھ رہی ہے۔ حضرت اس کا خاص لحاظ فرماتے تھے۔ ہر جماعت کے طلبہ مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہوتے تھے، جماعت میں جو زیادہ فہمیدہ، ذکی طالب العلم ہوتا تھا، وہ اپنی اپنی ٹولی کا معید ہوتا تھا، اس کا فرض تھا کہ جو کچھ اس نے استاذ سے سنا ہے، جہاں تک ممکن ہو ان ہی الفاظ میں پھر اپنی جماعت میں دہرائے، بعض طلبہ تو

Marfat.com

اس میں اس قدر غلو کرتے تھے کہ حضرت کی طرح شکل وصورت ہیئت بھی بناتے تھے۔

یہ تو عام دستور تھا لیکن بعض خاص خاص طلبہ کے ذمہ علاوہ ان باتوں کے ایک حکم خاص یہ بھی ہوتا تھا کہ روزانہ اپنے سبق کو اردو میں لکھ لیا کریں۔ اور پھر وہ حضرت الاستاذ کو دکھلائیں۔ ان مراحل کے بعد ایک درس ختم ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد طالب العلم ہر کتاب پر کس قدر حاوی ہو جاتا تھا۔

حضرت کے درس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مصنفینِ کتاب کے متعلق یہ کبھی یاد نہیں کراتے تھے کہ ان کے بیانات قطعی اور فیصلہ کن ہیں بلکہ جہاں جہاں ان میں غلطیاں ہوتی تھی، آزادی کے ساتھ اسے ظاہر فرماتے، خود فرماتے کہ میں کتاب نہیں پڑھانا چاہتا ہوں، فن سکھانا چاہتا ہوں۔

آپ کو اس سے سخت نفرت تھی کہ صرف طلبہ پر رعب جمانے کے لیے ان کے فہم واستعداد سے زیادہ بے محل اعلی باتیں بیان کی جائیں۔ دوسری درس گاہوں کے آئے ہوئے طالب العلم اس کے عادی ہوتے اور کبھی کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ کوئی اونچی بات پوچھتے تو اس کو جھڑک دیتے اور فرماتے کہ گدارنے سے پیشتر تم پکنے کی کیوں کوشش کرتے ہو۔

آپ نے طالب العلموں کو انتخاب علم وکتاب کے مسئلہ میں بالکل آزادی دے رکھی تھی، ہر طالب علم کو اختیار تھا کہ جو چاہے پڑھے، میں نے آپ کے یہاں ایسے طالب العلم بھی دیکھے ہیں جو صرف ایک کتاب میں شریک ہوتے تھے، لیکن ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ ہر طالب العلم آزاد تھا۔ جتنی عمر تک جتنے دن تک چاہے آپ کے مدرسہ میں رہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ آپ کے یہاں نہ کوئی حاضری کا رجسٹر تھا اور نہ اس پر کبھی توجہ کرتے کہ کون طالب العلم آیا ہے کون نہیں آیا ہے۔ لیکن اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے تو اس ہشت سالہ میں میں نے کسی طالب العلم کو

Marfat.com

نہیں دیکھا کہ محض بے شوقی کی وجہ سے وہ درس سے غائب رہا ہو، کسی مجبوری کی وجہ سے اگر آ نہ سکا تو اس کی تکلیف کے لیے میں اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا، جو یہ بیچارہ محسوس کرتا تھا، دوسرے طالب العلموں خصوصاً معیدوں سے وہ پھر اس سبق کو سنتا، اور افسوس کرتا کہ میں موجود نہ تھا۔

غیر درسی مجالس میں تحصیلِ علم اور قیمتِ علم کے متعلق ایسے واقعات سناتے رہتے تھے کہ خود بخود طالب العلم علم کی تشنگی سے معمور ہو جاتا تھا، آج دارالاقاموں میں مؤدبین ہیں، طلبہ کی صبح و شام نگرانی کی جاتی ہے۔ لیکن جس علمی ماحول کو میں نے اس کھپریل کے بے ضابطہ مدرسہ میں پایا، پھر کہیں نہیں دیکھا۔ تقریروں، حاشیوں، شرحوں، قلمی کتابوں کی نقل میں تنافس کا ایک عجیب خوشگوار سلسلہ جاری تھا، حتی کہ کبھی کبھی یہی شوق حد سے بڑھ جاتا تھا۔ ایک دفعہ فلسفہ کی ایک کتاب کی نقل کے سلسلے میں دو طالب العلموں میں کشمکش جاری تھی اور اس کشمکش کا آخری انجام اس پر ہوا تھا کہ دونوں کے ہاتھ میں چھری تھی، ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کی نقل کا موقعہ مجھے پہلے ملنا چاہیے۔ ورنہ زندگی ختم کر دی جائے گی۔ گویا یہ اپنا ایک عیب ہے اور اب حضرتؒ بھی زندہ نہیں ہیں۔ لیکن ایک بدقسمت طالب العلم آپ ہی کے پاس وہ بھی تھا کہ آپ نے خوانساری کا حاشیہ شفاء اور ملا جلال کا حاشیہ از مولانا فضل امام خیرآبادی جسے آپ کسی کو نہیں دکھاتے تھے، اور یہ بھی علم کی قدر و منزلت کا ایک غالبانہ رنگ تھا، یہ دونوں حاشیے جلد بندھوانے کے لیے طالب العلم پر اعتماد کر کے، آپ نے حکم دیا تھا کہ کسی کو نہ دکھانا اور دو دن میں جلد بندھوا کر مجھے دے دینا۔ لیکن جس پر اعتماد کیا گیا تھا وہ غادر ثابت ہوا اور دو رات دو دن مسلسل جاگ کر سینکڑوں صفحات کے ان حواشی کو نقل کر لیا۔ بڑی قیمت دے کر جلد بند سے چند گھنٹوں میں جلد بندھوا کر حضرت کے حوالہ کر دیا جس کی خبر غالباً حضرت کو اپنی آخری عمر تک نہیں ہوئی، وہ

Marfat.com

غالباً یہی خیال فرماتے رہے کہ اس کتاب کا کوئی نسخہ ہمارے یہاں کے سوا اور کہیں نہیں ہے۔ جواز و ناجواز، غدر و خیانت سے بحث نہیں لیکن مجھے اس پر حیرت ہے کہ الٰہی وہ کیا طرزِ تعلیم اور اصول تربیت تھا کہ طلبہ میں ذوقِ علم کی ایسی آگ لگی ہوئی تھی، آج کتابیں بازاروں میں ملتی ہیں، لاکھوں روپے ہر کالج اور مدرسوں میں کتاب خانوں پر صرف کیے جاتے ہیں۔ لیکن کتب خانوں میں لین دین کے کھاتوں کو دیکھو! افسانوں اور ناولوں کے سوا کم کتابیں ایسی نظر آئیں گی، جن کو طلبہ مطالعہ کے لیے لے گئے ہوں۔

علومِ درسیہ

حضرت الاستاذ خیرآبادی اسکول کے چشم و چراغ تھے، اس لیے قدرۃً آپ پر، منطق، اور فلسفہ کی شاخ مابعد الطبعیات کا ذوق غالب تھا، درس میں زیادہ زور ان ہی دو علموں پر دیا جاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ریاضیات کے سوا، تقریباً ان تمام علوم متداولہ کی کتابیں پڑھاتے تھے، جو عربی مدارس کے نصاب میں شریک ہیں۔ میں نے حضرت کو ادب عربی کی کتب اربعہ (حریری متنبی وغیرہ) بھی پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے، ان کے سوا حدیث میں صحاح ستہ کا درس تو آپ باضابطہ دیتے تھے فقہ میں ہدایہ اخیرین کو بڑی تدقیق اور شوق سے پڑھاتے تھے۔ بیضاوی کے ڈھائی پارہ میں اپنی تفسیری قوت کا بھی اظہار فرماتے تھے، عرصہ کے بعد بطور مشغلہ کے آپ دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم، مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کا بھی درس دیتے تھے اور کبھی کبھی طلبہ کے اصرار سے آپ طب بھی پڑھاتے تھے، لیکن بعض طلبہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ حکم تھا کہ وہ طب کے درس میں شریک ہوں۔ ان ہی بدبختوں میں ایک وہ بھی تھا جو طب کے درس سے کئی بار اٹھایا گیا، اور یہ کہہ کر اٹھایا گیا کہ ''تجھے پر قینچ کر کے رکھا جائے گا'' اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اس وقت تک ہر قسم کے

Marfat.com

معاشی علوم سے نا آشنا ہے لیکن افسوس کہ جو حضرت کی تمنا تھی، وہ بھی پوری نہ کر سکا، و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

مغرب کے بعد آپ کتابی مطب بھی بعض طلبہ کو کراتے تھے۔ بعض مختلف امراض کے مریض فرض کر کے نسخے بتاتے۔

اُردو میں فلسفہ کی تعلیم

حضرت کی تعلیمی زبان اردو تھی جیسا کہ ہندوستان کے تمام مدارس میں رواج ہے۔ لیکن ایک خاص خصوصیت آپ کے درس کی یہ تھی کہ جب کسی طالب علم کو آپ ابتداء سے فلسفہ پڑھانا چاہتے تھے تو اپنے استاد مولانا عبدالحق خیرآبادی کی ایک ابتدائی کتاب جس کا نام زبدۃ الحکمت ہے ضرور پڑھاتے تھے اور غالباً اردو زبان میں کسی فن کی تعلیم کی یہ ابتدا تھی اور یوں ہی فلسفہ کی عربی کتابوں میں آپ بعض اصطلاحات کا ترجمہ مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔ مثلاً تداخل کا ترجمہ آپ ''درانا'' حلول کا ''پیوست ہونا'' فرماتے، آپ کے ایسے خاص ترجموں کی فہرست بہت طویل ہے۔

امتحان

آپ کا درس جس طرح رجسٹروں کے گورکھ دھندوں سے آزاد تھا، اسی طرح امتحان کی جھنجھٹوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ یوں پوچھو، تو ہر طالب العلم آپ کے یہاں ہر وقت زیر امتحان ہوتا تھا۔ عبارت خوانی سوال و جواب سب میں اس پر کافی گرفت اور تنقید ہوتی رہتی تھی لیکن سند فروشی کے لیے آپ نے امتحان کا کوئی باضابطہ باب اپنے درس میں نہیں کر رکھا تھا۔ زمانہ چونکہ امتحان پر زور دیتا تھا، تو کبھی کبھی سال میں ایک ایک دفعہ زیادہ تر تقریری اور کبھی کبھی تحریری امتحان لے لیا کرتے تھے۔ لیکن اس کی اہمیت ان کی نگاہ میں صرف اس قدر تھی کہ طالب العلموں

کو ہفتوں پہلے خود ہی سوالات بتا دیتے تھے کہ باتیں تم سے پوچھی جائیں گی جب امتحان لے لیتے اور طالب العلم کتاب کا لکھا ہوا جواب دے چکتا تو فرماتے کہ یہ تو کتاب کی بات ہے، یا تم نے مجھ سے سنی ہیں، میں حافظہ کا امتحان لینا نہیں چاہتا، بلکہ تمہاری استعداد و فہم کا امتحان لوں گا۔ اب اس جواب کے متعلق کوئی پیچیدہ سوال خود پیدا کر کے پوچھتے کہ اس کا کیا جواب ہے؟ جو طالب العلم اس جدید سوال کا جواب دیتا تھا وہی پاس سمجھا جاتا، ورنہ ناکام۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طالب العلم کی حیثیت، استعداد پر گہری نظر رکھتے، اس کی جو کمزوریاں ہوتیں، دفع فرماتے، بعض خاص طالب العلموں کے اولیاء کو آپ ہر سال ان کے بچے کی تعلیمی حالت کی رپورٹ صیغہ راز میں لکھ کر بھیج دیتے۔ میرے پاس ایسے خطوط کا ایک مجموعہ ہے۔ ان شاء اللہ حضرت کے مکاتیب کے ساتھ وہ شائع ہوں گے۔

تعطیل

سب سے نمایاں چیز آپ کی تعلیم کی تعطیل تھی۔ آپ اس کے قطعاً مخالف تھے کہ مسلسل سال کے گیارہ مہینے طلبہ کو پڑھایا جائے، شعبان، رمضان، شوال میں عموماً تعلیم بند ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ہفتہ میں دو دن منگل اور جمعہ میں درس موقوف رہتا اور یوں بھی علی سبیل البدلیہ ہفتہ میں ایک دن ضرور ناغہ ہوتا تھا۔ عجلت پسند طلبہ کے لیے تعطیلوں کا یہ سلسلہ صبر آزما ہو جاتا تھا لیکن جہاں تک تجربہ سے کہا جا سکتا ہے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پڑھانے سے زیادہ طلبہ کو پڑھنے کا موقعہ دینا چاہیے، جس کی آسان صورت یہی ہے کہ درس سے زیادہ تعطیل کے ایام کر دیئے جائیں، ورنہ کم از کم مساوی تو ضرور ہونا چاہیے۔ جن مدارس میں تعطیلوں کا سلسلہ کم ہوتا ہے۔ عموماً وہاں کے طالب العلم کم سواد، ضعیف الدماغ، بطی الفہم ہو جاتے ہیں۔ موعظت ہو یا دراست، نحول اور ناغہ دونوں میں ضرورت ہے۔

Marfat.com

طلبہ کی استعداد و تربیت کی عام نگرانی

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت طلبہ کی عام نگرانی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کی متجاہلانہ عرفانی نگاہوں سے کوئی بچا ہوا نہ تھا۔ خصوصاً اس کا خیال سختی کے ساتھ رکھتے تھے کہ طالب العلم ایسی کتابیں یا مضامین نہ پڑھنے پائیں جن سے ان میں سہولت پسندی، یا سطاحت پیدا ہو جائے، اور اسی لیے آپ اخبار و رسائل جن میں زیادہ تر بازاری گپ، یا افسانے، تاریخی واقعات ہوتے ہوں، ان کے پڑھنے سے روکتے تھے، ناول اور قصوں کی کتابوں کے پڑھنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ کوئی طالب العلم اگر کسی ایسے استاد کے پاس پڑھنے جاتا تھا، جس کے علمی نظر و فکر پر آپ کو اعتماد نہ تھا، تو اس کو شدت کے ساتھ زجر فرماتے، بعض لوگ اس کو علمی عصبیت پر محمول کرتے تھے، ممکن ہے کہ اس میں اس کا شائبہ بھی ہو۔ لیکن اپنی نیت کی حدود تک وہ اس میں بھی مخلص تھے۔ طلبہ اگر وعظ و تقریر کی مشق کرتے تو فرماتے کہ ''یہ گدرانے سے پیش تر پکنے کی کوشش کر رہا ہے''۔ سیاسیات سے آپ کو خود دلچسپی نہ تھی، تاہم اسلامی معاملات پر عمیق اور گہری رائے رکھتے تھے اور اپنے نزدیک کچھ سوچ کر سرگرم عمل تھے۔ لیکن طلبہ کے لیے سیاسی مشاغل کو بھی پسند نہیں فرماتے اور ساری باتیں اس لیے تھیں کہ آپ کے سامنے ذہنی تربیت اور استعدادی قوت کے مقابلہ میں تمام چیزیں کم قیمت تھیں۔ خیال تھا کہ جب نظر بالغ ہو جائے گی تو یہ باتیں خود بخود اپنے وقت پر سمجھ میں آ جائیں گی۔ میں نے ایک دن میر زاہد کے رسالہ علم کے متعلق پوچھا کہ آخر نتیجہ تو کچھ معلوم نہیں ہوا کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اس طرح راز میں رہا کہ کتاب کے پڑھنے سے پہلے تھا۔ فرمانے لگے کہ کتابیں صرف کرتب سکھانے کے مشقی دنگل ہیں، مشق کے لیے کوئی بھی چیز لے لو، لکڑی کا مگدر ہو، یا لوہے کا، مقصود بازو کی قوت اور پٹھوں کی مضبوطی ہے۔ کام کا

وقت تو میدان میں آتا ہے۔ جس کا بدن مشقی دنگلوں کا کھیلا ہوا ہے۔ رن پڑنے پر بازی وہی لے جائے گا، مقصود صرف دین کی تائید ہے اور ان پیچیدہ باتوں سے دماغ کی تمرین و تشحید کی جاتی ہے۔

مقصد درس

حضرت کی خدمت میں مجھے آٹھ سال تک رہنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے کبھی نہیں سنا کہ آپ کی اس درسی کوشش کا مقصد کیا ہے؟ کیا صرف شہرت و نام و نمود؟ لیکن میں جانتا ہوں کہ حضرت میں اس کا جذبہ بہت کم تھا۔ آپ چاہتے تو شہرت کی ایسی زمین آپ کے سامنے کھلی ہوئی تھی کہ ان پر چل کر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے جہاں سے صرف دنیا کے مسلمان نہیں بلکہ غیر اقوام بھی آپ کو دیکھتے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم آپ کے بڑے دوست تھے، انہوں نے بارہا چاہا کہ ان کے ساتھ وہ میدان عمل میں اتریں، طبی مجاہدات میں ساتھ دیں۔ لیکن خاموشی کے سوا آپ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حیدر آباد کے معین المہام مذہبی، نواب فضیلت جنگ، مولانا انوار اللہ خاں مرحوم آپ کے مخلص عقیدت مند تھے، انہوں نے بارہا چاہا کہ دکن کی کسی سطح مرتفع پر آپ بھی اپنا مینارہ قائم کریں۔ لیکن آپ اپنی جگہ سے نہ ہلے، مختلف ریاستوں کے رئیسوں نے بڑی بڑی تنخواہوں پر آپ کو بلایا، لیکن نہ گئے۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے خود مجھے ایک دفعہ لکھنؤ میں پوچھا کیا تمہارے استاد مولانا برکات احمد صاحب ہمارے دار العلوم کی صدر مدرسی پر آسکتے ہیں۔ حضرت سے جا کر میں نے عرض کیا، تو ہنس کر ٹال دیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا، نہیں کہا جا سکتا کہ اندرون قلب میں اس غیر معمولی جد و جہد سے انہوں نے اپنا کیا نصب العین مقرر کیا تھا۔ ثواب آخرت بیشک ان کے نزدیک بڑی چیز تھی، اور جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے مالک کی مرضی اور خوشنودی کے لیے علم دین کی نشر و اشاعت میں

Marfat.com

معروف تھے، تاہم ٹونک کے ایک بزرگ مرحوم سچے میاں جو حضرت کے دوست تھے ایک دن مجھ سے بولے کہ آج مولوی برکات احمد بہت خوش تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنا درس چند نشتروں کی تیاری کے لیے قائم کیا تھا، سو الحمدللہ دو نشتر تو مجھے مل گئے ان شاءاللہ ان سے بڑا کام نکلے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی مراد نشتر سے کیا تھی اور یہ کون دو آدمی تھے، جن کے متعلق حضرت کی پیشین گوئی تھی۔ تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ حضرت کے سامنے بھی کوئی مقصد تھا، کامیابی و ناکامی کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ان کی نیت میں کوئی خاص ''سر'' پوشیدہ تھا۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات.

دورِ تالیف

تقریباً بیس سال تک مختلف علوم وفنون کی مسلسل تعلیم و درس کے بعد ادھر پچھلے دس پندرہ سال حضرت نے اپنی توجہ درس سے زیادہ تالیف وتصنیف کی طرف پھیر دی تھی۔ ان کی کل کتابیں عربی زبان میں ہیں، جن میں بعض چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور مختلف درسی کتابوں کی مشکل مقامات کے حل سے متعلق ہیں۔ ایک ضخیم کتاب آپ نے الحجۃ البازغہ کے نام سے لکھی، جس میں مابعد الطبیعیات کے چند اہم ابواب پر مجتہدانہ انداز سے گفتگو فرمائی گئی ہے۔ مولانا انوار اللہ خان مرحوم نے اس کو حکومت آصفیہ کی جانب سے شائع بھی کرا دیا ہے۔ ایک کتاب آپ نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کی، یہ مولانا بحر العلوم کی شرح منار فارسی کا عربی ترجمہ ہے، کاش شائع ہو جاتی تو نصاب کے لیے بہترین کتاب ہے۔

آخر عمر میں آپ پر تصوف کا غلبہ ہو گیا اور چند اہم کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں۔ جو سب کی سب غیر مطبوع ہیں۔ آپ نے دیانند سرستی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں بزبان اردو کچھ نوٹ کرائے تھے۔ جس کو باضابطہ مرتب کر کے صدقہ

Marfat.com

جاریہ فی ردآریہ کے نام سے حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد صاحب نے شائع بھی کرادیا ہے۔ اردو میں اگر حضرت کی کوئی یادگار ہے تو یہی ہے، بعض نزاعی جزئیات کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپ نے آغاز کیا تھا، معلوم نہیں کہ مکمل ہوئی یا نہیں۔ بہرحال حدیث وتصوف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے، جس کی مانگ علم کے دور جدید میں مشکل سے ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ہندوستان کی علمی اور ذہنی کیفیت نے پھر وہی ارتفاع پیدا کرلیا، جو کسی زمانہ میں تھا۔ تو لوگوں کو ان کتابوں سے دلچسپی ہو، خیال ہے کہ اگر حضرت کی کوئی مفصل سوانح عمری کبھی شائع کی گئی، تو اس میں ان کتابوں کے مسائل سے لوگوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

مجاہدات وریاضات

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے، حضرت میں تقویٰ، انابت، اخلاص باللہ، عشق نبوی کے جواہرات ابتداء سے منور تھے، لیکن ان میں آب وتاب اس وقت آیا جب علم وعقل سے آپ بالکل تھک کر بیٹھ گئے۔ یہ تو آپ کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ رات کے تین (۳) بجے، ساڑھے تین بجے اٹھ جاتے، تہجد کی نماز پڑھتے، پھر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے رہتے، صبح کی نماز ہٹو کی مسجد میں باجماعت ادا کرکے ایک خاص منظر قابل دید اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مسلسل زور زور سے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ادعیہ، ماثورہ کا ایک سلسلہ نہایت لجاجت سے شروع فرماتے تھے، مسجد سے اٹھ کر گھر آتے، تانگہ تیار رہتا تھا، علی الصباح نذر باغ نواب صاحب کو دیکھنے جاتے اور راستہ میں قرآن مجید اور دلائل الخیرات کے اوراد ختم کرتے۔ حضرت کی خدمت میں ۱۳۲۵ھ میں حاضر ہوا، اس

وقت تک آپ کی مذہبی ریاضت کا یہی حال تھا۔ میں ٹونک ہی میں تھا کہ آپ پر حج و زیارت کا شوق مسلط ہوا۔ اور حجاز کے سوا، شام و فلسطین، مصر ہوتے ہوئے آپ ہندوستان واپس ہوئے، اس کے بعد آپ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ فقراء و دراویش کے یوں تو ہمیشہ سے معتقد تھے، لیکن اس کے بعد اس جماعت کی دامن آویزی کا جذبہ بہت تیز ہوگیا۔ اس عرصے میں آپ حیدرآباد ایک ضرورت سے تشریف لائے، یہاں تلاش فقر میں آپ کی نگاہ ایک ایسے فقیر پر پڑی جو اپنی ظاہر شکل وصورت میں ایک معمولی سے آدمی ہیں اور رسمی علوم میں بھی ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے لیکن فلسفہ و منطق کے سمندر کا یہ نہنگ جب اس فقیر کے آستانہ پر حاضر ہوا تو پچاس سال کے سارے سرمایہ کو ان کے قدموں پر نثار کر دیا۔ ان کا نام حضرت لحمال اللہ شاہ صاحب عرف مچھلی شاہ صاحب مدظلہ العالی ہے۔ میں بھی ساتھ تھا، حضرت سے بعض لاہوتی مسائل پر گفتگو ہوئی، اس کے بعد حضرت آبدیدہ تھے، اپنی گذشتہ محنت پر پچھتاتے تھے، اور غالباً اس کے بعد ایک مہینہ تک حیدرآباد میں رہے، لیکن وقت کا اکثر حصہ انہیں بزرگ کی چٹائی پر متحیرانہ بسر کرتے تھے، وہ کچھ کہتے جاتے تھے اور حضرت الاستاذ سنتے جاتے تھے۔

یہ بزرگ مدراس کی جماعت صوفیہ کے بڑے اصلاحی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے سلسلہ کے بزرگوں نے عربی فارسی میں ایک خاص قسم کا ذخیرہ تصوف کے متعلق مختلف کتابوں کی شکل میں مہیا کیا ہے۔ حضرت نے ڈھونڈ کر یہ کتابیں مطبوعہ وقلمی مہیا کیں۔ اور شاہ صاحب سے ارشاد لے کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔ آخر زندگی میں ان کا مشغلہ ان ہی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے مطالب استنباط کر کے کئی کتابوں کی تدوین رہ گیا تھا۔

افسوس ہے کہ ان کے بعد خدمت گرامی میں مجھے حاضری کی نوبت نہ آئی۔

Marfat.com

لیکن لوگوں سے معلوم ہوتا رہا کہ حضرت کا یہ آخری رنگ بہت گہرا اور سخت انقلاب انگیز تھا، مزاج میں حد درجہ کی نرمی اور دلفگنی پیدا ہوگئی تھی۔ خود حضرت مچھلی شاہ صاحب نے مجھ سے بار بار فرمایا کہ تمہارے استاد کو میں عالمِ مثال میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سر پر ایک تاجِ زرنگار ہے اور وہ کسی منصب عالی پر سرفراز کیے گئے۔ یہ واقعہ حضرت مچھلی شاہ صاحب ان کی زندگی میں فرماتے تھے۔

اس زمانہ کے اندرونی ریاضات و مجاہدات کا مجھے تفصیلی علم نہیں ہے، جن خوش نصیبوں کو اس ''عہد نور'' میں آپ کی رفاقت نصیب ہوئی کاش وہ اس کی تکمیل فرمادیتے۔

یہ تو حضرت کے علمی اور دینی شعبہ کا ذکر تھا، مناسب ہوگا کہ آخر میں آپ کی زندگی کے بعض جزئیات کو بھی یہاں درج کردیا جائے۔

سخاوت

حضرت کا سینہ نہایت وسیع اور چشم کشادہ تھی، طالب علموں کے ساتھ جو برتاؤ تھا معلوم ہو چکا، اس کے سوا غریبوں، بیواؤں، دوستوں کے ساتھ مخفی طور پر آپ بہت سلوک فرماتے تھے۔ خصوصاً اقربا کے ساتھ آپ کا سلوک بالکل غیر معمولی تھا۔ تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ہر مہینہ ان عزیزوں کو مشاہروں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ اخیر عمر میں عربوں کی مہمان نوازی کا جذبہ آپ پر بہت غالب ہوگیا تھا۔ محبت رسول کی آگ جوں جوں تیز ہوتی تھی، دیارِ محبوب کا ہر آنے والا آپ کو بے چین کردیتا تھا، یہاں تک کہ اسی شوق کے زیر اثر آپ نے چند سال پہلے عربوں کے لیے ایک مستقل سرائے اپنے مصارف سے تیار کرائی تھی اور اس کا نام ''رباط'' رکھا تھا، جس میں ہر قسم کے آرام کا سامان آپ کی جانب سے تھا۔ ٹونک میں جو عرب آتا، خصوصاً اگر مدینہ کا ہوتا تو اس کے سامنے معمولی خادم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے،

Marfat.com

خود دیتے، امراء سے دلاتے، اور نواب صاحب ٹونک سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے عربوں کو دلوانا اپنے اوپر لازم کرلیا تھا۔ خاکسار کے نام آخری خط اپنے وصال کے پندرہ دن پیشتر ایک عرب ہی کی سفارش میں بھجوایا تھا۔ بہر حال آپ کی عام اخلاقی صفات میں جود کی صفت آپ پر بہت نمایاں تھی۔

سادگی اور وارفتگی واستغراق

لباس، سواری وغیرہ میں آپ بالکل سادہ تھے، معمولی چار آنے پانچ آنے گز کا کرتہ اور پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے، اور یہ بھی بہت بڑی حالت میں آپ کے جسم پر نظر آتا تھا، مزاج میں وارفتگی حد سے گذری ہوئی تھی۔ درس گاہ میں کبھی کبھی الٹا پائجامہ پہن کر آتے، مونڈھے پر کرتہ کا ایک حصہ پان کی پیک سے تر رہتا تھا، پان کھانے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ درس کے وقت عموماً منہ سے چھالیا اڑ اڑ کر طالب علموں کی کھلی کتابوں پر گرتی، خصوصاً قاری کی کتاب تو بالکل سرخ ہو جاتی تھی، کیونکہ طرہ یہ ہوتا تھا کہ خود اپنے دستِ مبارک سے اس کو پونچھ بھی دیتے تھے۔ آپ کی وارفتگی کے قصے بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک دن حمام سے بغیر کسی کپڑے کے باہر نکل آئے۔ لوگ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ نواب صاحب ٹونک کے سامنے ایک دن بجائے عمامہ سر پر پائجامہ باندھ کر چلے گئے، نواب صاحب کے ٹوکنے پر متنبہ ہوئے۔ یہ بھی بسا اوقات ہوا کہ کسی نے آپ کو فیس دی، رومال جو کندھے پر اکثر ڈالے رہتے تھے، اس کے کونہ میں روپیہ باندھ دیتے لیکن اس طرح کہ رومال میں گرہ پڑ گئی مگر روپیہ باہر ہی رہا۔ جس کا جی چاہتا تھا، لے لیتا تھا، رحم آیا تو دے دیا، علمی انہماک اور فکری استغراق کے بعد ''محقرات امور'' میں اس قسم کے افعال کا صادر ہونا علم کی تاریخ میں نادر نہیں ہے۔

Marfat.com

قناعت

اور یہ بات زیادہ تو اس لیے تھی کہ مزاج میں حرص کا شائبہ بھی نہ تھا، مہاراجہ اندر نے مختلف ذرائع سے آپ پر زور دیا کہ میں بارہ سو روپیہ ماہوار آپ کو تنخواہ دوں گا، اور اس کے سوا اور بھی وعدے تھے لیکن آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ مہاراجہ کیا کہتا ہے، ان باتوں کا اثر نواب صاحب ٹونک پر بہت پڑتا تھا۔ خود فرماتے تھے کہ نواب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو چھوڑ دوں گا، حالانکہ ان کا یہ عجیب خیال ہے کہ حیدرآباد آ رہے تھے تو نواب صاحب لپٹ کر حکیم صاحب سے کہنے لگے کہ مولوی برکات احمد صاحب جانے کو تو جاتے ہو لیکن مجھے نہ چھوڑ دینا۔ بھائی ٹونک سے تو تم مجھے دفن ہی کر کے جانا، کیا معلوم تھا کہ معاملہ بالعکس ہونے والا ہے، انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ٹونک ہی میں ایک واقعہ آپ کی مالی آزمائش کا پیش آیا تھا، اس وقت چاہتے تو چھ لاکھ روپے جائز ذریعہ سے آپ کو مل جاتے، لیکن بعض لوگوں کی مروت سے آپ نے اس روپیہ کو بری طرح ٹھکرا دیا۔

مراء و جدال سے نفرت

حضرت کا خاص فن منطق اور فلسفہ تھا، جس کا اکثر حصہ صرف جدالیات و مکابرات پر مبنی ہے۔ اور عموماً منطقی اور فلسفی کے معنی کم از کم قدیم اصطلاح میں جھگڑالو کے تھے۔ اس زمانہ میں جو عالم اپنے کو منطقی کے خطاب سے موصوف کرتا تھا، اس کے لیے ضرور تھا کہ وہ اپنے معاصرین سے ذہنی و لسانی جنگ کرے۔ لیکن حضرت پر جہاں خدا کا اور فضل تھا، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ فی عمرہ آپ نے ہندوستان کے کسی عالم سے زبانی مناظرہ نہیں فرمایا، بدقسمتی سے رئیس رامپور کو ایک زمانہ میں مولوی بازی کا شوق ہو گیا، رامپور میں کئی مولویانہ دنگل ہوئے، اسی سلسلہ میں کسی نے نواب کو حضرت کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے آپ کو بلوا کر مشہور جدالی

منطقی مولوی عبدالوہاب بہاری مرحوم سے بھڑا دیا۔ حضرت اس میدان کے مرد نہ تھے، آپ نے تو سنجیدہ پیرایہ میں اصول کے ساتھ گفتگو شروع کی، لیکن مرحوم منطقی نے اپنے جالجوجی پینتروں سے آپ پر حملہ شروع کر دیا۔ آخر میں فیصلہ کے متعلق حاضرین میں اختلاف ہوگیا۔ بعض حضرت کی فتح کے نقارچی تھے، اور بعض مولوی عبدالوہاب کے ڈنالی، لیکن واقعہ یہ تھا کہ تقابل کے لیے نسبت شرط ہے، اور مولوی عبدالوہاب مرحوم اور حضرت کی فطرت ونہاد میں کوئی نسبت نہیں تھی، پٹی جوتہ سے بہتر ہے یا قلم گوشت سے افضل ہے، آخران بے جوڑ، انمل باتوں میں مناظرہ کرنا یا کرانا خود اپنی کوتاہ عقلی ہے۔ اخبارات ورسائل میں مولوی عبدالوہاب مرحوم نے اپنے اس مناظرہ کا مشاعیہ کیا تھا، لوگوں نے حضرت کی طرف سے ذب ومدافعت بھی کی لیکن خود آپ بالکل خاموش تھے، بہرحال زبانی مناظرہ عمر بھر میں صرف ایک ہی دفعہ ہوا، البتہ بعض عقلی اور چند مذہبی جزئیات پر آپ میں اور آپ کے معاصرین مولانا فضل حق رامپوری اور شمس العلماء مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہ میں نوک جھوک ہوتی۔ نیز بعض مسائل دیوبندیہ کے متعلق آپ نے کبھی کبھی کچھ لکھا، لیکن سرسٹھ برس کی عمر میں یہ چند شاذ مثالیں ہیں اور یہ بھی کسی خاص فوری جوش یا ہیجان کا نتیجہ تھا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی چھوٹی باتوں سے اللہ نے آپ کو بہت ارفع واعلیٰ پیدا کیا تھا۔

حضرت کے تلامذہ

اس عنوان کی حقیقی تفصیل ایک ضخیم رجسٹر کو چاہتی ہے لیکن جیسا کہ میں بارہا کہتا رہا ہوں، اجمالاً یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وسط ایشیا، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے شروع کر کے تم بنگال کے آخری حدود تک چلے جاؤ، تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا، اور اچھی حالت میں نظر آئے گا بیرون ہند سے آپ کے پاس طلبہ خاص کر اس لیے زیادہ آتے تھے کہ علاوہ درس

Marfat.com

نظامیہ کے آپ خصوصیت کے ساتھ ابن سینا، طوسی، قوشجی، دوانی، خوانساری، میر باقر داماد کی کتابیں پڑھاتے تھے، جو اس زمانہ میں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام میں بھی نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور ماوراء النہر کے طلبہ میں ان مصنفین کی کتابوں کے پڑھنے کا خاص ذوق تھا۔

علمائے ہند میں مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمٰن ٹونکی، مولانا نصیر احمد پھلتی، مولانا عبدالرحمٰن چشتی حیدرآبادی، مولانا اشرف ملتانی، مولانا عبد السبحان بہاری، مولانا مقبول احمد دربھنگوی، مولانا محمود سندھی، مولانا عبیداللہ الامم البہاری، مولانا عبدالحمید ترہتی، مولانا شریف مبارک پوری، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا فضل کریم بہاری، مولانا احمد کریم بہاری، مولانا عبدالواسع وغیرہم حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں اکثر ہندوستان کے مرکزی مدارس کے صدر مدرس یا مدرس ہیں۔ اور اسلامی علوم کے حلقہ علمی میں وقعت وعزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اہل وعیال

حضرت کی پہلی شادی جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ میرنگر میں ہوئی تھی، لیکن چند ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، ان سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے، ان کے بعد بہاری کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ساکن پترہٹہ ضلع مونگیر کی صاحبزادی سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا، حضرت کی یہ بیوی صاحبہ حقیقت یہ ہے کہ ان گرامی قدر خواتینِ اسلام میں سے ہیں جنہوں نے اپنے کو علم ودین کی خدمت میں اپنے شوہر کا دستِ راست ثابت کیا۔ بیوی صاحبہ حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر مدارات نہ صرف ان کے قیام وطعام کا تیس پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا، یہ مبالغہ نہیں ہے کہ بعض

Marfat.com

دفعہ انہیں غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے سلسلہ میں بیوی صاحبہ کو اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑے تھے، فجزاھا عنا وعن المسلمین خیر الجزاء اگر وہ نہ ہوتیں تو برکاتی سلسلہ کے علمبرداروں کو علمی آبادیوں میں شاید ہم نہیں پا سکتے تھے۔ آپ ہی حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی والدہ ماجدہ ہیں اور محمد میاں صاحب کے سوا حضرت کی کوئی دوسری نسلی نشانی موجود نہیں ہے۔ لیکن جس کی علمی ذریت زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہو، کیا ہوا کہ ایک اکلوتے بچے کے سوا اس نے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی

ازصدائے سخن عشق ندیدم خوشتر
یادگارے کہ درین گنبد دوار بماند

مولانا حکیم محمد احمد صاحب علماً ومنصباً، دنیاً وعملاً اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین ہیں، اب والی ٹونک خلد اللہ ملکہ کے معالج خاص وہی مقرر ہوئے ہیں۔ اور حضرت کی جگہ درس وتدریس کی عنان آپ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے اور توفیق عطا فرمائے کہ اپنے والد کی تمام خصوصیات کی روح تک ان کی رسائی ہو۔

درمجلس وصالت خمہا کشند مستان
چودورِ خسر آمدی درسبو نماندہ

و نعوذ باللہ من الفتن ماظھر منھا و بطن

وفات

سرسٹھ برس کی عمر کے بعد یکا یک آپ ہستی کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں انسان دنیا میں غروب ہوکر آخرت میں طلوع ہوتا ہے، حضرت کی وفات کے حالات کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے نجل سعید، خلف ارشد، مولانا محمد احمد

Marfat.com

صاحب کے اس مطبوعہ خط کو نقل کر دوں جسے انہوں نے اقطارِ ہند کے عام تعزیت ناموں کے جواب میں شائع فرمایا تھا، ارقام فرماتے ہیں:

جناب ..... السلام علیکم وعلی جمیع من اتبع الھدیٰ، آنجناب کا تار ومکتوب گرامی بسلسلہ تعزیت وبہ طلب حالات مفصل علالت ووفات والدی سراج الملۃ حضرت مولانا برکات احمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجب ممونیت وتسکین خاطر حزین فقیر حقیر ہوا، جواباً التماس ہے کہ حضرت علیہ الرحمۃ کو دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ضعفِ معدہ کی شکایت تھی۔ سال گذشتہ اسی حالت میں بے تابانہ و پروانہ وار زیارت سلطان دو عالم ﷺ وحج ثانی کے لیے روانہ ہو گئے، چونکہ موسم نہایت تیز وتند تھا، اور طبیعت پہلے ہی مضمحل تھی، اس لیے اسہال معدی میں زیادتی پیدا ہو گئی۔ سفر مبارک سے معاودت فرمانے کے بعد برابر سلسلہ اسہال جاری رہا، غذا بجائے دو وقت کے ایک وقت ہو گئی، ریاضت کی کثرت، درس وتدریس میں پوری محویت، تصنیف وتالیف میں کامل انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف یوماً فیوماً بڑھتا گیا اور مرض الموت کی ابتدا یوم عید الفطر ۱۳۴۶ھ اس طرح شروع ہوئی کہ شدت سے دفعتہً بخار ہو گیا اور کامل تیئیس روز تک مفارق نہ ہوا، اور پھر ورم جگر، سوء القنیہ ہو کر نوبت باستسقاء رسید، امراض کا اس طرح ہجوم تھا مگر وہاں صحت جسمانی کی طرف تغافل اور بے توجہی کا وہی عالم تھا، جو ہمیشہ رہا اور جس نے صحت کو بالآخر اس اخیر درجہ کو پہنچا دیا، تکالیف کے اخفاء کی اس طرح کوشش جاری تھی۔ حبس دم، پاس انفاس کا سلسلہ برابر جاری تھا، اسی وجہ سے دو مرتبہ قی الدم بھی ہوئی۔ ماہ صفر کے اخیر عشرہ میں مرض کی انتہائی شدت ڈبل نمونیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جس کی کمزور جسمانیت تاب نہ لا سکی اور آفتاب فضل وکمال غرہ ربیع الاول ۱۳۴۷ ہجری شب کے ۳ بجے غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

Marfat.com

و ما کان قیس ھلکه ھلک واحد ولکنه بنیان قوم تھدما

وفات شریف سے ایک شب پہلے وصیت فرمائی کہ میرے مدرسہ اور رباط کا پوری طرح خیال رکھنا، درس وتدریس کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ قائم رکھنا، میرے والد ماجد (حضرت مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری) رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ضروری جاری رکھنا، میرے فاتحہ کا بہت خیال رکھنا، دورِ علالت کامل پانچ ماہ قائم رہا، مگر ایک روز بھی مشغلہ علمی ترک نہ ہوا، جمعہ کے روز حضرت کی زندگی کا اخیر دن اور یوم الرحیل تھا۔ میں جمعہ کی نماز سے واپس ہوا تو التعرف فی حقیقۃ التصوف کے مطالعہ میں مستغرق تھے، انہیں ایام علالت میں تین عمیق علمی تصانیف فرمائیں، جن کا اختتام زندگی کے لمحات کے اختتام کے ساتھ ہوا ہے اور جن کو حضرت رحمۃ اللہ کے معلومات کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔

اس کے بعد کتاب کے نام اور مسائل کا ذکر ہے، آگے ارقام فرماتے ہیں:

یوم الرحیل میں برابر عصر سے مغرب تک عیادت کے واسطے جوق در جوق لوگ آتے رہے، نہایت متبسم چہرہ اور خندہ پیشانی سے بات چیت اور تلقین وارشاد میں مصروف رہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عشاء تک ورد و وظائف کا سلسلہ جاری رہا، اور عشاء کے بعد خلاف معمول مدت دراز کے بعد تناول طعام فرمایا، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ دس بجے تک آرام فرمایا، پھر پوری قوت کے ساتھ بیدار ہوکر ۲ بجے تک اولاً تلاوت قرآن شریف اور پھر ذکر بالجہر میں مصروف رہے۔ دو بجے سے جہر کی شدت میں فرق آنا شروع ہوا، اور یٰس شریف جو ایک مدت سے رات کو پڑھی جارہی تھی ختم کرائی پھر ذکر میں مصروف ہوئے تا آنکہ ٹھیک ۳ بجے اسی حالت میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اور وہ زبان ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی جس کی تذکیر و تلقین سے عالم گونج اٹھا۔ خدا جانے یہ کیا اسرار الٰہی میں سے تھا کہ تین روز سے آنکھوں

Marfat.com

میں ایسی غیر معمولی چمک دمک اور دلآویزی اور جاذبیت پیدا ہوگئی تھی کہ عام عیادت کنندگان نے اس کا احساس کرلیا تھا اور ایک دوسرے سے متعجبانہ تذکرہ کرتے تھے۔ آہ وہ آنکھیں ۳ بجے شب کو ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ لیکن قلب برابر ۸ بجے تک جاری رہا، عوام اس واقعہ کو بنظر استعجاب دیکھتے تھے، اور حقیقت شناس حضرات کہتے تھے: للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت ان کی

حکامان ریاست نے تمام دفاتر سرکاری میں جنازہ ونماز جنازہ میں شرکت کے واسطے عام اجازت دیدی، اور دارلعلوم خلیلیہ میں نماز اولیٰ ادا ہوئی، چوک دفاتر کے قریب صحرا میں نماز ثانی ادا ہوئی۔

دوسرے روز حسب فرمان خسروی ریاست میں تعطیل ماتمی ۱۹ اگست ۱۹۲۸ء کودی گئی۔

آگے مولانا نے کچھ اپنے حالات لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت میں نواب صاحب ٹونک بہ نفس نفیس آپ کے مکان تشریف لائے اور جن فرائض کا تعلق حضرت مرحوم سے تھا وہ آپ کے اکلوتے اور رشید صاحبزادے کے سپرد کیے گئے۔ اس وقت مولانا حکیم محمد احمد صاحب کی تنخواہ چارسو روپیہ ماہوار ہے اور جاگیر میں وہی قدیم گاؤں ٹھکریہ ہے،

فاللھم زدفی عمرہ وبارک و متعنا و المسلمین بطول بقائہ

اب حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ کے نفس ذکی، روح صافی کی طرف فاتحہ کے ساتھ متوجہ ہوکر بجز اس کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں کہ

سا بکیک ما فاضت د موعی فان تغض

فحسبک منی ماتجن الجوانح

Marfat.com

حواشی

الف۔ بہار کا اصلی نام دہارا ہے جس کے معنی دارالعلوم یا خانقاہ کے ہیں، اس صوبہ میں بودہ مذہب کے علماء کے مدارس اور خانقاہوں کی کثرت تھی اور اسی صوبہ میں بودھا کا شجرِ معرفت بھی گیا میں تھا، کہا جاتا ہے اسی دہارا کا تلفظ بعد کو بہار ہو گیا۔

ب۔ یہ گوتم بودھا نہیں ہے بلکہ ترہت کے ایک دوسرے پنڈت کا نام ہے جو بنائے شاستر کا مصنف ہے، اس علاقہ کا مرکزی شہر اب دربھنگہ ہے۔

ج۔ ریف دریائے نیل کے اس ساحلی علاقہ کو کہتے ہیں جس پر نیل کی طغیانی سے ہر سال نئی مٹی چڑھ جاتی ہے اور کاشت کے لیے اکسیر کا کام دیتی ہے۔ بہار کے اس علاقہ کا بھی یہی حال ہے کہ گنگا اور اس کی معاون ندیاں ہر سال نئی کیچڑ اس پر چھوڑتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پیدا وار غیر معمولی ہو جاتی ہے۔

د۔ پروفیسر مولوی عبدالغفور شہباز، سابق صدر کایہ اورنگ آباد کی طرف اشارہ ہے، جنہوں نے میاں نظیر اکبر آبادی کے بہی کھاتہ کو بے نظیر دواوین وکلیات کی صف میں جگہ دی۔

ھ۔ صاحب دعوت الحق مولانا رحمت اللہ ہندی مہاجر مکی کے متعلق حضرت مولانا محمد علی صاحب قدس سرہ العزیز بانی ندوۃ العلما فرماتے تھے کہ جب پادری فنڈر ہندوستان سے شکست کھا کر قسطنطنیہ پہنچا اور علمائے اسلام کو مناظرہ کی دعوت دی، تو سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے مکہ معظمہ سے مولانا رحمت اللہ کو خاص جہاز پر قسطنطنیہ بلوایا، فنڈر ان سے ہندوستان میں ہزیمت کھا چکا تھا، صورت دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ سلطان کو ان کے علمی رعب کا یہ حال معلوم ہوا تو جب کبھی وہ دربار شاہی میں جاتے، رخصت کرتے وقت سلطان ان کی جوتیاں خود ہی اپنے ہاتھ سے سیدھی فرما دیتے تھے۔ فغفر اللہ لہ ولمن تبعہ

Marfat.com

مصادر و مراجع

۱۔ القرآن الکریم

۲۔ آرنلڈ، ڈی، ڈبلیو، اشاعت اسلام، (دعوتِ اسلام) مترجم عنایت اللہ شیخ، لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء

۳۔ ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، طبقات الاطباء، مصر، مطبع الوھبیۃ، ۱۲۹۹ھ

۴۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، اسد الغابۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن

۵۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، الکامل، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

۶۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، الکامل، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۲۰ھ

۷۔ ابن جوزی، ابو الفرج، عبد الرحمٰن بن علی، سیرۃ عمر بن عبد العزیز، Dragulin، Leipzig، ۱۸۹۹ء

۸۔ ابن حجر، احمد بن علی، الاصابہ، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۳۲۸ھ

۹۔ ابن حزم، علی بن احمد، الفصل فی الملل والاھواء والنحل، مصر، مطبعۃ الادبیہ، ۱۳۱۷ھ

۱۰۔ ابن حنبل، احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، مکۃ المکرمہ، مکتبہ عباس احمد الباز ۱۴۱۴ھ

۱۱۔ ابن حوقل، محمد بن حوقل، المسالک والممالک، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۳۲۴ھ

۱۲۔ ابن خلکان، شمس الدین، احمد بن محمد، وفیات الاعیان، ایران، منشورات، الرضی، ۱۹۷۱ء

۱۳۔ ابن خلدون، عبد الرحمٰن، تاریخ ابن خلدون، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۱۴۔ ابن خلدون، عبد الرحمٰن، مقدمہ ابن خلدون، بیروت، موسسۃ الاعلمی، س ن

۱۵۔ ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء، ۱۴۱۷ھ

۱۶۔ ابن عبد ربہ، احمد بن محمد العقد الفرید، مصر، مطبع الجمالیہ، ۱۳۳۱ھ

Marfat.com

۱۷۔ ابن العربی، محی الدین ابوبکر، الفتوحات المکیہ، مصر، مطبع میریہ، س ن

۱۸۔ ابن العربی، محی الدین ابوبکر، الفتوحات المکیہ، مصر، مطبع بولاق، س ن

۱۹۔ ابن العربی، محی الدین ابوبکر، فصوص الحکم، بیروت دار احیاء التراث الکتب العربیہ، ۱۳۶۵ھ

۲۰۔ ابن العربی، محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۸ھ

۲۱۔ ابن عساکر، علی بن حسین، تاریخ دمشق، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ

۲۲۔ ابن العماد الحنبلیؒ، عبدالحی بن العماد، شذرات الذہب، بیروت دار المسیرۃ، ۱۳۹۹ھ

۲۳۔ ابن فرحون، ابراھیم ابن علی بن محمد، الدیباج، المذھب، مصر، مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۲۹ھ

۲۴۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، السیرۃ النبویۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن

۲۵۔ ابن نجیم، زین الدین، البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ، س ن

۲۶۔ ابن ندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست، مصر، المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۳۴۸ھ

۲۷۔ ابن ھشام، عبدالملک بن ھشام، السیرۃ النبویۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۵ھ

۲۸۔ ابن ھمام، محمد بن عبدالواحد، فتح القدیر، مصر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، ۱۳۱۶ھ

۲۹۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، کتاب السنن، بیروت، مکتبہ دار الجیل، ۱۹۹۴ء

۳۰۔ ابوالسعود، محمد بن محمد، تفسیر ابی السعود (ارشاد العقل السلیم)، مکۃ المکرمۃ، مکتبۃ عباس احمد الباز، ۱۴۱۹ھ

۳۱۔ ابوعبید، القاسم بن سلام، کتاب الاموال، بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۸ھ

۳۲۔ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، مصر، مطبع میریہ، ۱۳۱۲ھ

۳۳۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، دمشق، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ

Marfat.com

۳۴۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن

۳۵۔ بدایونی، عبدالقادر، منتخب التواریخ، کلکتہ، کالج پریس، ۱۸۶۵ء

۳۶۔ برنی، ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء

۳۷۔ باذری، احمد بن یحیٰ، فتوح البلدان، بریل، لیدن، ۱۸۶۶ء

۳۸۔ بلگرامی، آزاد علی، ماثر الکرام، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء

۳۹۔ بیرونی، ابوریحان، احمد بن علی، الآثار الباقیہ، جرمنی، لیدن، ۱۸۹۷ء

۴۰۔ بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین، دلائل النبوۃ، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ

۴۱۔ بھولا داس، انھینو مڈل اتھاس، انھینو گرنتھا گار، س ن

۴۲۔ پرکاش دیو، اشوک، لاہور، جارج اسٹیم پریس، ۱۹۱۷ء

۴۳۔ ترمذی، ابوعیسی، محمد بن عیسیٰ، الجامع الصحیح، مصر، مکتبہ مصطفیٰ البابی، ۱۳۹۸ھ

۴۴۔ جصاص، احمد بن علی، احکام القرآن، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

۴۵۔ چڑیا کوٹی، محمد عنایت رسول، بشری، علی گڑھ، شروانی پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۶ء

۴۶۔ چلپی سعدی، سعداللہ بن عیسی، حاشیہ بر فتح القدیر، مصر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، ۱۳۱۶ھ

۴۷۔ حاکم، ابوعبداللہ، محمد بن عبداللہ، معرفۃ علوم الحدیث، المدینۃ المنورۃ، المکتبہ العلمیہ، ۱۳۹۷ھ

۴۸۔ خافی خان، منتخب اللباب، کلکتہ، Badtistmission Press، ۱۹۲۵ء

۴۹۔ خطیب بغدادی، احمد بن علی، تاریخ بغداد، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۹۳۱ء

۵۰۔ دارقطنی، علی بن عمر، سنن الدارقطنی، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۴۲۲ھ

۵۱۔ دیاربکری، حسین بن محمد، تاریخ الخمیس، بیروت، دار صادر، س ن

۵۲۔ الدمیری، کمال الدین، حیات الحیوان، (مترجم، مولانا محمد عباس فتح پوری) لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۴۱۲ھ

۵۳۔ ذہبی، شمس الدین، محمد بن حسین، تذکرۃ الحفاظ، بیروت، دار احیاء التراث العربی،

۱۳۷۶ھ

۵۴۔ رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر، التفسیر الکبیر، مکہ مکرمہ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۴ھ

۵۵۔ رفاعی، احمد الفرید، الدکتور، عصر المامون، قاہرہ، دار الکتب المصریۃ، ۱۹۲۷ء

۵۶۔ زبیدی، سید محمد مرتضی، تاج العروس، مصر، مطبع الخیریۃ، ۱۳۰۶ھ

۵۷۔ زیلعی، محمد عبداللہ بن یوسف، نصب الرایہ، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ

۵۸۔ السرخسی، محمد بن احمد، المبسوط، بیروت، دار المعرفہ، ۱۴۰۹ھ

۵۹۔ سر سید احمد خان، اسباب بغاوتِ ہند، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۵۷ء

۶۰۔ سندر لال، پنڈت، قرآن اور گیتا، حیدر آباد، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، س ن

۶۱۔ سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمٰن بن ابی بکر، الدر المنثور، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۴۱۱ھ

۶۲۔ شربینی، محمد الخطیب، مغنی المحتاج، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی،، ۱۹۵۸ء

۶۳۔ شکیب ارسلان، تعلیقات بر مقدمہ ابن خلدون، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۶۴۔ شوکانی، محمد بن علی، تفسیر فتح القدیر، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۸ھ

۶۵۔ شہرستانی، عبد الکریم، الملل والنحل، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی، ۱۲۱۵ھ

۶۶۔ شیبانی، محمد بن الحسن، السیر الکبیر مع الشرح (شارح، سرخسی، محمد بن احمد) حیدر آباد دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ

۶۷۔ شیبانی، محمد بن الحسن، السیر الکبیر مع الشرح (شارح، سرخسی، محمد بن احمد) بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ

۶۸۔ شیبانی، محمد بن الحسن، کتاب الآثار، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن

۶۹۔ طحاوی، احمد بن سلامہ ازدی، مشکل الآثار، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ

۷۰۔ عبد الحکیم، ڈاکٹر، النبی والاسلام، انبالہ، بلدلی اسٹیم پریس، ۱۹۱۵ء

۷۱۔ علی المتقی، علاء الدین بن حسام الدین، کنز العمال، حیدر آباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۶۲ھ

۷۲۔ عینی، محمود بن احمد، البنایۃ شرح الہدایۃ، المکۃ المکرمۃ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۱ھ

Marfat.com

۷۳۔ غزالی، ابو حامد محمد، احیاء العلوم، بیروت، دار الخیر، ۱۴۱۷ھ

۷۴۔ غلام علی، مجددی دہلوی، مقامات مظہری، (مترجم محمد اقبال مجددی)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء

۷۵۔ فرشتہ، محمد بن قاسم، تاریخ فرشتہ، لکھنؤ، نولکشور، س ن

۷۶۔ قشیری، مسلم بن الحجاج، الجامع الصحیح، مشمولہ موسوعۃ الکتب السنۃ، ریاض، دار السلام، ۱۴۲۱ھ

۷۷۔ قفطی، جمال الدین یوسف، اخبار الحکماء، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۳۲۶ھ

۷۸۔ قنوجی، صدیق حسن، نواب، ابجد العلوم، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۰ھ

۷۹۔ کاسانی، ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۷ھ

۸۰۔ کتانی، عبد الحی، التراتیب الاداریۃ، بیروت، ناشر حسن جعنا، س ن

۸۱۔ الکتبی، محمد بن شاکر، فوات الوفیات، بیروت، دار صادر، ۱۹۷۳ء

۸۲۔ لتھروپ سٹوڈرڈ، حاضر العالم الاسلامی (مترجم عربی عجاج نویہض) تعلیقات وحواشی امیر شکیب ارسلان، قاہرہ، المطبعۃ السلفیۃ، ۱۴۴۳ھ

۸۳۔ ماتھر دہلوی، منشی شری رام (مترجم) مہابھارت، دہلی، نولکشور، ۱۹۱۴ء

۸۴۔ مالک بن انسؒ، المؤطا مع شرح المتقی، المکۃ المکرمۃ، مکتبہ عباس احمد الباز، ۱۴۲۰ھ

۸۵۔ ماوردی، محمد بن حبیب، الاحکام السلطانیہ، مصر، مطبعۃ الاتحاد المصری، ۱۳۲۸ھ

۸۶۔ المتقی، علاء الدین، علی بن حسام الدین، کنز العمال، حیدر آباد، مطبع معارف، ۱۳۱۲ھ

۸۷۔ محمد حفیظ، اشوک اعظم، دہلی، انجمن ترقی اردو، س ن

۸۸۔ مراکشی، ابو محمد، عبد الواحد بن علی، المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، مصر، مطبع السعادۃ، س ن

۸۹۔ مرغینانی، علی بن ابی بکر، الھدایہ مع نصب الرایہ، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۱۶ھ

۹۰۔ مسعودی، علی بن حسین، مروج الذہب، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

Marfat.com

۹۱۔ ولی اللہ، شاہ احمد بن عبدالرحیم، ازالۃ الخفاء، (مترجم مولانا محمد اشتیاق) کراچی قدیمی کتب خانہ، س ن

۹۲۔ ویبر، الفرڈ، تاریخ فلسفہ (مترجم خلیفہ عبدالحکیم) حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ، دکن، ۱۹۲۸ء

۹۳۔ ھمدانی، ابن الفقیہ، احمد بن محمد، لیدن، مطبع بریل، ۱۳۰۲ھ

۹۴۔ ہیراچند، گوری شنکر، قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب، الہ آباد، ہندوستان اکیڈمی، ۱۹۳۱ء

۹۵۔ Vincent A. Smith, Early History of India,England, Oxford Press,1924

Marfat.com
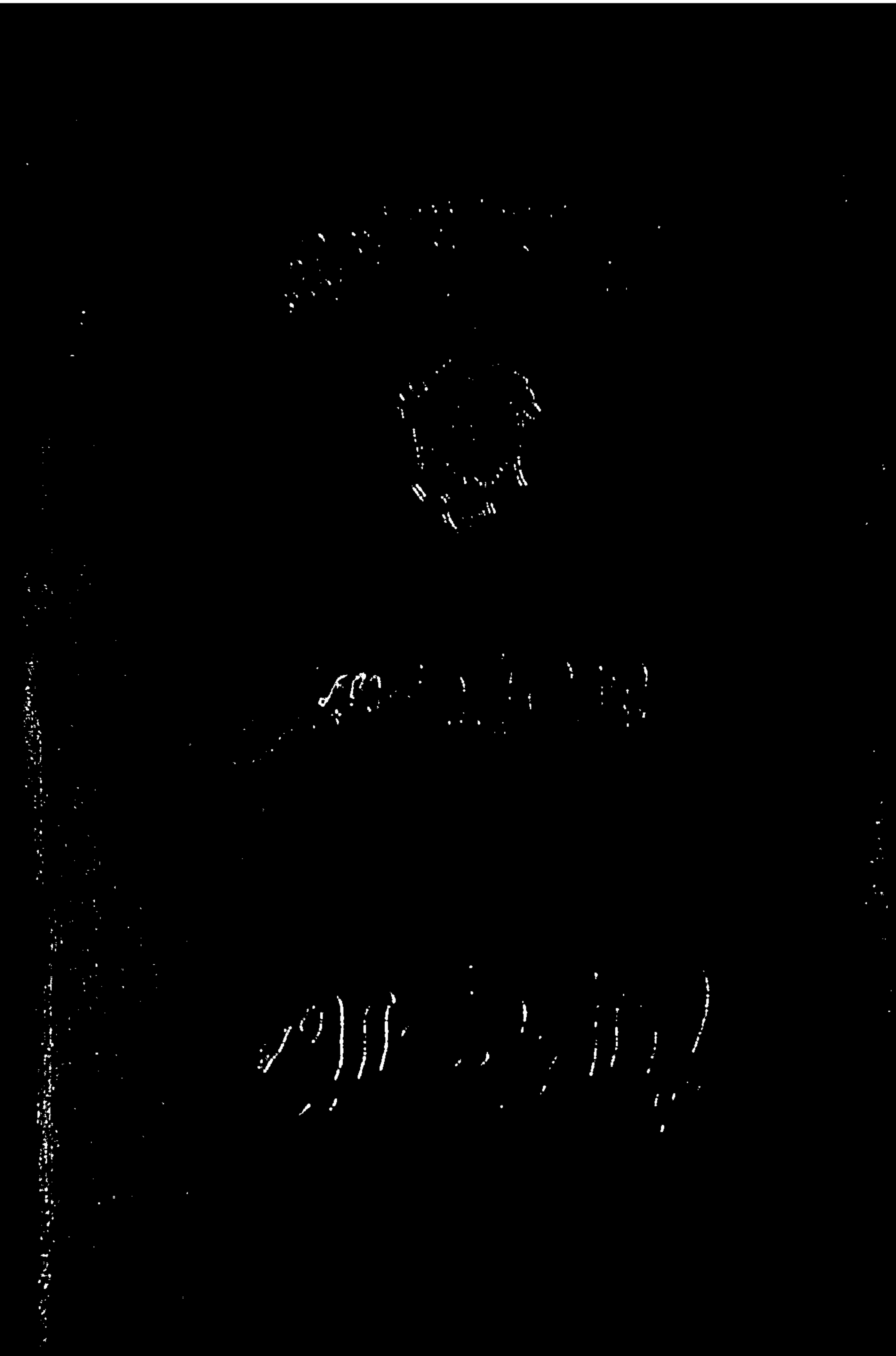
Marfat.com